الاسلام

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنوبی افریقہ کے ناول نگار اولیو شرنیر (۱۸۵۵ - ۱۹۲۰) کی ایک کتاب ہے: ایک افریقی فارم کی کہانی

Story of an African Farm

اس میں ایک اجنبی مسافر ایک کسان لڑکے کو ایک شکاری کا قصہ بیان کرتا ہے۔ اس شکاری کو سچائی کی خوبصورت سفید چڑیا کی تلاش تھی جس کی ایک جھلک اس نے ایک جھیل کے کنارے دیکھی تھی۔ اس نے خوش اعتقادی کے پھندے اور تصورات کے پنجرے میں چڑیا کو پکڑنا چاہا۔ مگر اسے معلوم ہوا کہ سچائی کو سچائی ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے توہمات کی وادی کو چھوڑ دیا اور سچائی کے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک اونچی کھڑی ہوئی چٹان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اس چٹان کو کاٹ کاٹ کر سیڑھیاں بنانی شروع کیں۔ سالہا سال تک وہ سیڑھیاں بناتا رہا اور اوپر چڑھتا رہا، یہاں تک کہ بوڑھا ہوتے ہوتے وہ اس کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ مگر اب اسے معلوم ہوا کہ اس کے آگے ایک اور چٹان ہے جو اس سے بھی زیادہ اونچی ہے۔ مگر اب اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور وہ وہیں مرجاتا ہے۔ تاہم مرتے وقت اوپر سے ایک سفید پر آکر اس کے پاس گرا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ مطلوب چڑیا اس اگلی چٹان پر ہے۔ اگرچہ وہ خود سچائی کی چڑیا تک نہیں پہنچ پایا۔ مگر وہ اس اطمینان کے ساتھ جان دے دیتا ہے کہ میرے بعد آنے والے کو پچھلی سیڑھیاں نہیں بنانی پڑیں گی۔ وہ پر کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور یہ کہتے ہوئے مرجاتا ہے:

> Where I lie down, worn out, other men will stand, young and fresh. By the steps that I have cut they will climb. They will never know the name of the man who made them ... But they will mount and on my work. They will climb and by my stair. They will find truth and through me.
> Olive Schreiner, *Story of an African Farm*

جہاں آج میں بوڑھا اور کمزور ہو کر گر پڑا ہوں، دوسرے لوگ یہاں سے کھڑے ہوں گے۔ نوجوان اور تازہ دم۔ جو سیڑھیاں میں نے کاٹی ہیں، وہ اس سے چڑھیں گے۔ وہ کبھی نہ جانیں گے کہ سیڑھیاں بنانے والے کا نام کیا تھا۔ مگر وہ ان سیڑھیوں پر چڑھتے رہیں گے اور بالآخر سچائی تک پہنچ جائیں گے۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے، اس کے لئے غالباً اس سے زیادہ موزوں تمثیل اور کوئی نہیں ہو سکتی جو اوپر کے اقتباس میں نظر آتی ہے۔

زیر نظر کتاب کے مؤلف کی پیدائش کی (تخمینی) تاریخ یکم جنوری ۱۹۲۵ء ہے۔ میرے والد فریدالدین خاں مرحوم کا ۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اس وقت انتقال ہو گیا جب کہ میری عمر صرف پانچ سال تھی۔ اس کے بعد میری پرورش اعظم گڑھ کے ایک روایتی مذہبی ماحول میں ہوئی۔ میرے حالات کا تقاضا تھا کہ میں ہر چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھوں۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ دین جو "دور قدیم" میں ایک ہزار سال تک انسانی افکار پر

حکمراں تھا دورِ جدید میں ہر لحاظ سے مغلوب ہوگیا ہے، تو میرے اندر یہ جذبہ ابھرا کہ میں اس مسئلہ کی تحقیق کروں۔ میں نے باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔

مجھ کو بہت سے لوگ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میری باقاعدہ تعلیم تمام تر صرف عربی مدرسہ میں ہوئی ہے۔ عربی مدرسہ سے فراغت کے بعد میں نے بطور خود انگریزی سیکھی۔ بعد کے دور میں انگریزی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے طرزِ تحریر پر جدید اسلوب غالب آگیا۔ اس سے لوگوں کو شبہ ہونے لگا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کی تعلیمی اصطلاح میں میں تمام تر ایک "مولوی" ہوں۔

میرے اس تعلیمی اور فکری پس منظر نے اسلام کا کم از کم روایتی علم مجھے دیا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ دورِ جدید کی نسبت سے اسلام کو سمجھنے کے لئے وہ ناکافی تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں میں نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ ایک طرف میں نے جدید افکار کو براہ راست مآخذ سے جاننے کی کوشش کی۔ دوسری طرف اسلام کو از سرِ نو سمجھنے کے لئے قرآن و حدیث اور اس سے متعلق علوم کو پڑھنا شروع کیا۔ میری زندگی کے ابتدائی ۲۵ سال اگر درسی تعلیم میں گزرے تھے، تو اگلے ۲۵ سال اس تحقیقی مطالعہ میں صرف ہوگئے۔ آج جب کہ میری عمر پچاس سال ہو چکی ہے، میں اس کتاب کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو گویا میری طویل تلاش کا جواب ہے۔ میں شاید نظریاتی چٹان کی سیڑھیاں کاٹ چکا تھا کہ میرے سامنے دوسرا پہاڑ آکر کھڑا ہوگیا۔ اب ضرورت تھی کہ دریافت کردہ حقائق کی روشنی میں اسلام کی مہم کو عملی طور پر چلایا جائے۔

مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری طاقت ختم ہوگئی۔ ماضی کی شدید جد و جہد نے مجھے قبل از وقت بوڑھا بنا دیا۔ "نظریاتی سیڑھیاں" کاٹنے میں میں نے اپنی عمر تمام کر دی۔ اب "عملی سیڑھیاں" کس طرح کاٹوں۔ تاہم میرے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ میں نے سچائی کو کم از کم فکری طور پر دریافت کر لیا ہے۔ اب شاید میں یہ کہتے ہوئے مر سکتا ہوں کہ ــــ "میرے بعد آنے والے کو پچھلی سیڑھیاں نہیں بنانی پڑیں گی"

وحیدالدین ستمبر ۱۹۷۵

حقیقت دین

عبادت

اللہ تعالٰی کو اپنے بندوں سے جو اصل چیز مطلوب ہے وہ عبادت ہے:

وَمَاخلقت الجنّ والانس الا لیعبدون (ذاریات - ۵۶)
میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

قرآن میں کثرت سے ایسی آیتیں ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کو اسی لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ انسان کو اس کی اس ذمہ داری سے آگاہ کردیں (نحل - ۳۶) یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ اگر آدمی اپنے وطن میں خدا کی عبادت کے مواقع نہ پارہا ہو تو حکم ہے کہ وہ اس کو چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں چلا جائے (نساء ۹۷)

عبادت کا لغوی مفہوم اپنے آپ کو کسی کے آگے جھکانا اور پست کرنا ہے۔ (اصل العبودیۃ الخضوع والتذلل لسان العرب) عبادت کا جو لغوی مفہوم ہے، وہی اس کا شرعی مدلول بھی ہے۔ ابوحیان اندلسی نے لکھا ہے:

العبادۃ التذلل، قالہ الجمھور
البحر المحیط۔ جلد اول صفحہ ۲۳
عبادت کا مطلب پستی اور عاجزی ہے، یہی جمہور کا قول ہے۔

اسی لئے قرآن میں عبادت کے بالمقابل رویہ کے لئے "استکبار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین مومن - ۶۰
جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ سب جہنم میں داخل ہوں گے۔

عبادت کا اصل مفہوم اگرچہ خضوع اور تذلل ہی ہے۔ مگر خدا کی نسبت سے جب یہ لفظ بولا جائے تو اس میں محبت کا تصور بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

العبادۃ فی اللغۃ من الذلۃ، یقال طریق معبد وبعیر معبد ای مذلل، وفی الشرع عبارۃ عما یجمع کمال المحبۃ والخضوع والخوف
تفسیر القرآن جلد اول صفحہ ۲۵
عبادت کے لغوی معنی پست ہونے کے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے معبد راستہ اور معبد اونٹ، اور شریعت میں اس سے مراد ایسی کیفیت ہے جس میں انتہائی محبت کے ساتھ انتہائی خضوع اور خوف موجود ہو۔

امام ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں:

لفظ العبودیۃ یتضمن کمال الذل وکمال الحب
رسالہ العبودیۃ، صفحہ ۲۸
عبودیت انتہائی عاجزی اور انتہائی محبت کے مجموعے کا نام ہے۔

حافظ ابن قیم نے لکھا ہے:

العبادۃ تجمع اصلین: غایۃ الحب بغایۃ الذل
عبادت کے دو اجزاء ہیں۔ انتہائی محبت انتہائی عجز

والخضوع تفسیر ابن قیم، صفحہ ۶۵ اور پستی کے ساتھ۔

عبادت کا اصل مطلب خدا کے آگے پستی اور عاجزی اختیار کرنا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں خشیت، تضرع، اخبات، انابت، خشوع، خضوع اور قنوت وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خدا کی عبادت کرنا خدا کے لئے اپنے آپ کو انتہائی حد تک بچھا دینا ہے۔ پھر عبادت کا یہ عمل جس ہستی کے آگے ہوتا ہے، وہ چوں کہ کوئی ظالم و جابر ہستی نہیں ہے، بلکہ انتہائی شفیق ہستی ہے اور ہمارے اوپر اس کے بے پایاں احسانات ہیں، اس لئے اس اظہار عجز کے اندر لازمی طور پر محبت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ بندے اور خدا کا تعلق ایک انتہائی محبوب ہستی سے انتہائی عجز کا تعلق ہے۔ عین اس وقت جب بندہ شدت خوف سے کانپ رہا ہوتا ہے، جب خدا کے تصور سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں، اس وقت بھی اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے بہترین جذبات اپنے رب کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی اشتیاق کے ساتھ خدا کی طرف لپک رہا ہوتا ہے۔ وہ ایک درد انگیز محبت کی اعلیٰ ترین کیفیت میں اپنے آپ کو لپٹا ہوا پاتا ہے۔ خدا کے سامنے عاجزی اختیار کرنا، بلاشبہ اس سے انتہائی خوف کی بنا پر ہوتا ہے۔ مگر یہ خوف کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی ڈراونی شئے کو دیکھ کر آدمی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو کسی بھی ایک لفظ میں صحیح طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انتہائی امید اور انتہائی اندیشہ کی ایسی ملی جلی کیفیت ہے جس میں بندہ کبھی یہ طے نہیں کر پاتا کہ دونوں میں سے کس کو فوقیت دے۔ یہ محبت اور خوف کا ایک ایسا مقام ہے جس میں آدمی جس سے ڈرتا ہے، اسی کی طرف بھاگتا ہے۔ جس سے چھننے کا خطرہ محسوس کرتا ہے، اسی سے پانے کی امید رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو سراپا اطمینان ہے اور ایسا اطمینان ہے جو سراپا اضطراب ہے۔

معلوم ہوا کہ عبادت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک حسیاتی واقعہ ہے نہ کہ کوئی خارجی واقعہ۔ انسان اپنے آخری تجزیہ میں ایک حسیاتی وجود ہے۔ اس لئے انسان کی نسبت سے عبادت کی آخری شکل ایک حسیاتی واقعہ ہی ہو سکتی ہے نہ کہ کسی خارجی واقعہ کو ظہور میں لانا۔ حدیث میں صراحت ہے کہ تقویٰ ایک قلبی حالت کا نام ہے (التقویٰ ھٰھنا۔ بخاری) قرآن میں تقویٰ کو عبادت کا حاصل قرار دیا گیا ہے:

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون (بقرہ - ۲۱)	اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور پچھلے لوگوں کو پیدا کیا ہے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

عبادت اپنے خارجی ظہور کے اعتبار سے اپنے رب کے آگے جھکنے کا نام ہے، اور اپنی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے خدا کے اس گہرے ادراک اور اس سے اس شدید تعلق کا نام ہے جب کہ بندہ اپنے رب میں اتنا محو ہو جائے کہ اس پر حضوری کی کیفیت طاری ہونے لگے:

نعبد اللہ کانک تراہ بخاری بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان	(احسان کا مقام یہ ہے کہ) تم اس طرح خدا کی عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

اس ارشاد رسول کے مطابق اعلیٰ ترین عبادت یہ ہے کہ بندہ خدا کی یاد اور اس کے تصور میں اتنا گم ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے قریب محسوس کرنے لگے۔ اس پر استحضار کی ایسی کیفیت طاری ہو گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے، یہی کیفیتِ قربت، عبادت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ وہ تمام اعمال جن کو قربات یا مناسک یا مراسم عبودیت کہا جاتا ہے، وہ اسی عبادت تک پہنچنے کے طریقے اور ان کے لازمی مظاہر ہیں جو خود خدا کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان مظاہر کے بغیر یا ان کے باہر باہر خدا کی عبادت کا دعوے دار ہو تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے، کیوں کہ ان کے بغیر حقیقتہً کسی کے اندر عبادت پائی ہی نہیں جا سکتی۔ انسان اگرچہ فی الواقع اس مخصوص روح کا نام ہے جو ہم کو نظر نہیں آتی مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی جسم کے بغیر اس دنیا میں انسانی وجود کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عبادت کا لفظ اگرچہ ایک لحاظ سے ساری شریعت پر حاوی ہے۔ کیوں کہ بندہ اپنے معبود کو راضی کرنے اور اس کے حکم پر کاربند ہونے کے لئے جو کچھ کرتا ہے، ان سب کا محرک اس کا جذبۂ عبودیت ہی ہوتا ہے۔ مگر عبادت اصلاً اور اولاً اس مخصوص عمل کا نام ہے جو بندہ اور خدا کے درمیان ہوتا ہے، بندے اور بندے کے درمیان کا عمل عبادت کا تقاضا ہے، جب کہ خدا اور بندے کے درمیان کا عمل بذات خود عبادت ہے۔ بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو وہ براہِ راست خدا کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ عین اس کے آگے اس طرح جھکا ہوتا ہے کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی تیسرا وجود حائل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اخلاق و معاملات میں جب وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرتا ہے تو وہ دوسروں کے اوپر اپنی عابدانہ حیثیت کے تقاضے پورے کر رہا ہوتا ہے۔ تعمیل کے پہلو سے یہ تقاضے بھی اسی طرح لازم ہیں جس طرح مخصوص عبادتی افعال۔ البتہ دونوں میں نوعیت کا جو فرق ہے اس کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ دین کا صحیح تصور ذہنوں میں قائم نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ تقاضے ہمیشہ کسی دوسری چیز کی نسبت سے مطلوب ہوتے ہیں، جب کہ اصل حقیقت مطلقاً مطلوب ہوتی ہے۔

مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ "مسلمان ہونے کا تقاضا ہے کہ آدمی وراثت کا مال خدا کے قانون کے مطابق تقسیم کرے"، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ہر آدمی لازماً اس بات کی کوشش کرے کہ اس کے پاس ترکہ میں کچھ جائداد آئے تاکہ اس کو حق داروں کے درمیان ٹھیک ٹھیک تقسیم کرکے وہ حکم وراثت کی تعمیل کر سکے، ورنہ اس کا ایمان مکمل نہ ہوگا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب کسی مسلمان کو ترکہ میں کوئی جائداد یا سرمایہ ملے تو اس وقت اس کے ایمان و اسلام کا تقاضا ہے کہ وہ احکام وراثت کے مطابق اس میں تصرف کرے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو حصول جائداد کی نسبت سے مطلوب ہوتا ہے نہ کہ وہ عبادت الٰہی کی طرح علی الاطلاق ہر شخص کے اوپر عائد ہے۔

عبادت کی اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا سے محبت اور خوف کے تعلق کی حیثیت محض یہ نہیں ہے کہ وہ عملی زندگی کے لئے ایک "محرک" ہے بلکہ وہی اصل مطلوب ہے جس کو اس دنیا میں ہمیں پانا ہے — سارے اعمال و افعال کا حاصل یہی ہے کہ وہ ہمارے لئے اس حسیاتی یافت کے حصول کا ذریعہ بن جائیں جس کو تعلق

باللہ اور وصول الی اللہ کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے اور خدا کے درمیان صرف ایک خارجی قسم کے ذہنی مفروضہ کا تعلق نہیں ہے (کہ ہم فلاں عمل کو دہرائیں تو خدا آسمان پر ہم سے خوش ہو جائیگا) بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ہمارے اور اس کے درمیان ایک براہ راست تعلق بھی ہے۔ بندگی کا رویہ اپنی ظاہری شکل میں حکم کی تعمیل ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ دراصل اپنے آپ کو اس مقام پر لے جانا ہے جہاں بندہ خدا سے ملاقات کر سکے، جہاں اپنے رب سے اس کی سرگوشیاں ہوں، جہاں وہ اس کے آگے روئے اور گڑگڑائے، جہاں وہ بے تابانہ اس سے چمٹ جائے۔ جہاں وہ اس احساس سے دوچار ہو کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ اس طرح دنیا کی زندگی میں خدا کو پانا، یہی دین کی اعلیٰ ترین حقیقت ہے اور سارے احکام وآداب کا مقصود بندے کو اس مقام تک پہنچانا ہے۔ جس نے اس طرح دنیا میں اپنے رب کو پالیا، وہی آخرت میں اپنے رب کو پائے گا اور جو دنیا میں اس یافت سے محروم رہا، اس کو آخرت میں بھی لقاء رب کی نعمت پانے کی امید نہ کرنی چاہئے

دین کی اس دولت کو پانے کی پہچان کیا ہے، اس کی ایک پہچان یہ ہے کہ آدمی کو "رزق رب" (طٰہٰ ۱۳۱) پہنچنے لگے۔ خدا کے حکم کی تعمیل میں بظاہر آپ جو کچھ کرتے ہیں، وہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے، چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ مگر اس عمل کے دوران میں جو مخصوص اندرونی کیفیات آپ پر گزرتی ہیں وہ آپ کے اختیار میں نہیں ہیں۔ آپ خود سے انھیں پیدا نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کیفیات کہاں سے آتی ہیں۔ وہ دراصل خدا کی طرف سے ہیں۔ یہ مومن کا رزق ہے جس کے بغیر اس کی ایمانی شخصیت زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہی علم و عمل کا وہ "رزق" ہے جس کو حضرت مریم کی ذات میں دیکھ کر وقت کے نبی نے پوچھا تھا "یہ تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے"۔ انھوں نے جواب دیا: ھو من عند اللہ (آل عمران۔ ۳۷)

آپ کی کوششیں آپ کا عمل ہیں اور یہ کیفیات وہ بدلہ ہیں جو خدا کی طرف سے حسن عمل کے صلہ میں دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بہترین انعام کو ادھار نہیں چھوڑا بلکہ اسے نقد رکھا ہے۔ بندۂ مومن اس انعام کو اسی لمحہ پالیتا ہے جب وہ اس کے پانے کا استحقاق پیدا کرتا ہے۔ جب ہمارا آقا ہمارے کسی عمل کو قبول کرتا ہے، اس وقت حیرت انگیز طور پر کچھ ملکوتی قسم کی واردات ہمارے اوپر گزرتی ہیں۔ یہ اس جنت کا تعارف ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مومنین صالحین سے وعدہ فرمایا ہے۔ یہ باغ بہشت کی خوشبو ہے جس کو اہل ایمان دنیا کے اندر پاتے ہیں۔ یہ کیفیات اگرچہ تڑپ کی شکل میں ہوتی ہیں مگر وہ تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہیں۔ کسی بھی معلوم دنیوی لذت پر ان کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ واقعہ اس بات کا ایک وجدانی ثبوت ہے کہ یہ کیفیات اس اعلیٰ تر انعام الٰہی کا عکس ہیں جس کو جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اہل ایمان کو جو جنت ملنے والی ہے، وہ ان کے لئے ایک رزق معلوم (صافات۔ ۴۱) ہوگا۔ وہ ان کے لئے کوئی اجنبی چیز نہیں ہوگی، بلکہ وہ ایک جانی پہچانی چیز ہوگی جس سے وہ دنیا کی زندگی میں آشنا ہو چکے تھے:

ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم — محمد۔ ۶ — اللہ انھیں جنت میں داخل کریگا جس کی پہچان انھیں کرادی ہے

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ ان احدھم بمنزلہ فی الجنۃ اھدی منہ بمنزلہ الذی کان فی الدنیا (اخرجہ البخاری فی صحیحہ)	دنیا میں کوئی شخص جس طرح اپنے گھر کو پہچانتا ہے، جنت میں جانے والا اس سے زیادہ وہاں اپنے گھر کو پہچان لے گا

جب آدمی کو ایسا صدقہ کرنے کی توفیق ہوتی ہے جس کے اندر الذین یوتون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ (مومنون ۔ ٦١) کی روح کام کر رہی ہو، جب اس کو ایسی تلاوت نصیب ہوتی ہے جب وہ تری اعینھم تفیض من الدمع (مائدہ ۔ ٨٦) کی تصویر بن گیا ہو، جب وہ اپنے رب کے اشتیاق میں ایسی رات گزارتا ہے جس کو قرآن میں تتجافی جنوبھم عن المضاجع (السجدہ ۔ ١٦) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جب اس پر وہ دردانگیز لمحات گزرتے ہیں جس میں وہ الذین آمنوا اشد حبا للہ (بقرہ ۔ ١١٥) کی حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔ جب اس کے اوپر ایمان کی لطیف ترین حسیات وارد ہوتی ہیں، جب چھپی ہوئی حقیقتوں کا کوئی پردہ اس کے اوپر سے اٹھا دیا جاتا ہے۔ جب وہ بے قرار دل اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنے آقا کو ایسے الہامی الفاظ میں پکارتا ہے جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا، تو یہ دراصل ایک رزق رب ہوتا ہے جو اسے پہنچتا ہے۔ وہ ان پھلوں میں سے ایک پھل کا مزہ چکھتا ہے جو اس کے رب نے اس کے لئے چھپا رکھے ہیں۔ دنیا میں ان پھلوں کا نام ایمانی کیفیات ہے اور آخرت میں وہ جنت کے انعامات کی صورت میں ہمیں ملیں گے۔ اس وقت اہل ایمان محسوس کریں گے کہ یہ تمام وہی چیزیں ہیں جن کا مزا دنیا کی زندگی میں انھیں چکھایا گیا تھا:

کلما رزقوا منھا من ثمرۃ رزقا قالوا ھذا الذی رزقنا من قبل واتوا بہ متشابھا بقرہ ۔ ٢٥	جب انھیں جنت کا کوئی پھل ملے گا تو وہ کہیں گے کہ یہی ہے جو پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور ان کو ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے

آخرت میں جو کچھ اہل جنت کو ملنے والا ہے، وہ عطائے متشابہ ہے، وہ مومن کی معلوم و معروف چیز ہے۔ پھر کس قدر نادانی ہوگی اگر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ وہ آخرت میں ان ذائقوں کو پا سکتا ہے جس سے وہ دنیا کی زندگی میں نا آشنا رہا تھا۔ اگر دنیا میں آپ پر ایسے لمحات نہیں گزرے جب کہ آپ تمام چیزوں سے زیادہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرتے ہوں تو آخرت میں خدا کی قربت آپ کو کس طرح مل سکتی ہے۔ بے شک نماز اتنے بڑے اجر کی موجب ہے جس کو دیکھ کر آخرت میں نمازیوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ مگر یہ نعمت تو اسی کا حصہ ہے جو دنیا میں ایسی نمازوں سے آشنا ہوا ہو جس کے متعلق رسولؐ نے فرمایا ہے: جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (نسائی)

عبادت کے تقاضے

انسان سے اللہ تعالیٰ کو اولاً اور اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ یہی ہے کہ انسان اس کے آگے عاجزی اختیار کرے، اسی کا نام عبادت ہے۔ مگر آدمی کو خلا میں نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کو واقعات سے بھری ہوئی ایک دنیا میں رکھا گیا ہے۔ اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان تمام پہلوؤں میں بھی عابد کی حیثیت عبودیت کا اظہار ہو

جو موجودہ دنیا کی نسبت سے اسے حاصل ہیں۔

۱۔ ایک پہلو وہ ہے جو خود اپنی ذات سے متعلق ہے۔ ہر بار جب زندگی کی سرگرمیوں میں اس کے سامنے کوئی ایسا معاملہ آتا ہے جس میں اس کے لئے دو راہیں اختیار کرنا ممکن ہو، ایک خدا کی راہ، دوسرے نفس اور معبودانِ باطل کی راہ۔ اس وقت اس کا جذبۂ عبودیت اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسری راہوں کو چھوڑ کر اپنے رب کی بتائی ہوئی راہ کو اپنے لئے پسند کرے۔ جس خدا کے آگے وہ حسیاتی طور پر جھکا ہوا ہے، اپنے عملی وجود اور اپنے رویہ کو بھی اسی کے آگے جھکا دے۔ یہ عبادت کا وہ مظہر ہے جو خود اپنی ذات کی نسبت سے وجود میں آتا ہے اور اس کا دوسرا نام "اطاعت" ہے۔ اس اطاعت کے مقامات گھر، دفتر، بازار، پارلیمنٹ اور وہ تمام جگہیں ہیں جہاں صاحبِ ایمان کا سابقہ کسی ایسی صورت حال سے پیش آئے جہاں اس کے لئے خدائی طریقہ اور غیر خدائی طریقہ کے درمیان انتخاب کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہو۔

۲۔ دوسرا پہلو وہ ہے جو خارجی دنیا یا دوسرے لفظوں میں غیر مسلموں کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس زمین پر بسنے والے وہ تمام لوگ جنھوں نے ابھی تک اپنے رب سے رشتہ نہیں جوڑا اور اس بنا پر وہ خطرناک اخروی انجام کی طرف چلے جارہے ہیں، ان کی یہ نازک پوزیشن مجبور کرتی ہے کہ بندۂ مومن انھیں بھی عبادت کے اس راستہ پر لانے کی کوشش کرے جس کو اس نے خود اپنے لئے اختیار کیا ہے۔ یہ عبادت کا وہ مظہر ہے جو عام انسانوں کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کا دوسرا نام شہادت یا تبلیغ ہے۔ اہل ایمان سے خود اپنی ذات کے سلسلے میں جو چیز مطلوب ہے، وہ اطاعت (تعمیل حکم) ہے اور غیر مسلموں کی نسبت سے ان پر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے، وہ تبلیغ (پہنچا دینا) ہے۔

اب عبادت کے پہلے مظہر (اطاعت) کو لیجئے۔ اس کی دو بڑی قسمیں ہیں، انفرادی اور اجتماعی۔ انفرادی اطاعت سے مراد ان چیزوں میں خدا کی فرماں برداری کرنا ہے جن کا تعلق اہل ایمان کی ذاتی زندگی سے ہے۔ اس میں وہ تمام احکام آجاتے ہیں جو اخلاق و معاملات سے متعلق دیئے گئے ہیں۔ مثلاً سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، امانت میں خیانت نہ کرنا، عدل و انصاف سے کام لینا۔ تواضع اختیار کرنا، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، جس کا جو حق ہو اس کو ادا کرنا۔ ہر ایک کے ساتھ نصح اور خیر خواہی کا معاملہ کرنا، غرض وہ سب کچھ جو انسان کو ذاتی طور پر پیش آتا ہے اور وہ سب کچھ جس میں انسان اپنے ذاتی فیصلہ سے کوئی رویہ اختیار کرتا ہے۔ ان میں خدائی ہدایات کو اپنانے کا نام انفرادی اطاعت ہے۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ جب اس کو اپنے کسی معاملہ میں خدا کا حکم معلوم ہو جائے اور وہ اس کی تعمیل کی حیثیت میں ہو تو وہ اس سے انحراف کرے:

ما کان لمؤمن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرة من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا (احزاب - ۳۶)

کسی مومن یا مومنہ کو حق نہیں کہ جب اللہ اور رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو اپنے امر میں ان کے لئے اپنا بھی کچھ اختیار ہو۔ اور جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہ ہو گیا۔

یہ انفرادی اطاعت ہر صاحب ایمان پر خدا کا لازمی حق ہے۔ کوئی شخص ہرگز خدا کے یہاں عابد شمار نہیں کیا جا سکتا اگر وہ اپنی عملی زندگی میں ان احکام کی تعمیل نہ کر رہا ہو جو اس کے حالات اور معاملات میں اس کے اوپر خدا کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ "عبادت" اگر اپنی روح کے اعتبار سے اندرونی حوالگی کا نام ہے تو خارجی اعتبار سے یہ مطلوب ہے کہ انسان اپنے ظاہر کو پوری طرح خدا کی اطاعت میں دے دے۔ اس کی خارجی زندگی بالکل خدا کے بتائے ہوئے نقشہ کی تابع ہو جائے۔ ہر مومن اور مومنہ پر لازم ہے کہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے جن جن معاملات سے اس کا سابقہ پیش آئے، ان میں وہ مکمل طور پر خدا کی اطاعت کرے اور دوسری ترغیبات کی پیروی کرنا چھوڑ دے:

یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن انہ لکم عدو مبین بقرہ ـ ۲۰۸	اے ایمان لانے والو، تابعداری میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

احکام کے جس مجموعے کے لئے ہم نے "اطاعت" کا عنوان اختیار کیا ہے، اس کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اجتماعی احکام کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جن کی تعمیل کسی ایک صاحب ایمان کی مرضی پر منحصر نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس وقت روبعمل آتے ہیں جب پورا معاشرہ ان کو عمل میں لانے کے لئے تیار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ احکام ہمیشہ اس وقت نازل ہوئے جب اہل ایمان نے اپنے درمیان سیاسی تنظیم قائم کر لی، اور وہ اس حیثیت میں ہو گئے کہ اس قسم کے اجتماعی قوانین کو بزور نافذ کر سکیں۔ شریعت کے اجتماعی احکام کا مخاطب بااختیار مسلم معاشرہ ہے نہ کہ متفرق اور منفرد اہل ایمان۔

بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک وہ قبطی اقتدار کے تحت مصر میں تھے انھیں تورات کے قانونی احکام نہیں دیئے گئے۔ البتہ مصر سے نکل کر وہ صحرائے سینا میں پہنچے اور انھیں آزاد اور بااختیار گروہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تو خدا تعالیٰ کی طرف سے قوانین بھیج دیئے گئے۔ (خروج ۱۵ : ۲۵) ٹھیک یہی صورت عرب میں اختیار کی گئی۔ مکی دور میں جب کہ اہل ایمان بے اختیار اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے، شریعت کا وہ اصولی حصہ اترا جس کو قائم کرنے کے لئے اجتماعی اقتدار کی ضرورت نہیں۔ ہر مسلمان اپنے ذاتی فیصلہ سے اس کو اپنی زندگی میں اختیار کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بقیہ شریعت حالات کی نسبت سے بھیجی جاتی رہی۔ اجتماعی زندگی سے متعلق تفصیلی ہدایات مدینہ میں اس وقت نازل کی گئیں جب کہ اہل ایمان کو زمین پر اقتدار حاصل ہو گیا۔

احکام نازل ہونے کی یہ ترتیب بتا رہی ہے کہ عام حالات میں اہل ایمان پر دین کا صرف اتنا ہی حصہ مشروع و مفروض ہوتا ہے جتنا دور اقتدار سے قبل اترتا ہے۔ اس کے علاوہ بقیہ احکام کی تعمیل ان پر اس وقت فرض ہوتی ہے جب انھیں اقتدار اور حکومت کے مواقع حاصل ہو جائیں جو اس طرح کے احکام کے نفاذ کے لئے ضروری ہے۔ شرعی احکام کا دائرۂ عمل کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اترنا خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ احکام مطلقاً مطلوب نہیں ہیں بلکہ حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتے ہیں۔ ان کا تعین ہمیشہ اس شخص یا گروہ کے واقعی حالات کے اعتبار سے ہوتا ہے جو اس کا مخاطب ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمدنی اور اجتماعی احکام کا مخاطب صرف اہل ایمان کا وہ گروہ ہے جو ان احکام کو عمل میں لانے کی

حیثیت میں ہو۔ محدود دائرہ اختیار رکھنے والے اہل ایمان کو یہ حکم ہی نہیں دیا گیا ہے کہ وہ سماجی اور ملکی پیمانہ پر دینی احکام کو نافذ کریں۔ احکام کی تعمیل ایک عملی مطالبہ ہے اور کوئی مطالبہ صرف انھیں لوگوں سے کیا جاسکتا ہے جو پہلے سے اس کا اقرار کر چکے ہوں اور اسی کے بقدر کیا جاسکتا ہے جتنا بالفعل ان کے لئے ممکن ہے۔ شریعت کا واضح اصول ہے کہ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا (بقرہ۔ ۲۸۶) یعنی کسی کے اوپر اتنے ہی عمل کی ذمہ داری ڈالی جاتی ہے جتنا اس کے "وسع" میں ہو۔ وسع سے زیادہ کا مکلف ٹھہرانا اللہ کا طریقہ نہیں۔ پھر اہل ایمان کو ایسے احکام کا پابند کیوں کر کیا جاسکتا ہے جن کی وہ تعمیل کرنے کی حیثیت میں نہ ہوں۔ اگر کوئی شخص احکام دین کی تفصیل پیش کر کے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اہل ایمان ہر حال میں اس بات کے مکلف ہیں کہ وہ اس پوری فہرست کو زمین پر نافذ کریں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زکوٰۃ کے قوانین کا حوالہ دے کر کہے کہ سرمایہ کی وہ تمام اقسام جن پر زکوٰۃ کی شرحیں متعین کی گئی ہیں، ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ کوشش کر کے ان تمام مالیاتی مدوں کا مالک بنے تاکہ زکوٰۃ کے عنوان سے جو فرائض عائد کئے گئے ہیں، اپنی زندگی میں وہ ان سب کی تعمیل کر سکے۔

دین کے جو احکام ہیں، وہ شکل کے اعتبار سے تو سب کے سب یکساں ہیں، مگر ان احکام سے ہم کو جو نسبت ہے وہ یکساں نہیں۔ قرآن کا ایک حکم ہے "نماز قائم کرو"۔ دوسرا حکم ہے "زکوٰۃ ادا کرو" دونوں حکم بظاہر یکساں ہیں اور دونوں امر کے صیغہ میں ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ ان احکام کو جو نسبت ہے وہ دونوں میں یکساں نہیں۔ نماز کا حکم ایک مطلق حکم ہے جو ہر ہر مومن سے لازماً مطلوب ہے جب کہ زکوٰۃ کا حکم صاحب نصاب ہونے کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ جو شخص بقدر نصاب اموال زکوٰۃ کا مالک ہو، اس کے لئے تو یہ حکم اسی طرح قطعی حیثیت رکھتا ہے جس طرح نماز کا حکم۔ مگر جو شخص اموال زکوٰۃ کا مالک نہ ہو، اس سے نہ ادائگی زکوٰۃ کا مطالبہ ہے اور نہ اس حکم کی حد تک یہ مطالبہ کہ وہ کوشش کر کے بقدر نصاب اموال زکوٰۃ کا مالک بنے تاکہ زکوٰۃ کے حکم کی تعمیل کر سکے۔ جو فریضہ بر وقت عائد ہو رہا ہے، اس کے لئے سرگرم ہونا مطلوب ہو سکتا ہے۔ نہ یہ کہ جو فریضہ بر وقت عائد نہیں ہے اس کو وجود میں لانے کے لئے سرگرمی دکھائی جائے۔

معلوم ہوا کہ دین کے تفصیلی تقاضے مطلقاً مشروع نہیں ہیں بلکہ حالات کی نسبت سے مشروع ہوتے ہیں۔ اہل ایمان کا دائرہ جس نسبت سے پھیلتا ہے، اسی نسبت سے دین کے تقاضے بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب تنہا ایک شخص مومن ہو تو اس پر دین کا اتنا ہی حصہ فرض ہوگا، جتنا اس کی ذات سے متعلق ہے۔ اس وقت اس کی اپنی ذات ہی وہ مقام ہوگی جہاں وہ ہدایات الٰہی کی تعمیل کرے گا۔ جب اہل ایمان ایک یا چند خاندان کی صورت اختیار کرلیں تو یہ خاندان اپنے دائرہ کے لحاظ سے اس کے مخاطب ہوں گے اور جب اہل ایمان کا کوئی گروہ ایک با اختیار معاشرہ کی حیثیت حاصل کرلے تو اس وقت پورے معاشرہ کا فرض ہوگا کہ خدا کی طرف سے اس کے معاشرتی معاملات کے لئے جتنے احکام دیئے گئے ہیں، وہ ان سب کی مکمل پابندی کرے اور چوں کہ معاشرہ کے پیمانہ پر عمل اقتدار کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس لئے جب اہل ایمان کا کوئی معاشرہ اس حکم کا مخاطب ہو تو لازمی طور پر یہ مفہوم بھی اس میں شامل ہوگا کہ وہ اپنے اوپر

ایک سیاسی امیر مقرر کریں اور اس کے ماتحت اجتماعی زندگی بنا کر تمام شرعی قوانین کا اجراء عمل میں لائیں۔

اسلام کے تمام احکام کسی نفسیاتی حقیقت کا ظہور ہیں۔ جب ایمان دل کے اندر جاگزیں ہو جائے تو نفسیات انسانی میں اس کے اثرات کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ البتہ ان اثرات کا خارجی ظہور اسی کے بقدر ہوتا ہے جتنا خارجی حالات اس کا موقع دے رہے ہوں۔ اہل ایمان کے باہمی تعلق کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اس کے مدارج کی تقسیم اگرچہ ممکن نہیں۔ تاہم سمجھنے کے لئے اس کو تین بڑے مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اس کا پہلا مرحلہ تلقین کا مرحلہ ہے اور اس کی جڑ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کے لئے اخلاص و خیر خواہی ہو (النصح لکل مسلم، متفق علیہ) بائبل کے الفاظ میں وہ اپنے بھائی کا رکھوالا بن جائے (پیدائش ۴: ۹

اتی جریر رضی اللہ عنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: مد یدك یا جریر، فقال علی مہ، قال ان تسلم وجهك للہ والنصیحۃ لکل مسلم

کنز العمال ج ۱ ص ۸۲

حضرت جریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا، اے جریر ہاتھ بڑھاؤ۔ جریر نے کہا کس چیز پر۔ آپ نے فرمایا: اپنا چہرہ اللہ کے حوالے کر دو اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرو

یعنی باہمی معاملات میں ایسا رویہ اختیار کرو جو تمہارے بھائی کی دنیا و آخرت کے لئے مفید ہو اور ایسی ہر کارروائی سے بچو جس کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ اسلامی برادری کے درمیان انتشار و اختلاف پیدا کرنے کا باعث ہو گی۔

یہی وہ عمل ہے جس کو مکی سورہ العصر میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی نسبت سے بندۂ مومن کے اندر ظاہر ہونے والے جذبۂ عبودیت کو "باہم حق و صبر کی نصیحت"، کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس ایمانی تقاضے کے دو اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اس عمل کا ایک رخ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے جو کچھ چاہتا ہے، اس کی طرف ہم اللہ سے ایمان و اسلام کا معاہدہ کرنے والوں کو رغبت دلائیں۔ اور دوسرے یہ کہ مرضیٔ رب پر قائم ہونے کے سلسلے میں اس مادی دنیا میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں، ان کا مقابلہ کرنے اور مشکلات کے باوجود مرضیٔ رب پر جمے رہنے کے لئے مشترکہ طاقت سے مدد لیں۔

دوسرا مرحلہ تنظیم کا مرحلہ ہے۔ یعنی مسلمان منتشر انبوہ کی طرح نہ ہوں، بلکہ جس درجہ میں بھی ممکن ہو، وہ اپنے درمیان نظم قائم کریں اور شورائی اصول کے تحت اپنے اجتماعی معاملات کے فیصلے کریں۔ اس اصول کی ایک تعمیل وہ تھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صحرائے سینا میں پہنچنے کے بعد بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں میں تقسیم کر کے ان کے اوپر بارہ نقیب مقرر کئے۔ مکہ کے ابتدائی دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے گرد یہ اجتماعی نظام قائم تھا اور دار ارقم اس کا مرکز تھا۔ ہجرت سے پہلے مدینہ کے انصار کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ بیعت عقبہ ثانیہ (۶۲۲) کے موقع پر جب مدینہ کے پچھتر اشخاص (۷۳ مرد، ۲ عورتیں) نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تو اس وقت آپ نے ان سے کہا تم لوگ اپنے اوپر بارہ نقیب مقرر کر لو (وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخرجوا الی منکم اثنی عشر نقیبا یکونون علی قومھم بما فیھم، البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۱۶۰) چنانچہ انھوں

نے اپنے میں سے بارہ ذمہ دار آدمی منتخب کئے، جن میں سے تین قبیلہ اوس کے تھے اور نو قبیلہ خزرج کے۔ اس کے بعد آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

انتم کفلاء علی قومکم زرقانی جلد اول، صفحہ ۳۸۲	تم مومنین مدینہ کے اوپر نگراں اور ذمہ دار ہو۔

اسی قسم کی امارت حضرت جعفر کی تھی جو حبش کے مہاجرین کے اوپر امیر مقرر ہوئے تھے (سیرت ابن ہشام) اسی طرح دار الاسلام سے نکل کر مسلمان دنیا کے جن علاقوں میں پھیلے، ہر جگہ انھوں نے اپنی جماعتی تنظیم بنانے کی کوشش کی۔ خود اسلامی زندگی گزارنے اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ جس چیز کی انھوں نے خاص طور پر کوشش کی، وہ یہی تھا کہ وہ منظم ہوں اور ایک سربراہ کے تحت اپنے شرعی فرائض کو انجام دیں۔

اسلامی اجتماعیت کا آخری مرحلہ سیاسی نظام کی تشکیل ہے جس کو اصطلاح میں نصب امامت کہا جاتا ہے۔ نصب امامت، یعنی مسلمانوں کا سیاسی اور اجتماعی امام مقرر کرنا متفقہ طور پر واجب ہے:

نصب الامام عندنا واجب (شرح مواقف)	مسلمانوں کے لئے اپنے اوپر امام مقرر کرنا ہمارے نزدیک واجب ہے
لابد للامة من امام (شرح مقاصد)	مسلمانوں کا اپنا ایک امام ہونا لازمی ہے۔
المسلمون لابد لهم من امام (عقائد نسفی)	مسلمانوں کے لئے ایک امام ضروری ہے۔

اس مسئلہ کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ فقہ و عقائد کی کوئی بھی کتاب اس کے تذکرہ سے خالی نہیں اور اس میں خوارج کے ایک معدوم فرقہ "نجدات" کے سوا کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ ابن حزم لکھتے ہیں:

اتفق جميع اهل السنة وجميع المرجئة وجميع الشيعة وجميع الخوارج على وجوب الامامة حاشا النجدات من الخوارج الملل والنحل، صفحہ ۸۷	تمام اہل سنت، فرقہ مرجئہ، شیعہ اور باستثنائے فرقہ نجدات تمام خوارج، امامت کے واجب ہونے پر متفق ہیں۔

اس معاملہ میں اگر اختلاف ہے تو صرف یہ کہ اہل سنت والجماعتہ اس کو "سمعا" یعنی شرعی حکم کے طور پر واجب مانتے ہیں اور بعض فرقے مثلاً زیدیہ اور معتزلہ کا قول یہ ہے کہ یہ از روئے عقل ضروری ہے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، اپنے اوپر سیاسی امام مقرر کرنے کا مسئلہ ایک ایسے مسلم معاشرہ سے متعلق ہے جو مستقل اجتماعی حیثیت کا حامل ہونے کی وجہ سے اپنی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم برپا کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ متفرق اور منتشر اہل ایمان کے لئے اپنے اوپر سیاسی امام مقرر کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کوئی مطلق حکم نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ جو اپنی الگ اجتماعیت رکھتا ہو، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی اجتماعیت کو دین کی بنیادوں پر منظم کرے اور اپنا ایک سیاسی امیر مقرر کر کے اس کے ماتحت منظم زندگی گزارے، سیاسی امامت کسی گروہ کے اجتماعی اختیارات کا ظہور ہے۔ پھر جہاں اجتماعی اختیار پایا جائے وہیں تو اس کے ظہور کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جہاں سرے سے اجتماعی اختیار ہی موجود نہ ہو، وہاں اس کا ظہور کیسے ہوگا اور اس قسم کے احکام کی "تکلیف" اس کو کس بنیاد پر دی جائے گی۔

اوپر جو بات کہی گئی، وہ اہل ایمان پر احکام کی مشروعیت کے پہلو سے ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دین کی ایک اہم حکمت تدریج فی الاحکام ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو جس طرح غیر مسلم اکثریت کے درمیان مسلم اقلیت کی ذمہ داری یہ نہیں ہوتی کہ وہ اسلام کے اجتماعی احکام کے نفاذ کی مہم سے اپنے کام کا آغاز کرے۔ اسی طرح بگڑے ہوئے مسلم معاشرہ میں اگر کچھ لوگوں کو اسلام کا شعور حاصل ہو جائے تو ان کی ذمہ داری بھی پہلے مرحلہ میں یہ نہیں ہے کہ وہ نفاذ قانون کے مطالبہ کی مہم جاری کر دیں۔ اس قسم کی مہم اسلام کے تدریجی طریق کار سے انحراف کے ہم معنی ہوگی۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ دین کے ابتدائی احکام اور اس کی اصولی تعلیمات کے پھیلانے سے اپنے کام کا آغاز کیا جائے۔ اور مسلم معاشرہ کو اس حد تک اصلاح یافتہ بنایا جائے کہ اس کے اندر اسلام کے عدالتی احکام اور اجتماعی قوانین کی قبولیت کا مادہ ضروری حد تک پیدا ہو جائے، اس کے بعد ہی وہ وقت آئے گا جب اسلام کے ان احکام کے نفاذ کی مہم شروع کی جائے۔

حضرت عائشہ رض کی مشہور روایت سے تدریج فی الاحکام کی اہمیت واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں تدریج کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں کے لئے ضروری احکام یکبارگی پوری شکل میں نازل نہیں کر دیئے گئے، بلکہ اکثر احکام کو قسط وار صورت میں بھیجا گیا۔ یہی وہ رعایت ہے جس نے کتاب الٰہی میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ اگر ہر حکم پہلی ہی بار پوری شکل میں نازل کر دیا گیا ہوتا تو نسخ کا کوئی سوال نہ تھا۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ وعظ کرنا اور قرآن کی تفسیر بیان کرنا ایسے شخص کے لئے جائز نہیں جو ناسخ و منسوخ کے مسائل کو نہ جانتا ہو۔

شہادتِ حق

غیر مسلموں کے سلسلہ میں ہماری جو ذمہ داری ہے وہ شہادت حق یا دعوت الی الاسلام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک پوری طرح پہنچ جائے تاکہ آخرت میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ ہم کو حقیقت کا علم نہیں تھا۔

دنیا میں انسان کو اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کا امتحان لیا جائے، قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

الذی خلق الموت والحیوٰۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا (ملک۔۲)	خدا نے بنائی موت اور زندگی تاکہ تم کو جانچے کہ کون تم میں اچھا کام کرتا ہے۔

یہ ایک نہایت سنگین صورت حال ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں آدمی جو رویہ اختیار کرے گا، اسی پر آخرت میں اس کے انجام کا انحصار ہوگا جو یا تو دائمی جنت ہے یا دائمی جہنم۔ صورت حال کی اس سنگینی کی

ے انما نزل اول ما نزل سورۃ من المفصل فیها ذکر الجنۃ والنار حتی اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا، بخاری، باب تالیف القرآن

بنا بر اللہ تعالےٰ نے انسان کو خبردار کرنے کے لئے دو خصوصی انتظام فرمائے۔ ایک یہ کہ ہر آدمی کی فطرت میں صحیح اور غلط کا شعور رکھ دیا:

فالھمھا فجورھا وتقواھا (شمس ۔ ۸) — پھر اس کو سمجھ دی برائی کی اور بچ کر چلنے کی۔

حقیقت کا یہ شعور پیدائش کے اول روز انسان کے اندر پیوست کر دیا گیا تھا:

واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علیٰ انفسھم الست بربکم قالوا بلیٰ شھدنا ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ھذا غافلین (اعراف ۱۷۲) — اور جب تمھارے رب نے اولاد آدم کی پیٹھ سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو ان کی اپنی ذات پر گواہ بنایا، کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں، بولے ہاں ہم گواہ ہیں، تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

پھر اس فطری پیش بندی کے بعد دوسرا انتظام یہ کیا گیا کہ رسالت کا باقاعدہ سلسلہ جاری کیا گیا تاکہ براہ راست انسانی عمل کے ذریعہ ہر آدمی تک حقیقت کا علم پہنچ جائے:

رسلا مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل (نساء ـ ۱۶۵) — ہم نے پیغمبر بھیجے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے۔

نبوت کا یہ سلسلہ آغاز حیات سے جاری ہے۔ حضرت آدم نہ صرف پہلے انسان تھے بلکہ پہلے نبی بھی تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں خدا کی مشیت ہوئی کہ نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۶۳۲ ـ ۵۷۰) آخری نبی تھے جو خدا کی طرف سے آئے۔ مگر جہاں تک پیغام رسانی کے کام کا تعلق ہے، وہ اب بھی اسی طرح مطلوب ہے جس طرح وہ پہلے مطلوب تھا۔ اس کے لئے اب امت محمدی کو چن لیا گیا ہے (ھو اجتباکم، حج) ہمارے اوپر آخری رسول نے دین کی کامل گواہی دے دی اور ہماری ذمہ داری یہ قرار پائی کہ ہم قیامت تک نبی کی تبعیت میں دنیا کی قوموں پر حق کی گواہی دیتے رہیں:

لیکون الرسول شھیدا علیکم وتکونوا شھداء علی الناس (حج) — تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں کے اوپر گواہ ہو۔

یہ کام کوئی ضمنی کام نہیں بلکہ امت مسلمہ کا مقصد وجود ہے۔ قرآن کے مطابق رسول کی رسالت کا تحقق اس پر موقوف تھا کہ وہ پیغام رسانی کے کام کو اپنے مخاطبین کے اوپر پوری طرح انجام دیں۔ اگر وہ اس کو انجام نہ دیتے تو خود فریضہ رسالت ناتمام رہ جاتا:

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ (مائدہ ۶۷) — اے رسول جو کچھ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا۔

یہ ذمہ داری جو رسول پر ہے، وہی آپ کے متبعین پر بھی ہے (۔۔۔ انا ومن اتبعنی، یوسف ۱۰۸) رسول

کی رسالت کے تحقق کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہدایت کے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اسی طرح امت محمدی کا امتِ محمدی قرار پانا بھی اس پر منحصر ہے کہ وہ رسول کے بعد اس پیغام کو اگلی نسلوں تک پہنچاتے رہیں۔ ہم کو امت محمدی کی جو نسبت ملی ہے وہ اسی بنا پر ملی ہے کہ ہم رسول کے بعد رسول کے اس کام کو قیامت تک لوگوں کے اوپر انجام دیتے رہیں گے۔ یہ واقعہ کہ اسلام کے علاوہ کسی دین پر مرنا اپنے آپ کو آگ کے خطرہ میں مبتلا کرنا ہے (کل من مات علی غیر دین الاسلام فھو فی النار) ایک شخص کو نہ صرف خود دین حق پر چلنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے بلکہ اس کے اندر یہ بیتابی بھی بھڑک اٹھتی ہے کہ وہ دوسرے ابنائے نوع کو اس خطرے سے بچانے کی کوشش کرے۔

ابن عبدالبر نے معاویہ ابن حیدہ قشیری کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوت پہنچائی تو اسی کے ساتھ آخر میں ارشاد فرمایا:

مالی امسک بحجزکم عن النار، الا ان ربی داعی وانہ سائلی، ھل بلغت عبادی، فاقول رب قد بلغت الا فلیبلغ شاھدکم غائبکم (الاستیعاب)

میں کیوں ایسا کرتا کہ تمھاری کمر پکڑ کر تم کو آگ سے روکوں۔ مگر یہ کہ میرا رب مجھے بلائے گا اور یقیناً وہ مجھ سے پوچھے گا، کیا تو نے میرے بندوں تک پہنچا دیا تھا۔ تو میں کہہ سکوں گا، اے میرے رب میں نے پہنچا دیا تھا، سن لو، پس تم میں سے جو حاضر ہیں وہ غائب تک پہنچا دیں۔

یہ امت مسلمہ کی وہ اہم ترین ذمہ داری ہے جسے ہر اختلاف کو مٹا کر انجام دینا ہے۔ طبرانی نے حضرت مسور بن مخرمہ کے واسطے سے نقل کیا ہے:

خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی اصحابہ فقال: ان اللہ بعثنی رحمۃ للناس کافۃ فادوا عنی، رحمکم اللہ، ولا تختلفوا کما اختلف الحواریون علی عیسیٰ علیہ السلام

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے پاس آئے اور فرمایا، اللہ نے مجھے تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، پس تم لوگ، اللہ تم پر رحم کرے، میری طرف سے اس فرض کو ادا کرو اور اختلاف نہ کرو جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اختلاف کیا۔

جس طرح نبی مبعوث ہوتا تھا، اسی طرح یہ امت گویا اس مقصد کے لئے دائمی طور پر مبعوث ہے۔ خلیفہ ثانی کے زمانہ میں جب ربعی بن عامر سرداران فارس کے دربار میں اسلام کے سفیر بن کر گئے اس وقت جو گفتگو ہوئی اس کا ایک ٹکڑا یہ تھا:

فقالوا الہ ما جاء بکم؟ فقال اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الیٰ عبادۃ اللہ، ومن ضیق الدنیا الی سعتھا ومن جور الادیان الی عدل الاسلام، فارسلنا بدینہ الیٰ خلقہ لندعوھم الیہ (البدایہ والنہایہ)

سرداروں نے پوچھا: تم لوگ کس لئے یہاں آئے ہو۔ ربعی بن عامر نے جواب دیا: اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ جس کو وہ چاہے، اس کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت میں لائیں، دنیا کی تنگی سے اس کی فراخی کی طرف لائیں اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لائیں۔ پس اللہ

نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے
تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔

یہ ذمہ داری ایک عالم گیر ذمہ داری ہے جو کسی جغرافی حد پر نہیں رکتی۔ صاحب البدایہ نے کسریٰ کے دربار میں نعمان بن مقرن کی جو تفصیلی تقریر نقل کی ہے، اس میں انھوں نے کسریٰ کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا:

وأمرنا ان نبدأ بمن یلینا من الامم فندعوھم الی الانصاف فنحن ندعوکم الی دیننا وھو دین الاسلام حسّن الحسن وقبح القبیح کلہ
(البدایہ والنہایہ جلد ۷، صفحہ ۴۱)

(عرب میں دین پھیل گیا تو ہمارے نبی نے) ہم کو حکم دیا کہ ہم اپنے قریب کی قوموں میں جائیں اور ان کو عدل کی طرف بلائیں پس ہم تم لوگوں کو دین اسلام کی طرف بلاتے ہیں جو اچھا ہے اس کو اس دین نے اچھا بتا دیا ہے، جو برا ہے اس کو اس دین نے برا بتا دیا ہے۔

صحابۂ کرام کے سامنے یہ ذمہ داری انتہائی طور پر واضح تھی۔ خلافت فاروقی کے زمانہ میں عمرو بن العاص نے مصر کے مذہبی ذمہ داروں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو اس میں کہا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے انسانیت کے نام ایک پیغام لے کر بھیجا تھا۔ آپ نے اپنی ذمہ داری کو مکمل طور پر ادا فرمایا اور اپنے بعد ہمارے لئے ایک واضح طریقہ چھوڑ گئے جس پر چل کر ہم عالم انسانیت کو یہ خدائی پیغام پہنچاتے رہیں (وقد قضی الذی علیہ وترکنا علی الواضحۃ، ابن جریر، ج ۴، صفحہ ۲۲۷)

رسولوں کے بھیجنے کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اعلان و اسرار (نوح ۔ ۹) کے ذریعہ حق کے پیغام سے لوگوں کو خبردار کر دیں۔ یہ خدا کی طرف سے آگہی اور پیغام رسانی کا ایک کام ہے جو اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ کائنات جس اسکیم کے تحت بنی ہے اور بالآخر اس کا جو انجام ہونے والا ہے، اس سے لوگ مطلع ہو جائیں، جو کچھ غیب میں ہے، وہ اس وقت کے آنے سے پہلے لوگوں کے علم میں آجائے جب موجودہ دنیا کی بساط الٹ دی جائے گی اور غیب، شہود بن جائے گا۔ اس سلسلہ میں ہماری جو ذمہ داری ہے، وہ یہ کہ لوگوں کو اس اخروی حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ وہ ایک خدا کے بندے ہیں اور انھیں اپنے کارنامہ حیات کا حساب دینے کے لئے اس کے یہاں حاضر ہونا ہے۔

متکلمانہ حکمت کا تقاضا کسی وقت یہ ہو سکتا ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو ایک "بہتر دنیوی نظام" کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ یہ بات صرف متکلمانہ ضرورت کی حد تک صحیح ہے۔ اگر اسی کو دعوت اسلامی کا اصلی اور حقیقی انداز قرار دیا جائے تو وہ اپنی صداقت کھو دے گی۔ کیوں کہ اسلام کو اگر اصلاً بہتر دنیوی نظام کی حیثیت سے پیش کیا جانے لگے تو ایسی صورت میں دعوت اسلامی کی حیثیت مخاطب کے ذہن میں یہ بن جائے گی کہ وہ مسائل عالم کو حل کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مقصد معاشی اور سیاسی عذاب سے نجات دلانا ہے جب کہ انبیاء حقیقۃً اس لئے آتے تھے کہ وہ لوگوں کو آسمانی عذاب سے نجات کا راستہ بتائیں:

یلقی الروح من امرہ علیٰ من یشاء من عبادہ
خدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اپنے حکم سے

لینذر یوم التلاق (مومن ۱۵) وحی بھیجتا ہے تاکہ وہ ملاقات کے دن سے ڈرادے۔

اس کارِ تبلیغ کی انتہائی صورت مدعو کے لحاظ سے تو یہ ہے کہ وہ دعوت کو قبول کرکے اپنی زندگی اس کے مطابق بنائے۔ مگر داعی کے لحاظ سے اس کی انتہائی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو آخری حد تک لوگوں تک پہنچادے۔ وہ حقیقت کو ان کے اوپر اس طرح واضح کردے کہ پھر اس کے بعد کسی کے لئے عذر اور تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ چنانچہ انبیار کے لئے اتمام حجت کا جو معیار مقرر کیا گیا وہ یہی تھا کہ وہ اپنی بات کو پوری طرح لوگوں تک پہنچادیں۔ اس سے آگے انھیں کسی اور چیز کا مکلف نہیں بنایا گیا۔ وہ تمام قومیں جن کا قرآن میں اس حیثیت سے ذکر ہے کہ انھوں نے انبیاء کے پیغام کو نہیں سنا اور ان کی نافرمانی کرکے عذاب الٰہی کی مستحق ہوگئیں، وہ وہی ہیں جن پر نبی نے اپنی تقریروں اور گفتگوؤں کے ذریعے کام کیا تھا۔ بات پہنچانے سے زیادہ کچھ اور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس حکم کی تعبیر کے لئے جو مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ سب اطلاع اور آگہی کے معنی ہیں۔ مثلاً صدع بالامر (حجر ۹۴) تبئین ذکر (نحل ۔ ۴۴) ایذان وحی (انبیاء ۔ ۱۰۹) ابلاغ رسالۃ (اعراف ۔ ۷۹) قص آیات (اعراف ۔ ۳۵) قرأت قرآن (بنی اسرائیل ۔ ۱۰۱) تلاوت کتاب (عنکبوت ۔ ۵۱) انذار و تبشیر (سبا ۔ ۲۸) نداء للایمان (آل عمران ۔ ۱۹۳) دعوت الی الاسلام (صف ۔ ۷) تبلیغ ما انزل اللہ (مائدہ ۔ ۶۷) تذکیر بایام اللہ (ابراہیم ۔ ۵) وغیرہ

بیہقی نے مغیرہ ابن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ ایک روز آپ نے ابوجہل کے سامنے دعوت پیش کی تو اس نے کہا:

یا محمد! ھل انت منتہٍ عن سبّ آلھتنا، ھل ترید الا ان نشھد انک قد بلغت، فنحن نشھد ان قد بلغت

اے محمدؐ، کیا تم ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے رک جاؤگے۔ تم یہی تو چاہتے ہو کہ ہم گواہی دے دیں کہ تم نے پہنچا دیا تو ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم نے پہنچا دیا۔

آپ نے اپنے اصحاب سے متعدد بار یہ گواہی لی کہ آپ نے پیغام الٰہی کو انھیں پوری طرح پہنچا دیا ہے۔ امام احمد نے ثعلبہ بن عباد العبدی سے روایت کیا ہے کہ آپ ایک تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

یا ایھا الناس انشدکم اللہ ان کنتم تعلمون انی قصرت عن شیئٍ من تبلیغ رسالات ربی عز و جل لما اخبرتمونی ذلک قال: فقام رجال فقالوا: نشھد انک قد بلغت رسالات ربک و نصحت لامتک و قضیت الذی علیک

اے لوگو، میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں۔ تمہارے علم میں اگر میں نے اللہ کے پیغامات پہنچانے میں کوئی کوتاہی کی ہو تو ضرور مجھ کو اسے بتادو۔ لوگ کھڑے ہوئے اور کہا، ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور اپنی امت کی خیرخواہی کا حق ادا کردیا اور جو ذمہ داری آپ پر تھی اس کو پورا کردیا۔

داعی اسی جذبہ کے تحت دعوتی کام کا آغاز کرتا ہے۔ وہ حکمت اور خیرخواہی کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات آخری حد تک لوگوں کو سنا دینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد اس مہم کے دوران میں جو واقعات پیش آتے ہیں

ان کا تعلق اصلاً کار تبلیغ سے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں سے ہے جن کے اوپر شہادت و تبلیغ کا کام کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کوئی ایک صورت متعین نہیں کی جا سکتی اور نہ اس کی کسی مخصوص مثال کو لازمی طور پر شہادت کی تشریح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ داعی صرف پکارتے پکارتے مر جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کی بعض اہم شخصیتیں اسلام قبول کر لیں اور ان کے اثر سے خدا کا دین یکایک پورے علاقہ میں پھیل جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مخاطبین سے ٹکراؤ ہو اور وہ تنہا یا اقتدار سے مل کر تحریک کو ختم کر دینے کی سازش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کر دے کہ داعی اول یا اس کے بعد آنے والے اس کے ساتھی ملک کے اقتدار پر قابض ہو جائیں۔ پھر اقتدار پر قبضہ کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ محض ایک سیاسی غلبہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تحریک اتنے وسیع پیمانہ پر اپنے مخاطبین کا تعاون حاصل کرے کہ وہاں اسلام کی بنیاد پر ایک منظم سوسائٹی وجود میں آجائے۔ یہ ساری صورتیں ممکن ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی مثالیں انبیاء کی دعوتی جدوجہد کی طویل تاریخ میں موجود ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی صورت شہادت حق کی ادائگی کی شرط یا اس کی معیاری صورت نہیں ہے۔ شہادت یا دعوت کی ادائگی صرف یہ ہے کہ خدا کے پیغام کو حقیقی "نصح" (اعراف - ۶۸) کی تمام شرائط کے ساتھ قول بلیغ (نساء - ۶۳) کی زبان میں لوگوں تک پوری طرح پہنچا دیا جائے اور اس پہنچانے میں خواہ کسی بھی قسم کی رکاوٹ پیش آئے، اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے جاری رکھا جائے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ اس جدوجہد کے دنیوی نتائج یا دوسرے لفظوں میں تاریخ دعوت کے واقعات ہیں جو مختلف حالات میں مختلف شکل اختیار کرتے ہیں۔ گویا داعی کی نسبت سے جو کچھ مطلوب ہے وہ صرف یہ کہ خدا کے پیغام کو وہ آخری حد تک پہنچا دے اور آخر عمر تک پہنچاتا رہے۔ بقیہ تمام چیزیں دراصل وہ واقعات ہیں جو مدعو کی نسبت سے پیش آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات کی کوئی لگی بندھی فہرست نہیں بنائی جا سکتی اور نہ ان کی نوعیت کا فرق داعی کے کام کے ناقص یا کامل ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ غیر اہل اسلام پر جو دعوتی کام کیا جائے گا، اس میں ان کے سامنے بیک وقت سارا دین پیش کرنا ضروری نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ پہلے دین کی اصولی تعلیمات انھیں بتائی جائیں۔ خدا کا تصور، رسالت کا تصور، آخرت کا تصور، یہ وہ چیزیں ہیں جو اولاً غیر مسلم مخاطبین کے سامنے رکھی جاتی ہیں اور مسلسل مختلف پہلوؤں سے ان کے سامنے اس کی وضاحت کی جاتی ہے، جہاں جہاں ان کا ذہن اٹک رہا ہوتا ہے اس کو مؤثر استدلال کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ اسے مان لیتے ہیں تو انھیں ان احکام کی تعلیم دی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے لئے مقرر کئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو یمن کی طرف دعوتی مشن پر بھیجا تو ان سے فرمایا کہ تم اہل کتاب کے ایک گروہ سے ملو گے تو انھیں سب سے پہلے کلمہ توحید کی طرف بلانا (فلیکن اول ما تدعوھم الیہ شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ) جب وہ اس کو مان لیں تو اس کے بعد انھیں بتدریج نماز اور دیگر اعمال شریعت کی تعلیم دینا:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ
عبداللہ بن عباس رضؓ کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

صلی اللہ علیہ وسلم لمعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حین بعثہ الی الیمن، انک ستاتی قوماً اھل کتاب۔ فاذا جئتھم فادعھم الی ان یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمداً رسول اللہ فان اطاعوا لک بذلک فاخبرھم ان اللہ فرض علیھم خمس صلوات کل یوم ولیلۃ فان اطاعوا لک بذلک فاخبرھم ان اللہ فرض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم فترد علی فقراءھم۔ فان اطاعوا لک بذلک فایاک وکرائم اموالھم (بخاری)

معاذ بن جبل رضؓ کو یمن روانہ کرتے ہوئے فرمایا، تم ایک ایسی قوم میں جا رہے ہو جو اہل کتاب ہے۔ جب تم وہاں پہنچو تو اولاً انھیں اس بات کی دعوت دینا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ جب وہ اسے مان لیں تو انھیں بتانا کہ اللہ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ اس کو بھی مان لیں تو انھیں بتانا کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مال داروں سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء میں تقسیم کیا جائے گا۔ جب وہ اسے بھی مان لیں تو تم ان کے بہترین اموال سے بچنا۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء کو ابتدائی دعوتی مرحلہ میں صرف بنیادی تعلیمات دی جاتی تھیں۔ وہ عرصہ دراز تک انھیں کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ اس کے بعد جیسے جیسے عملی حالات پیدا ہوتے تھے اس کے مطابق تفصیلی ہدایات نازل کی جاتی تھیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبی کسی قوم کے پاس آیا تو اس نے پہلے ہی مرحلہ میں ایک پورا سماجی اور تمدنی نظام مرتب کرکے لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ اسلامی اسٹیٹ قائم کرکے ان تمام قوانین کو زندگی کے سارے شعبوں میں جاری کرو۔

مذکورہ حدیث میں جن احکام کا ذکر ہے وہ سب اس وقت تک اتر چکے تھے۔ مگر داعی کو آپ ہدایت فرماتے ہیں کہ ان سب کو بیک وقت ان کے سامنے پیش نہ کرنا بلکہ مدعو کے حالات کے اعتبار سے بتدریج ان کو ان کے سامنے لے آنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ احکام جس طرح ابتداءً تدریجی طور پر نازل ہوئے ہیں، اسی طرح نازل ہونے کے بعد بھی وہ تدریجی طور پر مطلوب ہیں۔ نازل ہونے کی ترتیب ہی دائمی طور پر ان کے مطلوب ہونے کی ترتیب کو بتا رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ابتداءً تو ان کا نزول تدریجاً ہوا ہو اور نزول کے بعد ان کی تدریجی حکمت منسوخ ہو گئی ہو اور اب وہ ہر حال میں مجموعی طور پر مطلوب ہوں۔

ارکان اربعہ

ایمان کے بعد اسلامی نظام میں چار چیزوں کو " ارکان " کا درجہ حاصل ہے ــــــ روزہ ، نماز ، زکوٰۃ اور حج ۔ یہ چار چیزیں ، اپنی معنوی حقیقت کے اعتبار سے ، وہ چار اجزار ہیں جن سے مل کر وہ کُل وجود میں آتا ہے جس کے مجموعہ کو اسلام کہتے ہیں ۔ روزہ ، عالم مادی سے اوپر اٹھنے کا نام ہے تاکہ آدمی اپنے آپ کو خدا سے مربوط کر سکے ۔ نماز کی روح خدا کی یاد ہے ۔ زکوٰۃ کی حقیقت ایثار ہے جو اسلام کے اس حصہ کا گویا خلاصہ ہے جس کو اخلاق و معاملات یا حقوق العباد سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ حج کی اصل خدائی مشن کے لئے قربانی ہے ۔ یہ عظیم ترین داعیِ حق سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی داعیانہ زندگی کی تجدید کا عہد ہے ۔ یہ چار ارکان ایک اعتبار سے مجموعہ اسلام کے چار بنیادی اجزار کی علامتیں ہیں اور دوسرے اعتبار سے وہ آدمی کو اس کے لئے تیار کرتے ہیں کہ وہ اسلام کو پوری طرح اپنی زندگی میں اختیار کر سکے ۔

اسلام کی ہر عبادت اگرچہ ایک خاص روح کی حامل ہے ۔ مگر اسی کے ساتھ عبادات کی ترکیب اس طرح کی گئی ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد کو پورا کرتے ہوئے دیگر ذیلی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بھی بن سکے ۔ اس معاملہ میں اسلام کی مثال انسانی جسم کی سی ہے ۔ ہمارے ہر عضو کا ایک علیٰحدہ انفرادی وظیفہ ہے مگر اسی کے ساتھ وہ پورے جسم کے ساتھ اس طرح مربوط ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔

۱ ۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ صلاحیتوں کے فرق کے ساتھ ہر ایک اس سے اپنا کچھ نہ کچھ حصہ پالے ۔ مثلاً کسی کا روزہ اور نماز ، اگر اس کو مقام اقتراب (علق ۔ ۱۹) تک نہ پہنچائے تو کم از کم اس کو مقام تقویٰ تک پہنچا دے جب کہ نماز اس کے لئے فحش اور منکر چیزوں سے روکنے والی بن گئی ہو (عنکبوت ــ ۴۵) اور روزہ حدیث کے الفاظ میں قول زور اور فسق و صخب سے دور رکھنے کی ایک تربیت ثابت ہو ، یہ اس کے لئے شیطانی حملوں کے مقابلہ میں ایک ڈھال (جُنّۃ) کا کام دینے لگے ۔

۲ ۔ ہر عبادت کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے مخصوص انفرادی مقصد کو پورا کرتے ہوئے دیگر عبادات سے بھی پوری طرح جڑی ہوئی ہو ۔ مثلاً حج کا اصل مقصد آدمی کو داعیانہ زندگی کے لئے تیار کرنا ہے ، مگر اسی کے ساتھ اس کی شکل ایسی رکھی گئی ہے کہ مقامات مقدسہ کی زیارت اور مناسک حج کی ادائگی کے دوران آدمی کو محبت الٰہی اور استحضار آخرت کا خصوصی حصہ ملتا ہے ۔ اس فریضہ کی ادائگی کے بعد وہ اس طرح پاک وصاف ہو کر لوٹتا ہے کہ دوبارہ زیادہ بہتر طور پر دینی زندگی شروع کرنے کے قابل ہو سکے ۔

۳ ۔ ہر عبادت اصلاً ، کسی نہ کسی طور پر بندے کو خدا سے جوڑنے کے لئے ہے ۔ مگر اسی کے ساتھ اس کی تشکیل اس طرح کی گئی ہے کہ زندگی کے دوسرے تقاضے بھی پورے ہوں ، یا کم از کم وہ ان کے لئے ایک بہتر محرک ثابت ہو ۔

مثلاً نماز باجماعت یا حج کے عالمی اجتماع کے ذریعہ اہل اسلام میں باہمی اتحاد کو فروغ دینا، روزہ میں صحت جسمانی کے فوائد، زکوٰۃ کے ذریعہ معاشیات کا انتظام درست کرنا وغیرہ۔

روزہ

روزہ کی اصل صوم ہے۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہی چیز ہے جس کے لیے دوسری جگہ — تبتل الی اللہ (مزمل — ۸) کا لفظ آیا ہے۔ یعنی بے تعلق ہونا، کنارہ کشی اختیار کرنا۔ روزہ کی باقاعدہ فرضیت، دوسرے اکثر اعمال کی طرح، مدنی دور میں ۲ھ میں ہوئی ہے، تاہم روزہ کسی نہ کسی شکل میں اس سے پہلے بھی موجود تھا۔ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ "قریش جاہلیت میں عاشورار کے دن روزہ رکھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دن روزہ رکھتے تھے" (صحیح مسلم) حتیٰ کہ بعثت سے پہلے غار حرا میں آپ کے قیام کو شامل کرلیا جائے تو روزہ وہ عبادت قرار پاتی ہے جہاں سے اسلامی زندگی میں داخلہ کا آغاز ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے جب مشیت الٰہی کا یہ فیصلہ ہوا کہ انھیں کتاب الٰہی کا حامل بنایا جائے تو حکم ہوا کہ کوہ طور پر چلے جاؤ اور وہاں لوگوں سے علیٰحدہ ہو کر روزہ اور عبادت میں مشغول رہو۔ انھوں نے مسلسل چالیس دن اسی عالم میں پہاڑ پر گزارے۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب خدا ان سے ہم کلام ہو :

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ (اعراف-۱۴۳) اور جب موسیٰ پہنچے ہمارے وقت پر اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا۔

"حضرت مسیح نے اپنی نبوت کے آغاز سے قبل ۴۰ دن تک روزہ رکھا تھا" (جیوئش انسائیکلو پیڈیا) اس کے بعد ان پر وہ الہام ہوا جو "پہاڑی کا وعظ" کی شکل میں انجیل میں موجود ہے۔ اسی طرح پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے مکہ کے قریب ایک غار (حرا) میں چلے جاتے۔ وہاں آپ روزہ رکھتے۔ تنہائی کی زندگی گزارتے اور عبادت اور غور و فکر میں مشغول رہتے۔ اس طرح "تحنث" کی ایک طویل زندگی کے بعد وہ وقت آیا جب فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے خدا کا کلام آپ تک پہنچایا۔

روزہ کے لئے شریعت میں صوم کا لفظ ہے۔ صام یصوم کے اصل معنی ہیں رکنا۔ چلنے پھرنے، بولنے، کھانے پینے سے رک جانا۔ الخیل الصائم اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کا چارہ پانی بند کرکے کھڑا کردیا گیا ہو۔ اسی لئے ماہ رمضان کو حدیث میں صبر کا مہینہ (شھر الصبر) کہا گیا ہے۔ حارث بن مالک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ایک روزہ کی خبر دی تو کہا۔ عزفت عن الدنیا و اظمأت نہاری (میں دنیا سے علیٰحدہ ہوگیا اور دن بھر پیاسا رہا) روزہ اپنی ظاہری علامت کے اعتبار سے صبح سے شام تک کھانا پینا بند کرنے کا نام ہے۔ مگر اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے روزہ یہ ہے کہ آدمی علائق دنیا سے اپنے آپ کو کاٹ لے۔ ہر اس چیز میں کمی کرے جو مادی اعتبار سے موجودہ دنیا میں انسان کو درکار ہوتی ہیں۔ بولنا، ملنا جلنا، سونا، تقاضائے بشری پورا کرنا، غرض ہر چیز میں اپنے معمولات کو کم کردے حتیٰ کہ رمضان کے آخری دنوں میں اعتکاف کرکے ان چیزوں سے بالکل ہی کٹ جائے۔ اعتکاف

کی شکل میں بندہ اشتغال بالخلق سے علیحدگی اختیار کرتاہے تاکہ اس کو اشتغال بالحق کے مواقع حاصل ہوں۔ یہ چیز مومن سے پوری زندگی میں مطلوب ہے۔ حدیث میں اس کو زہد (دنیا سے بے رغبتی) کہا گیا ہے۔ پھر ماہ رمضان میں بہ شکل صوم اس کو فرض کیا گیا ہے اور اس ماہ کے آخری دنوں میں اعتکاف (گوشہ نشینی) کی صورت میں اس کو ایک انتہائی مطلوب عبادت قرار دیا گیا ہے۔ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف، اس انقطاع الی اللہ کی کلی شکل ہے جو مہینہ کے بقیہ حصوں میں بر بنائے رخصت جزوی طور پر تلقین کی گئی ہے۔

اس روزہ داری سے کیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسان کا مادی پہلو کمزور ہو، اس کی روحانیت بڑھے تاکہ عالم قدس سے اس کا اتصال ممکن ہو سکے۔ جسم کی مادی غذا کے مقابلہ میں روزہ کا مقصد روح کو معنوی غذا پہنچانا ہے۔ انسان بیک وقت دو چیزوں کا مجموعہ ہے ایک مادیت، دوسرے روح، جس کو موجودہ زمانہ کے علمائے نفسیات ذہن (Mind) سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی وجود کا مادی حصہ اس کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر وہ موجودہ دنیا میں اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ انتہائی ضروری ہے کہ اس کی روح، یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں ذہن، اپنی مجرد حیثیت کو زیادہ سے زیادہ باقی رکھ سکے اور اپنی غیر مادی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرے تاکہ غیر مادی حقائق تک اس کی بے آمیز رسائی ممکن ہو۔

آدمی جب اپنے آپ کو مادی دنیا سے اٹھاتا ہے اور روحانی دنیا سے مربوط ہوتا ہے تو حیرت انگیز طور پر وہ محسوس کرتا ہے کہ علم حقیقت کا ایک نیا دروازہ اس کے سامنے کھل گیا ہے۔ وہ سارے واقعات جو مادی غلاف میں لپٹا ہونے کی وجہ سے اس کو دکھائی نہیں دیتے تھے، اب اسے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اس بلند منزل پر پہنچ جاتا ہے جو انسان کی آخری معراج ہے:

ما زهد عبد فی الدنیا الا انبت الله الحکمة فی قلبه وانطق بها لسانه وبصره عیب الدنیا وداءها ودواءها واخرجه منها سالما الی دار السلام (مشکوٰۃ)	جب کوئی بندہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے دل میں حکمت پیدا کر دیتا ہے اس کی زبان حکمت بولنے لگتی ہے اور اس کو دنیا کا عیب اور اس کا علاج دکھا دیتا ہے اور اس کو سلامتی کے گھر میں داخل کر دیتا ہے۔

اسی راہ سلوک کا ایک مقام وہ ہے جب آدمی مادی غلاف سے اتنا زیادہ گزر جاتا ہے کہ عالم حقائق اس کو بالکل بے نقاب شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے:

تعبد اللہ کانک تراہ (بخاری) — خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔

نبوت اسی ترقی کا آخری درجہ ہے۔ عام انسان کو بھی، اپنی روح کو ترقی دینے کے بعد، یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ پیغمبر جوں کہ خود خدا کا ایک مصطفیٰ (چنا ہوا) شخص ہوتا ہے، اس پر عالم قدس تعینات کے تمام پردوں کو ہٹا کر اپنی قطعی شکل میں بے نقاب ہوتا ہے، حتیٰ کہ وہ خود پیغمبر کے شعور کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ پیغمبر یہ کہنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے کہ "میں جانتا ہوں کہ میں جانتا ہوں" جب کہ عام انسان اپنے عدم اصطفاء کی بنا پر، کبھی

اس مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ عالم قدس سے اس کا اتصال نہ قطعی ہوتا ہے، اور نہ پیغمبر کی طرح شعوری۔

روزہ کی یہی حکمت ہے جس کی بنا پر قرآن میں حکم روزہ کے درمیان یہ آیت آئی ہے:

واذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (بقرہ ۔ ۱۸۶)

اور جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں تو میں قریب ہوں، اور پکارنے والے کی پکار کو پہنچتا ہوں۔

پیغمبر مقام اصطفار پر ہونے کی وجہ سے براہ راست فرشتہ کے ذریعہ خدا سے مربوط ہوتا ہے۔ دوسرے انسانوں کے لئے قرآن، جبریل کا بدل ہے۔ پیغمبروں نے روزہ داری کر کے جب اپنی روح یا موجودہ نفسیاتی اصطلاح میں ذہن کو مادیات کی آلائش سے پاک کر کے مجرد کیا تو خدا کا فرشتہ ان کے اوپر اتر پڑا اور اس نے خدا کے کلام کو براہ راست انھیں سنایا۔ دوسرے انسان، جو بواسطہ قرآن خدا کو پاتے ہیں، ان کے لئے بھی قرآن کو پانے کے لئے ایک روزہ دارانہ زندگی ضروری ہے۔ قرآن اگرچہ وحی متلو کی شکل میں مابین الدفتین آج ہمارے پاس موجود ہے مگر کسی قلب خاص پر وہ اسی وقت "اترتا" ہے جب کہ روزے اور تبتل کی زندگی گزار کر اس نے اپنے کو روحانی اعتبار سے اس قابل بنا لیا ہو کہ وہ قرآن کا مہبط بن سکے۔

نزول قرآن کے مہینے میں روزہ فرض کرنا (بقرہ ۔ ۱۸۵) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزہ اس لئے ہے کہ وہ آدمی کو قرآن کا حامل بنائے۔ جس طرح پیغمبر کو حامل قرآن بننے کے لئے حرا کی تنہائیوں میں روزہ دار بننا پڑا تھا اسی طرح دوسرے مومنین قرآن کو بھی بننا پڑے گا، ورنہ وہ چوپایوں کی طرح قرآن کی جلدیں اپنے اوپر لادے رہیں گے (جمعہ ۔ ۱۵) قرآن ان کے قلب پر اترا ہوا نہیں ہوگا۔ قرآن کائنات کا قانون اور کتاب فطرت کی آواز ہے۔ اگر کوئی پوری طرح اس کی گہرائیوں میں غرق ہو تو وہ اپنے دل کے اوراق میں قرآن کو پڑھنے لگتا ہے اور کائنات کے ہر ذرہ پر اسے قرآن کی خاموش آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آتا ہے جب قرآن اور فطرت دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں:

بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم (عنکبوت ۔ ۴۹)

بلکہ یہ قرآن آیتیں ہیں روشن، ان کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔

نزول قرآن کے مہینے میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے:

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (بقرہ)

اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے تم پر مشکل نہیں چاہتا۔

انسان کی سب سے پہلی اور سب سے ضروری حاجت کھانا اور پانی ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ کھانا اور پانی بند کرنا عُسر (تنگی) کا باعث نہ ہو۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ حکم بہر حال مادی انسان کے لئے عسر کا باعث ہے۔ حتیٰ کہ خود یہ ارشاد الٰہی کہ "خدا آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ تم کو تنگی میں ڈالنا نہیں چاہتا"، بالواسطہ طور پر اس بات کا اظہار ہے کہ انسان کی مادی حاجت کے اعتبار سے روزہ بہر حال عسر کا باعث ہے۔ پھر کیوں اس کو یُسر کہا گیا۔

یُسر کے معنی عربی زبان میں آسانی کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کے لئے آدمی کو اس طرح تیار

کیا جائے کہ اس کا کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے، مثلاً جنگ کے لئے تیار ہو جانے کو کہتے ہیں تیسّر للقتال۔ قرآن کی مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ روزہ بظاہر تم کو تنگی کا ایک کام معلوم ہوگا۔ مگر خدا کو اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ وہ خواہ مخواہ تم کو تنگی میں ڈال دے۔ اصل یہ ہے کہ جس حکمت کے ساتھ تمھاری تخلیق کی گئی ہے، اس کے تحت ضروری تھا کہ تم کو مادی احتیاجات کے ساتھ پیدا کیا جائے۔ مگر کلام الٰہی کو حقیقی نفسیات کی سطح پر پانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کم از کم کچھ مقرر دنوں کے لئے تم اپنے آپ کو ممکن حد تک مادیات سے الگ کرو اور اپنی روحانی حیثیت کو ترقی دے کر اس قابل بناؤ کہ وہ تمام مادی حجابات سے باہر آکر کلام اللہ کو اخذ کرنے کے قابل ہو سکے۔ روزہ اور قرآن کے درمیان یہی نسبت ہے جس کی بنا پر نزول قرآن کے مہینہ کو روزہ دار زندگی کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

روزہ کے مہینہ میں نہ صرف یہ کہ "گرمیٔ افطار" روزہ کے مقاصد کے لئے قاتل ہے، بلکہ یہ چیز بھی اس کے حقیقی مقاصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتی کہ آدمی بس بھوکا پڑا رہے اور ہر روز ایک قرآن "ختم" کرنے کا کرتب دکھائے۔ اس قسم کا کوئی عمل ایک خالص اسلامی عبادت کو عیسائیوں کی رہبانیت کے مقام پر پہنچا دینے والا ہے۔ اسی طرح روزہ کے مہینے میں ضربیں لگانا، جس کو غلط طور پر ذکر بالجہر کہا جاتا ہے، اس روحانی تخلیہ کا نقیض ہے جو روزہ کا اصل مقصود ہے۔ روزہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی ضروری طعام اور بالکل ناگزیر قسم کی ذمہ داریوں کے علاوہ ہر چیز سے اپنے آپ کو فارغ کرلے۔ بولنا، ملنا جلنا، آمد و رفت، شور و غل اور ہر قسم کے دنیوی مشاغل سے کٹ کر ایک مدت تک اس طرح خاموش زندگی گزارے کہ اس کا وقت عبادت اور یاد الٰہی اور قرآن کو تدبر کے ساتھ پڑھنے میں صرف ہو۔ ترک طعام حقیقتہً ایک علامت ہے اس بات کی کہ محرمات تو درکنار، جن سے بہر حال مومن کو تاقیامت روزہ دار بن کر زندگی گزارنا ہے، مخصوص دنوں میں وہ محللات تک سے روزہ رکھ لے اور ہر چیز سے ممکن حد تک کٹ کر خدا کے قریب ہونے کی کوشش کرے۔

روزہ اپنی مخصوص اور متعین شکل میں اگرچہ سال میں ایک بار ہی مطلوب ہے۔ مگر وہ اصل روح جو روزہ کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے، وہ مومن کا دائمی مطلوب ہے۔ وہ ہے انقطاع الی اللہ، جسمانی اعتبار سے نہیں، بلکہ حسی اعتبار سے۔ اعلیٰ ایمانی حالت یہ ہے کہ بندہ، خواہ بظاہر وہ کسی بھی کام میں مشغول ہو، قلب اور روح کے اعتبار سے وہ مسلسل اپنے رب کی طرف متوجہ رہے، وہ دائمی طور پر اپنے آپ کو ایک قسم کے روحانی اعتکاف میں رکھے۔ اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے کھوہوں اور جنگلوں میں بسیرا لینے کو کمال ایمان سمجھا۔ حالاں کہ کمال ایمان یہ ہے کہ آدمی دنیا کے ہنگاموں میں اپنے فرائض ادا کر رہا ہو مگر اس کا ذہن یاد الٰہی میں معتکف رہے:

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: انتم اکثر صیاما واکثر صلوٰۃ واکثر اجتھادا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھم کانوا خیرا منکم، قالوا لم یا اباعبد الرحمٰن؟ قال: ھم کانوا ازھد فی الدنیا

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہا، تم اصحاب رسولؐ سے زیادہ روزہ رکھتے ہو، ان سے زیادہ نمازیں پڑھتے ہو، ان سے زیادہ مجاہدہ کرتے ہو، مگر وہ تم سے بہتر تھے۔ پوچھا گیا، کیوں اے ابوعبدالرحمٰن، جواب

دارغب فی الآخرۃ — دیا: وہ دنیا سے انتہائی بے رغبت تھے اور آخرت کے بہت زیادہ حریص تھے۔

حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۱۳۶

نماز

نماز کی اصل حقیقت ذکر (طہ ۔ ۱۴) ہے۔ ذکر کے معنی ہیں یاد ــــ کہتے ہیں ذَکَّرْتُہٗ فَتَذَکَّرَ (میں نے اسے یاد دلایا پس اسے یاد آگیا) اللہ تعالےٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندے اسے یاد رکھیں۔ خدا کی عظمت، اس کی حکمتیں، اس کی خالقیت و مالکیت بار بار انھیں یاد آتی رہے۔ اسی کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے نماز فرض کی گئی ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی تمام موجودات بلا وقفہ اپنے خالق کی تسبیح میں مشغول ہیں (انبیاء ۔ ۲۰) مقام خلافت پر آدم کا تقرر ہوا، اور فرشتوں کو حکم ملا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو انھوں نے کہا کہ ہم مسلسل تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں (بقرہ ـــ ۳۰) اس سے اندازہ ہوا کہ فرشتوں کے نزدیک خلافت کے استحقاق کے لئے یہ ضروری تھا کہ خلیفہ دائمی طور پر تسبیح خداوندی میں مشغول رہے۔ بخاری کی روایت کے مطابق معراج کے موقع پر آپ کو جن نمازوں کا حکم ہوا وہ تعداد میں پچاس تھیں۔ ظاہر ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے شب و روز میں پچاس نمازوں کی ادائگی کا مطلب یہ ہے کہ تقریباً سارا وقت اسی میں صرف ہو جائے۔ پھر اس میں تخفیف کر کے پانچ نمازوں کا حکم ہوا۔ گویا اصل مطلوب پچاس وقت کی نماز ہے، مگر اس کو کم کر کے پانچ کر دیا گیا ہے۔

نماز بندے کی طرف سے خدا کی خدائی کا اعتراف ہے۔ اس خدائی کے اتنے بے شمار پہلو ہیں اور اتنی ان گنت شکلوں میں انسان کے اوپر اس کا ظہور ہوا ہے کہ انسان دائمی طور پر حالت ذکر میں ہو کر بھی ان کا حق ادا نہیں کر سکتا (ماعبدناک حق عبادتک) کجا کہ وہ صرف جزوی طور پر اس میں مصروف ہو۔ حقیقت یہ کہ اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ یہی ہے کہ بندہ ہمہ وقتی طور پر خدا کے آگے نمازی بنا رہے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت خاص اور مختلف مصالح کے پیش نظر حکم کی یہ صورت کر دی کہ پانچ وقت متعین نماز ادا کرو اور بقیہ اوقات میں غیر متعین نماز میں مشغول رہو۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو مقررہ اوقات پر فرض کی گئی ہے (نساء ـــ ۱۰۳) مگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نماز کا مقصد ذکر ہے (اقم الصلوٰۃ لذکری، طہ ـ ۱۴) حتیٰ کہ ذکر کو نماز کا اعلیٰ مرتبہ بتایا گیا ہے (ولذکر اللہ اکبر، عنکبوت ـ ۴۵) اس حقیقت کو سامنے رکھ کر وہ آیتیں پڑھئے جن میں زندگی کے مختلف احوال میں خدا کو یاد کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے، تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نماز مخصوص ہیئت کے اعتبار سے اگرچہ پانچ وقت ہی فرض ہے مگر اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہر وقت مطلوب ہے، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ آدمی بظاہر خالص دنیوی کاروبار میں مشغول ہو:

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ (نور ـــ ۳۷) — ایسے لوگ جن کو خرید و فروخت خدا کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی

نماز کے اسی توسیعی مفہوم کے اعتبار سے قرآن میں ایک جگہ اہل جنت کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ دائمی طور پر نماز میں مشغول رہتے ہیں:

الا المصلین الذین ھم علیٰ صلاتھم دائمون (معارج-۲۳) مگر نماز پڑھنے والے جو اپنی نماز کے اوپر ہمیشہ رہنے والے ہیں

یہ دائمی نماز یا ذکر کسی رٹے ہوئے لفظ کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ حقیقی ذکر وہ ہے جو آدمی کی اپنی زبان میں ابلنے لگے نہ یہ کہ کچھ مقرر الفاظ کی تکرار ہو۔ آدمی جب اعلیٰ حقائق کا ادراک کرتا ہے تو اس کی پوری ہستی ایک مخصوص ربانی کیفیت میں ڈوب جاتی ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے اپنے رب کے لئے جو کلمات ٹپکتے ہیں انھیں کو ذکر کہا جاتا ہے — حدیث کے الفاظ میں اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آدمی جنت کے باغوں میں چر رہا ہے (من احب ان یرتع فی ریاض الجنۃ فلیکثر ذکر اللہ، اخرجہ الطبرانی عن معاذ بن جبل)

قرآن نے نماز کی دو تقسیمیں کی ہیں۔ ایک صلوٰۃ خشوع (مومنون—۲) دوسری صلاۃ سہو (ماعون—۵) پہلی قسم کی نماز کے لئے جنت کی خوش خبری ہے۔ جب کہ دوسری قسم کی نماز کے بارے میں ارشاد ہوا ہے "خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لئے"۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص آیا، اس نے نماز پڑھی اور اس کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا:

ارجع فصل فانک لم تصل جاؤ پھر سے نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی

دوسری طرف ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

اقرب مایکون العبد من ربہ وھو ساجد بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہوتا ہے۔
(رواہ مسلم عن ابی ہریرہ)

دو نمازوں کا یہ فرق ان کی ظاہری ہیئت یا خارجی مراسم کی ادائیگی کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ اس کیفیت کے اعتبار سے ہے جس کے تحت کوئی شخص نماز ادا کرتا ہے۔ صلاۃ سہو وہ نماز ہے جو بے شعوری کے ساتھ پڑھی جائے۔ آدمی کسی نہ کسی طرح ارکان نماز کو ادا کرلے مگر کیفیات نماز کا کوئی حصہ اسے نہ ملے۔ حضرت انس بتاتے ہیں کہ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا "یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا سورج کو دیکھتا رہتا ہے۔ جب سورج زرد ہوجاتا ہے اور شیطان کی دو سینگوں کے بیچ میں پہنچ جاتا ہے تو کھڑا ہوکر جس طرح مرغی چونچ مارے جلدی جلدی چار رکعت پڑھ لیتا ہے جس میں خدا کی یاد کم ہی ہوتی ہے" (نسائی)

صلاۃ خشوع وہ نماز ہے جس میں جھکاؤ ہو اور جو کیفیات سے بھری ہوئی ہو۔ عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اچھی طرح وضو کرے، پھر کھڑے ہوکر دو رکعت اس طرح ادا کرے کہ اس کا دل اور چہرہ دونوں نماز کی طرف متوجہ ہوں، اس پر جنت واجب ہوگئی" (مسلم) اسی طرح حضرت عثمان بن عفان کی ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

من توضأ وضوئی ثم یصلی رکعتین لا یحدث فیھا جو میری طرح وضو کرے اور پھر دو رکعت نماز اس طرح

بشئ غفر له ما تقدم من ذنبہ (متفق علیہ) پڑھے کہ اس میں اپنے دل کے اندر کوئی خیال نہ لائے تو اس کے سارے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

جب آدمی کسی خاص دل چسپی کے کام میں مشغول ہو تو وہ اس کی طرف اس طرح کھنچ اٹھتا ہے کہ اس کو گرد و پیش کا کچھ خیال نہیں رہتا۔ یہی چیز نماز میں مطلوب ہے۔ آغاز نماز کے وقت ہاتھ اٹھانا اس بات کی علامت ہے کہ اب نمازی اپنے ماحول کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں جا رہا ہے۔ وہ اپنے رب کی تسبیح اور اس سے دعاء مناجات میں پوری طرح گم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بندگی اور خدائی کی باہمی ملاقات کے تمام مراحل ختم ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی نماز پوری کرنے کے بعد دائیں بائیں رخ کر کے السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے گویا وہ اپنے آپ کو کسی اور دنیا سے نکال کر دوبارہ اپنے سابق ماحول میں واپس لا رہا ہے اور حاضرین کو سلام عرض کر رہا ہے۔

فقہ نے نماز کے مختلف اجزاء کئے ہیں اور ان کو فرض و واجب، مندوب و مستحب، سنت و نفل، مؤکدہ غیر مؤکدہ کے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ مگر حقیقت کی دنیا میں نماز کی ایسی کوئی تقسیم نہیں۔ اگر کوئی شخص ان تقسیمات کے مطابق خالص فقہی ناپ تول کی نماز ادا کرتا ہے تو وہ کمپیوٹر کی نماز پڑھ رہا ہے، انسان کی نماز نہیں۔ ایک کمپیوٹر قانونی نماز کی مکمل نقل کر سکتا ہے۔ مگر انسان کی نماز جذبات و کیفیات کے ایک ایسے مجموعہ کا نام ہے جس کو کسی بھی طرح قانونی خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ قانون کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

نماز کی ظاہری ہیئات کا اہتمام، جس کو قرآن میں محافظت صلوٰۃ (معارج ـ ۳۴) کہا گیا ہے، نماز کی ابتدائی شرط ہے۔ انھیں چیزوں کے جلو میں آدمی نماز کی دنیا میں داخل ہوتا ہے، اس کے آگے جو کچھ مطلوب ہے اس کو دو درجانہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک یہ کہ نماز میں جھکنا آدمی کی عملی زندگی میں خدا کے آگے اس کے جھکاؤ کی علامت بن جائے۔ اسی لئے کہا گیا ہے:

ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر (عنکبوت ـ ۴۵) نماز بدکاریوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

قرآن میں ایک نبی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے جب اپنی قوم کو خدا کی عبادت کی طرف بلایا تو انھیں نظر آیا کہ خدا کی عبادت کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی عملی زندگی اور اپنے معاشی معاملات میں خدا کے احکام کی پابندی کی جائے:

یاشعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک مایعبد آباؤنا او ان نفعل فی اموالنا مانشاء (هود ـ ۸۷) بولے اے شعیب، کیا تمھاری نماز تم سے کہتی ہے کہ ہم ان چیزوں کی عبادت کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا چھوڑ دیں۔

نماز میں بار بار جھکنا گویا خدا سے یہ کہنا ہے کہ میرے آقا مجھے حکم دے، میں تیرے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ جس نماز کے ساتھ اتباع شہوات پایا جائے وہ ایسی نماز ہے جس سے روح صلوٰۃ ضائع ہو چکی

ہے۔ (الحجر۔۹۹)

نماز کا دوسرا اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ خدا کی یاد اس کی نفسیات کا جزو بن کر اس کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ اس پر حضوری کی کیفیت طاری ہونے لگے:

واسجد واقترب (علق) سجدہ کر اور قریب ہو جا۔

قرآن میں "مقام یقین" سے بعض لوگوں نے نماز کا یہی اعلیٰ مقام مراد لیا ہے:

واعبد ربك حتى يأتيك اليقين حجر ــــ آخر اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ آئے تم کو یقین۔

"حتیٰ" کا مطلب یہ نہیں کہ مقام یقین پر پہنچنے کے بعد نماز ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد تو اعلیٰ ترین نماز شروع ہوتی ہے۔ پھر وہ ختم کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ دراصل کیفیتِ نماز کی انتہا کا بیان ہے نہ کہ صورتِ نماز کی انتہا کا۔

یہ اقتراب یا مقام یقین کیا ہے، اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب آدمی اس عالم میں پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا وہ ایک ان دیکھی حقیقت کو کامل یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے، ایک بعید ترین چیز سے انتہائی طور پر قریب ہے۔ کسی مخاطب کی موجودگی کے بغیر کامیاب ترین گفتگو میں مصروف ہے۔ ایک سب سے زیادہ پرہیبت چیز کے لئے اپنے اندر سب سے زیادہ محبت کے جذبات پا رہا ہے۔ ایک چیز جس کو کسی بھی واسطہ کے ذریعے محسوس نہیں کیا جا سکتا، کسی واسطہ کے بغیر وہ اس تک پہنچ گیا ہے۔

سجدہ جو نماز کی انتہائی حالت ہے وہی خدا سے قریب ہونے کی بھی انتہائی حالت ہے۔ "وحدت وجود" کا تصور غالباً اپنی ابتدائی شکل میں محض اس کیفیت کو بتانے کے لئے تھا جو یادِ الٰہی میں غرق ہونے کے وقت آدمی کے اوپر طاری ہوتی ہے مگر بعد کو منطقی تعین کی کوشش نے اس کو ہمہ اوست کے ناقابل فہم فلسفے تک پہنچا دیا۔ اگر اس بد نام عقیدے کے متعلق میری تشریح کو صحیح مانا جائے اور اس کو محض حسیاتی ارتباط کے مفہوم میں لیا جائے تو میں کہوں گا کہ سجدۂ قربت کے وقت آدمی کے اوپر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کے اظہار کے لئے شاید انسانی زبان میں یہ قریب ترین تعبیر ہے۔ جب سپردگی کا لمحہ آتا ہے، جب عجز اور محدودیت کا پیکر اپنے آپ کو لامحدود کمال کے حوالے کر دیتا ہے، جب پیشانی اس طرح کھنچ اٹھتی ہے گویا وہ زمین سے چپک گئی ہے، اس وقت فی الواقع ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قطرے نے اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دیا ہے، گویا انسان خدا سے جا ملا ہے۔

حقیقی نماز جو دائمی ذکر کی شکل میں مطلوب ہے، اس سے کیا مراد ہے، اس کی کوئی فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ یہ ایک دو طرفہ عمل ہے جس کا ایک سرا بندے کی طرف ہوتا ہے اور دوسرا خدا کی طرف۔ بندہ جب اپنے رب کو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یاد کرتا ہے (آل عمران ــــ ۱۹۱) تو خدا کی توجہ اسے حاصل ہوتی ہے اور ذکر کی کیفیات اور ذکر کے کلمات اس کو مخصوص طور پر خدا کی طرف سے القا کئے جاتے ہیں۔ وہ نفسیاتی سطح پر ہر آن ایک نیا رزق خدا کی طرف سے پاتا رہتا ہے (آل عمران ۔ ۳۷) ظاہر ہے کہ اس قسم کے واردات کی کوئی فہرست بندی ممکن نہیں۔ تاہم قرآن میں اس کی بعض علامتیں بتائی گئی ہیں۔

۱۔ اس کے تصور میں خدا اس طرح سما جائے کہ ہر واقعہ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جائے:

الذین یذکرون اللہ قیاماً وّ قعوداً وّ علیٰ جنوبہم	وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے
ویتفکرون فی خلق السماوات والارض ربنا ما	اور آسمان و زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں، کہہ اٹھتے ہیں،
خلقت ھذا باطلا (آل عمران ـــ ۱۹۱)	خدایا تو نے اس کو عبث نہیں بنایا۔

۲۔ خدا کی عظمت اس کے اوپر اتنی چھا جائے کہ اس کے خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں:

تقشعرّ منہ جلود الذین یخشون ربہم	رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس سے کھال پر ان لوگوں
(زمر ـــ ۲۳)	کے کہ ڈرتے ہیں اپنے رب سے۔

۳۔ خدا کا تذکرہ ہو تو اس کا دل دہل اٹھے:

الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبہم (انفال ۔ ۲)	وہ لوگ کہ جب ذکر آتا ہے اللہ کا تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں۔

۴۔ خدا کا کلام اس کو رلا دے:

تریٰ اعینہم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق	تو دیکھے کہ ان کی آنکھیں ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس سبب
(مائدہ ـــ ۸۳)	سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔

۵۔ نماز اس کے لئے ایسی چیز بن جائے جس سے وہ ضرورت کے وقت مدد طلب کرے:

یاایہا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ	اے ایمان لانے والو صبر اور نماز سے مدد لو۔
(بقرہ ـــ ۴۵)	

حضرت حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشانی پیش آتی تو آپ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے (اذا حزبہ امر فصلّی) یہی صلحائے امت کا ہمیشہ معمول رہا ہے۔ ابن تیمیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ کسی ویران مسجد میں چلے جاتے۔ نماز پڑھتے اور سجدہ میں سر رکھ کر کہتے: یا معلم ابراھیم علّمنی (اے ابراہیم کو سکھانے والے مجھے بتا دے) ابونعیم نے حضرت ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا:

مادمت فی صلوٰۃ فانت تقرع باب الملک ومن	جب تک تم نماز میں ہو، تم بادشاہ کا دروازہ کھٹکھٹا
یقرع باب الملک یفتح لہ	رہے ہو اور جو بادشاہ کا دروازہ کھٹکھٹائے اس کے
	لئے وہ کھول دیا جاتا ہے۔

نماز مومن کے لئے، زندگی کے صحرا میں ایک نخلستان ہے۔ یہ نماز جب آدمی کو حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس کی محبوب ترین چیز بن جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ، نسائی (میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) اپنے مؤذن بلال رضؓ سے آپ نے اذان کے لئے فرمایا تو آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

یابلال اقم الصلوٰۃ ارحنا (ابوداؤد، کتاب الادب)	اے بلال رضؓ نماز کی تیاری کرو اور ہم کو راحت دو۔

یہ نماز اس طرح حاصل نہیں ہو سکتی کہ آدمی روزانہ نماز میں ایک قرآن اور دو قرآن ختم کرنے لگے۔ اس قسم

کا عمل ایک کرتب ہو سکتا ہے۔ مگر وہ نماز نہیں ہے۔ نماز کی تلاوت تفکر و تدبر کے ساتھ ہوتی ہے۔ شرعی اعمال کا دارومدار کیفیت پر ہے، کمیت پر نہیں۔ قرآن کی قرأت جس شخص کے لیے محض رٹے ہوئے الفاظ کا دہرانا نہ ہو، بلکہ وہ اس کے قلب سے یاد الٰہی کا ابال بن کر نکلے، اس کے لئے ایک دن میں ایک قرآن یا کئی قرآن کا ختم کرنا ممکن نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایک سورہ میں ساری رات گزار دیتے تھے۔ امام احمد نے حضرت عائشہ رضؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے تذکرہ کیا گیا کہ کچھ لوگ ہیں جو ایک رات میں سارا قرآن ایک بار یا دو بار پڑھ لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ سن کر کہا:

اولئك قرؤا ولم يقرؤا — انھوں نے پڑھا مگر نہیں پڑھا۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پوری رات قیام کرتی تھی۔ آپ بس سورہ بقرہ اور آل عمران اور نساء پڑھتے، جب بھی آپ کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں ڈراوا ہوتا تو آپ دعا کرتے اور پناہ مانگتے، جب بھی کسی آیت سے گزرتے جس میں بشارت ہوتی تو آپ اس کے لئے دعا کرتے اور اس میں رغبت ظاہر فرماتے۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ یا انفاق کی اصل ایثار ہے (حشر۔ ۹) اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ ہر شخص اپنے اوپر دوسرے کا حق سمجھے۔ ایسا معاشرہ بنے جس میں لوگ "لینے" کے بجائے "دینے" کے لئے تیار رہتے ہوں۔ دوسرے کا استحصال کرنے کے بجائے دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے مواقع تلاش کریں۔ ہر ایک کے اندر یہ مزاج پرورش پائے کہ دنیا میں اس کا کوئی حق نہیں۔ یہاں اس کی صرف ذمہ داریاں ہیں۔ اسی اجتماعی روح کو پیدا کرنے کے لئے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے، دینی نظام میں اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ بشیر بن خصاصیہ بیعت ہونے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے پوچھا، اے خدا کے رسول! آپ مجھ سے کن چیزوں پر بیعت لیں گے۔ آپ نے بتایا تو انھوں نے کہا کہ صدقہ اور جہاد، دو چیزیں میرے لئے مشکل ہیں، ان سے مجھے مستثنیٰ کر دیجئے۔ آپ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا:

یا بشیر! لاصدقة ولاجهاد فبم اذن تدخل الجنة (احمد) — اے بشیر! صدقہ نہ جہاد، تو جنت میں کیسے جاؤ گے۔؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو فتنہ ارتداد اٹھا، اس کا پس منظر بھی یہی تھا۔ قدیم عرب میں لوگوں کے اقتصادی ذرائع بہت محدود ہوتے تھے، اس لئے بہت سے قبائل یہ چاہتے تھے کہ ان کے اسلامی فرائض کی فہرست سے زکوٰۃ کو مستثنیٰ کر دیا جائے۔ پیغمبر کی وفات کے بعد ان نو مسلم قبائل نے سوچا کہ اب ہمیں حکومت اسلامی کی مالی اطاعت کی ضرورت نہیں:

قالوا: قد مات هذا الرجل الذى كانت العرب تنصر به — کنز العمال، ج ۳، ص ۱۴۲

انھوں نے کہا، وہ شخص اس دنیا سے چلا گیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو خدائی مدد حاصل ہوتی تھی۔

اگرچہ ان قبائل نے صرف زکوٰۃ کی ادائگی سے انکار کیا تھا، وہ بدستور اپنے کو مسلمان کہتے تھے۔ حتیٰ کہ نماز روزہ کے بھی پابند تھے۔ مگر خلیفہ اول نے فرمایا:

واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال (بخاری، مسلم، احمد)

خدا کی قسم میں اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے کیونکہ زکوٰۃ مال میں خدا کا حق ہے۔

زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اللہ کی میراث ہے (حدید ۔ ۷) سارا رزق، رزق اللہ ہے (ملک ۔ ۱۵) سارا مال، اللہ تعالیٰ کا مال ہے (نور ۔ ۳۳) جو کچھ کسی کو ملا ہوا ہے وہ عطار رب ہے (اسراء ۔ ۲۰) ایسی حالت میں اگر خدا ساری مال و متاع کو اپنا حصہ قرار دیتا تو اسے ایسا کرنے کا حق تھا۔ مگر اس نے صرف ایک جزء کو اپنا حصہ قرار دے کر بقیہ کو ہمارے حوالے کر دیا ہے:

وآتوا حقہ یوم حصادہ (انعام ۔ ۱۴۱)

اور خدا کا حق دو کاٹنے کے دن ۔

قانونی طور پر زکوٰۃ، ہجرت کے پانچویں سال فرض ہوئی ہے۔ مگر غیر معین شکل میں وہ اول روز سے مطلوب تھی۔ چنانچہ مکی سورتوں میں زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے۔ سورہ مومنون میں ارشاد ہوا ہے، والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون۔ اسی طرح سورہ حم سجدہ میں مشرکین کے بارے میں ہے، الذین لایؤتون الزکوٰۃ۔ بعثت نبوی کے پانچویں سال جب مکہ کے مسلمانوں کی ایک جماعت حبش کو ہجرت کر گئی تو وہاں کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں جعفر بن ابی طالب نے پیغمبر اسلام کا تعارف کراتے ہوئے جو کچھ کہا تھا، اس میں یہ جملہ بھی تھا:

وامرنا أن نعبد اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ

انھوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کی عبادت کریں نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں

ابتداءً یہ ایک عمومی حکم تھا۔ اس کے بعد مدت، مقدار اور مدوں کا تعین کر دیا گیا اور ٹیکس کی طرح اس کو ریاست کے لئے قابل وصولی قرار دے دیا گیا۔ اب قانونی اعتبار سے تو زکوٰۃ کا لازمی مفہوم ایک ہی ہے۔ مگر زکوٰۃ چونکہ عام معنوں میں صرف "ٹیکس" نہیں بلکہ وہ ایک عبادت بھی ہے، اس لئے اس کا ایک توسیعی مفہوم بھی ہے اور اس اعتبار سے اس کی کوئی حد نہیں۔ یہ آدمی کے اپنے حوصلہ پر ہے کہ خدا کو خوش کرنے کے لئے اپنے مال کی کتنی مزید مقدار وہ خرچ کرتا ہے۔ فاطمہ بنت قیس بتاتی ہیں کہ اس سلسلہ میں آنحضرت سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ (ترمذی)

یقیناً آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے ۔

قرآن میں ہے کہ ذاتی ضروریات سے جو فاضل ہو، اسے خرچ کرو:

یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (بقرہ ۔ ۲۱۹)

پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دو جو حاجت سے زیادہ ہو

زکوٰۃ یا انفاق کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صدقہ، دوسرے وہ جس کو قرض حسن کہا گیا ہے:

ان المصدقین والمصدقات واقرضوا اللہ قرضاً حسناً یضاعف لھم ولھم اجر کریم (حدید ۔ ۱۸)

بلاشبہ صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور وہ لوگ جو اللہ کو قرض حسن دیں تو ان کا دیا ہوا ان کے لئے بڑھایا جائے گا اور ان کے لئے پسندیدہ اجر ہے۔

---

[1] پہلی قسم کے لوگوں کے لئے مصدقین اور مصدقات کے الفاظ ہیں۔ مگر دوسری قسم کے لوگوں کا ذکر کرنا ہوا تو اسلوب بدل کر اقرضوا اللہ قرضاً حسناً فرمایا۔ یہ قرآن کا خاص انداز ہے۔ جب کسی چیز کی اہمیت بتانا ہو تو اسلوب کلام بدل دیا جاتا ہے۔

صدقہ سے مراد اطعام مسکین (مدثر۔ ۴۴) ہے یعنی ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے خرچ کرنا۔ اس کے برعکس قرض حسن سے مراد وہ انفاق ہے جو سبیل اللہ (تقویت دین) کے لئے دیا جاتا ہے۔ دین کو پھیلانا اور اس کو سربلند کرنا اللہ تعالیٰ کو انتہائی طور پر مطلوب ہے اس مقصد کی خاطر جان و مال کو خرچ کرنے کا بہت ثواب بتایا گیا ہے۔ چوں کہ اس انفاق کا اصل مقصد کسی انسان کی مادی ضرورت پوری کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ خدا کے دین کے لئے دیا جاتا ہے، اس لئے خدا نے اس کو اپنے ذمہ "قرض" قرار دیا ہے۔

"صدقہ" کی مقدار بہ شکل زکوٰۃ متعین کر دی گئی ہے۔ مگر قرض حسن کی کوئی مقدار نہیں۔ یہ خادمان دین یا دعاۃ اور شہداء کی فہرست میں اپنا نام لکھوانا ہے۔ اور جو اہل ایمان کی اس اگلی صف میں شامل ہونا چاہے، اس کو اپنا سب کچھ خدا کے حوالے کرنا پڑتا ہے:

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (توبہ۔ ۱۱۱)	اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے، اس معاوضہ میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔

غزوۂ تبوک (۶۳۰) میں حضرت ابوبکر صدیق نے اپنا تمام مال پیش کر دیا تھا، حضرت عمرؓ نے نصف مال دیا۔ حضرت عثمان غنی نے ایک ہزار اونٹ، ستر گھوڑے اور دس ہزار دینار دیئے جس سے لشکر کا تہائی خرچ پورا کیا گیا۔

انفاق کی یہی وہ قسم ہے جس کو قرآن میں فی سبیل اللہ خرچ کرنا کہا گیا ہے (حدید۔ ۱۰) ارشاد ہوا ہے کہ اس مد میں خرچ نہ کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے (بقرہ۔ ۱۹۵) کیوں کہ اہل اسلام اگر کلمہ اسلام کی سربلندی کے لئے خرچ نہ کریں تو بالآخر خود ان کی اجتماعی زندگی ختم ہو جائے گی۔ بحیثیت ایک ملت کے ان کا وجود دنیا میں قائم نہ ہو سکے گا۔ اس انفاق کے لئے سات سو گنا ثواب (بقرہ۔ ۲۶۱) کی خوش خبری دی گئی ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ طبرانی کے مطابق حضرت معاذ بن جبل نے جہاد فی سبیل اللہ میں یاد الٰہی اور نفقہ کے عظیم ثواب سے متعلق حدیث بیان کی۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قال عبد الرحمٰن فقلت لمعاذ انما النفقۃ بسبع مائۃ ضعف، فقال معاذ قل فھمك انما ذلك اذا انفقوھا وھم مقیمون بین اھلیھم غیر غزاۃ فاذا غزوا وانفقوا خبأ اللہ لھم من خزانتہ رحمۃ ما ینقطع عنہ علم العباد وصفتھم	عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے معاذ بن جبل سے کہا: جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنے کا ثواب سات سو گنا ہے۔ حضرت معاذ نے کہا، تیری سمجھ کم ہے۔ یہ ثواب تو اس وقت ہے جب کہ وہ صرف خرچ کریں اور خود اپنے بچوں میں مقیم رہیں، جہاد میں شریک نہ ہوں اور جب جہاد میں شریک ہوں اور خرچ بھی دیں تو ایسے لوگوں کے لئے اللہ نے اپنے خزانہ کی ایسی رحمت چھپا رکھی ہے جہاں تک بندے کا علم نہیں پہنچ سکتا اور نہ کوئی اس کے اوصاف کو جان سکتا۔

زکوٰۃ اپنی شکل کے اعتبار سے ایک ٹیکس ہے۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک عبادت ہے۔ اس لئے

ریاست خواہ اس کی وصولیابی کے لئے وہی جبری طریقے اختیار کرے جو ٹیکس جیسے قانونی مالیہ کے لئے مخصوص ہوتے ہیں، مگر دینے والا اسی وقت زکوٰۃ کے اصل فائدوں کو پاسکے گا جب کہ وہ ان کیفیات کے ساتھ اسے ادا کرے جو ایک عبادتی فعل کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

۱۔ جب وہ صدقہ کے ذریعہ خدا سے اچھے اجر کا متوقع ہے تو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اس راہ میں اچھا مال نکال کر دے:

یاایھاالذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون ولستم بآخذیہ الا ان تغمضوا فیہ بقرہ ـــ ۲۶۷	اے ایمان والو، اپنی کمائی میں سے عمدہ چیز کو خرچ کرو اور اس میں سے جو ہم نے تمھارے لئے زمین سے نکالا ہے اور ردی چیز کا قصد نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں، الا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔

حضرت عائشہ رض نے ایک بار باسی گوشت صدقہ کرنا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کو تم خود نہیں کھاسکتیں، اس میں سے صدقہ کررہی ہو" (مسند احمد)

۲۔ جو کچھ دیا جائے لرزاں وترساں قلب کے ساتھ دیا جائے:

والذین یوتون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ (مومنون ـ ۶۰)	جو لوگ کہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کانپ رہے ہوتے ہیں۔
ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکینا ویتیما واسیرا انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریرا (دہر ـــ ۸)	باوجود احتیاج کے وہ کھانا کھلاتے ہیں محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو۔ ہم جو تم کو کھلاتے ہیں صرف خدا کی رضامندی کے لئے، ہم تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں نہ شکر گزاری، ہم ڈرتے ہیں اپنے رب کی طرف سے ایک سخت دن سے

۳۔ جس کو دیا جائے اس پر احسان نہ رکھا جائے اور نہ کوئی ایسی بات کہی جائے جس سے اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچے:

الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی (بقرہ ـــ ۲۶۲)	جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں نہ آزار پہنچاتے ہیں۔

۴۔ دینے والا اس طرح دے کہ وہ خدا کے لئے دینے کو نہ اپنے حق میں اقتصادی نقصان سمجھے اور نہ کوئی گرانی محسوس کرے:

الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ و تثبیتا من انفسھم (بقرہ ـــ ۲۶۴)	جو اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی خوشی چاہنے کے لئے اور اپنا دل مضبوط کرنے کے لئے۔

۵۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صدقات کو چھپا کر دینا زیادہ بہتر ہے (بقرہ ـــ ۲۷۱) چنانچہ صحابہ اپنے صدقات کو مخفی رکھنے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن سابط جمحی کے متعلق آیا ہے کہ جب انھیں وظیفہ ملتا تو اپنے گھر

والوں کے لئے ضروری خوراک خریدتے اور بقیہ رقم کو صدقہ کر دیتے۔ بیوی پوچھتی کہ تمھارا بقیہ وظیفہ کیا ہوا تو وہ جواب دیتے قد اقرضتہ (میں نے اسے قرض دے دیا ہے) اس قسم کے طرز عمل سے گھر کے اندر جو نزاکتیں پیدا ہوتی تھیں، ان سے صحابہ کس طرح نمٹتے تھے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوگا۔

عن حسان بن عطیۃ قال: لما عزل عمر بن الخطاب معاویۃ عن الشام بعث سعید بن عامر بن جذیم الجمحی قال: فخرج معہ بجاریۃ من قریش نضیرۃ الوجہ، فما لبث الا یسیرا حتی اصابتہ حاجۃ شدیدۃ، قال: فبلغ ذلک عمر رضی اللہ عنہ فبعث الیہ بالف دینار۔ قال: فدخل بھا علی امراتہ فقال: ان عمر بعث الینا بما ترین، فقالت لو انک اشتریت لنا اداما و طعاما وادخرت سائرھا، فقال لھا اولا ادلک علی افضل من ذلک ندفعھا الی من یاتینا بھا احوج ما نکون الیھا

ابو نعیم، حلیۃ الاولیاء جلد ۱ صفحہ ۲۴۴

حضرت عمر نے جب حضرت معاویہ کو شام سے معزول کیا تو ان کی جگہ حضرت سعید بن عامر کو روانہ کیا۔ وہ اپنی بیوی کو جو قریش کی ایک لڑکی تھی اور تر و تازہ چہرے والی تھی، لے کر چلے، جلد ہی انھیں شدید ضرورت پیش آئی حضرت عمر کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے ایک ہزار دینار ان کے پاس بھیجے۔ وہ ان کو لے کر گھر میں گئے اور بیوی سے کہا کہ عمر نے، یہ جو تم دیکھ رہی ہو، ہمارے لئے بھیجے ہیں۔ بیوی نے کہا بہتر ہے کہ آپ اس سے خوراک اور ضرورت کا سامان خرید کر جمع کرلیں۔ انھوں نے کہا، کیا میں اس سے زیادہ بہتر بات تمھیں نہ بتاؤں۔ ہم ان دیناروں کو ایسے شخص کے پاس رکھ دیں جو ان کو اس وقت ہمارے پاس لائے جب کہ ہمیں ان کی زیادہ ضرورت ہو۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد انھوں نے خاموشی سے تمام مال صدقہ کر دیا۔ بیوی کو معلوم ہوا تو اس نے رونا شروع کیا اور گھر کے اندر وہ نازک مسائل پیدا ہو گئے جو ایسے موقع پر پیدا ہوا کرتے ہیں۔ انھوں نے بیوی کو سمجھایا اور آخر میں کہا:

فلانت احری فی نفسی ان ادعک لھن من ان ادعھن لک

تو میرے نزدیک زیادہ مستحق ہے کہ میں جنتی حوروں کے لئے تجھے چھوڑ دوں بہ نسبت اس کے کہ میں جنتی حوروں کو تیری خاطر چھوڑ دوں۔

بالآخر عورت راضی ہوگئی (فسمحت ورضیت)

اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اللہ کی رضا حاصل کرنے کا شوق صحابہ میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک بار آپ نے اعلان فرمایا: تصدقوا فانی ارید ان ابعث بعثا (صدقہ دو، میں ایک لشکر بھیجنا چاہتا ہوں) ابوعقیل انصاری کے پاس اس وقت کچھ نہیں تھا، انھوں نے ایک شخص کے باغ میں رات بھر پیٹھ پر پانی لاد کر سینچائی کی۔ صبح کو اس کے معاوضہ میں دو صاع (پانچ سیر) کھجوریں ملیں۔ انھوں نے ایک صاع کھجور اپنے گھر والوں کے لئے چھوڑی اور ایک صاع کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت سعد بن عبادہ نے یہ نظام بنا رکھا تھا کہ ایک سال وہ جہاد میں جاتے اور ان کے صاحبزادے قیس گھر کی دیکھ بھال کرتے اور ایک سال ان کے لڑکے (قیس) جہاد میں جاتے اور وہ خود گھر پر

رہ کر معاشیات کا انتظام کرتے۔ انھوں نے اپنی اولاد کو کس طرح تیار کیا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بہت سے مہمان آکر ٹھہرے۔ اس وقت سعد بن عبادہ کسی لشکر میں تھے انھیں خبر ہوئی تو انھوں نے کہا :

ان یک قیس ابنی فسیقول یانسطاس ھات المفاتیح اخرج لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاجتہ، فیقول نسطاس: ھات من ابیک کتابا، فیدق انفہ ویاخذ المفاتیح ویخرج لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاجتہ (الاصابہ)

اگر قیس میرا بیٹا ہے تو وہ میرے خادم نسطاس سے کہے گا، چابیاں لا، میں رسول اللہ کے لئے آپ کی ضرورت کا سامان نکال دوں۔ نسطاس کہے گا اپنے باپ کے پاس سے پرچہ لے آؤ۔ تو میرا بیٹا اس کی ناک توڑ دے گا اور اس سے چابیاں لے کر رسول اللہ کی ضرورت کا سامان نکال دے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور قیس نے مہمانوں کی ضروریات کے لئے آپ کی خدمت میں ایک سو وسق کھجوریں پیش کیں۔

صدقہ کی اہمیت کو حضرت ابوذر غفاری نے بڑے حکیمانہ انداز سے بیان کیا ہے :

فی المال ثلاثۃ شرکاء: القدر لا یستامرک ان یذھب بخیرھا وشرھا من ھلاک اوموت والوارث ینتظر ان تضع رأسک ثم یستاقھا وانت ذمیم، فان استطعت ان لا تکون اعجز الثلاثۃ فلا تکونن، فان اللہ عزو جل یقول: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون

حلیۃ الاولیاء، جلد ا صفحہ ۱۶۳

مال میں تین شریک ہوتے ہیں۔ ایک تقدیر جو مال کے لے جانے میں تم سے مشورہ نہ کرے گی، وہ اچھا ہو یا برا، ہلاک کر کے یا تم کو موت دے کر۔ دوسرے وارث جو اس انتظار میں ہے کہ تو قبر میں اپنا سر رکھے اور وہ مال کو لیلے اور تو اس کی نظروں میں برا ہو۔ تیسرا تو خود ہے۔ اگر تجھ سے ہوسکے کہ تو تینوں شرکا میں سب سے زیادہ عاجز نہ ٹھہرے تو ایسا ضرور کر، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اس میں سے خرچ نہ کرو جو تمھیں محبوب ہے۔

حضرت انس کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رض مدینہ میں اپنے مکان میں تھیں کہ انھیں شور سنائی دیا۔ پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا تجارتی قافلہ ہے جو شام سے آرہا ہے۔ اس میں سات سو اونٹ سامانوں سے لدے ہوئے تھے۔ حضرت عائشہ نے کہا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "میں نے عبدالرحمٰن بن عوف کو دیکھا کہ وہ جنت میں گھسٹتے ہوئے داخل ہو رہے ہیں۔" یہ بات عبدالرحمٰن بن عوف کو پہنچی تو انھوں نے کہا: اگر مجھ سے ہوسکا تو میں جنت میں کھڑے ہو کر داخل ہوں گا" اس کے بعد انھوں نے ان تمام اونٹوں کو مع ان کے پالان اور لدے ہوئے سامان کے اللہ کے راستے میں دے دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سابط جمحی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: قیامت میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو حساب کے لئے جمع کرے گا تو

فقراء مومنین پھدکتے ہوئے آئیں گے جیسے کبوتر پھدکتا ہے۔ ان سے کہا جائے گا، حساب کے لئے ٹھہرو۔ وہ کہیں گے ہمارے پاس کوئی حساب نہیں، نہ تم نے ہمیں کچھ دیا تھا۔ ان کا پروردگار فرمائے گا: میرے بندوں نے سچ کہا۔ ان کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور وہ تمام لوگوں سے ستر سال قبل جنت میں داخل ہونگے۔

زکوٰۃ کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں اس کا تقابل سود سے کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ خدا زکوٰۃ کو بڑھاتا ہے اور جس معاشی نظام کی بنیاد سود پر قائم ہو اس کا مٹھ مار دیتا ہے۔

یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات بقرہ۔ ۲۷۶	خدا سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ وما آتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون (روم۔ ۳۹)	اور جو دیتے ہو تم سود کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں، وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں۔ اور جو دیتے ہو مال اللہ کی رضا چاہ کر، تو وہی ہیں جن کے مال بڑھائے گئے۔

ایک جگہ کہا گیا ہے کہ سود سے قیام حاصل نہ ہوگا:

الذین یاکلون الربوا لایقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس (بقرہ۔ ۲۷۵)	جو لوگ سود کھاتے ہیں، نہیں کھڑے ہوں گے مگر جیسا کہ کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو شیطان باولا بنا دے لپٹ کر

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ "جب کوئی قوم زکوٰۃ چھوڑ دیتی ہے تو اللہ تعالےٰ اس کو خشک سالی اور قحط میں مبتلا کر دیتا ہے" (اوسط طبرانی) خدا نے معیشت کا جو فطری نظام بنایا ہے، سود اس نظام کو توڑنے کے ہم معنی ہے۔ اس لئے اس کے خلاف جنگ کرنے تک کا حکم دیا گیا ہے۔ (بقرہ ۷۹۔ ۲۷۸)

زکوٰۃ اور سود میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے گردش دولت پیدا ہوتی ہے اور سود سے ارتکاز دولت۔ زکوٰۃ کی بنیاد پر بننے والے نظام میں بیک وقت دو معاشی قدریں موجود ہوتی ہیں۔ ایک، زر سے زر پیدا کرنے کے بجائے محنت سے زر پیدا کرنے کا رجحان۔ دوسرے، دولت کو سمٹاؤ سے روکنے کا عمل۔ کیوں کہ زکوٰۃ راس المال پر لگائی جاتی ہے (نہ کہ موجودہ انکم ٹیکس کی طرح صرف نفع پر) اس طرح سرمایہ کے دائمی طور پر ایک جگہ مجتمع ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ اس کے برعکس سود میں یہ دونوں معاشی قدریں الٹ جاتی ہیں۔ ایک طرف اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زر سے زر حاصل کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس ایک بار دولت آجائے وہ اس دولت کو لازمی طور پر بڑھاتا رہے بغیر اس کے کہ وہ معاشیات عامہ میں کسی قسم کا اضافہ کر رہا ہو۔ یہ چیز ایک ایسے اقتصادی استحصال کو وجود میں لاتی ہے جو کسی حد پر نہیں رکتی۔ مزید یہ کہ سود کے نظام میں کوئی ایسی تدبیر نہیں جو دولت کو دائمی طور پر ایک جگہ سمٹنے سے روک سکے۔

حج

حج کی حقیقت قربانی ہے۔ حج کے لئے آدمی سفر کرتا ہے جو وقت کی قربانی ہے۔ اس کے اخراجات برداشت

کرتا ہے جو مال کی قربانی ہے۔ جانور ذبح کرتا ہے جو جان کی قربانی ہے۔ سعی و طواف کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی توجہات کو ہر طرف سے سمیٹ کر صرف ایک اللہ کے لئے وقف کر دے گا۔

وہ کون سا خدائی مشن ہے جس میں مومن کو یہ تمام قربانیاں دینی ہیں وہ ہے دنیا میں اللہ کے نام کا چرچا کرنا: فاذا قضیتم مناسککم فاذکروا اللہ کذکرکم آبائکم او اشد ذکرا (بقرہ ـ ۲۰۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما جعل رمی الجمار والسعی بین الصفا والمروۃ لاقامۃ ذکر اللہ (مشکوٰۃ کتاب المناسک)	رمی جمار اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کو اللہ کا ذکر قائم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

حج کا یہ پیغام ہم کو داعی اعظم سیدنا ابراہیم علیہ السلام (۱۹۸۵ ـ ۲۱۶۰ ق م) کی زندگی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی خدائی مشن کے لئے وقف کر دی تھی جس کی آخری حد یہ ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے کو بھی اس راہ میں قربان کر دیا۔ حج کا ہر عمل ہم کو اسی داعی اعظم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے:

تفوا علیٰ مشاعرکم فانکم علیٰ إرث من ارث ابیکم ابراهیم مشکوٰۃ کتاب المناسک	اپنے مشاعر (مقامات حج) پر ٹھہرو۔ کیونکہ تم اپنے باپ ابراہیم کی ایک وراثت کے وارث ہو۔

حضرت ابراہیم، جن کی زندگی سراپا دعوت تھی، کی دعوتی زندگی کے بعض تاریخی مراحل کو علامتی طور پر دہرا کر حاجی اپنے خدا سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی کو اسی طرح دعوت حق اور اشاعت دین کے لئے وقف کر دے گا اور اس پر ہر حال میں قائم رہے گا، خواہ اس راہ میں اس پر وہ تمام مراحل کیوں نہ گزر جائیں، جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر اس راہ میں گزرے:

سأل رجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ما الحاج قال الشعث التفل فقام آخر فقال یا رسول اللہ ای الحج افضلُ قال العجُّ والثجُّ مشکوٰۃ، کتاب المناسک	ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا حاجی کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا پراگندہ بال اور بودار۔ پھر دوسرا شخص اٹھا اور پوچھا اے خدا کے رسول کون سا حج افضل ہے۔ آپ نے فرمایا: غبار آلود ہونا اور خون بہانا۔

دوسرے لفظوں میں حج کی بے ترتیب زندگی اور اس کے مجنونانہ اعمال محض بے روح مراسم نہیں ہیں جن کا آدمی کی اصل زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ دراصل مقصدی دیوانگی کی تصویر اور اس راہ میں جان کی قربانی کی حد تک جانے کے عزم کا مظاہرہ ہے۔

حج کے مناسک و مراسم کی شکل میں بندہ گویا اپنے آپ کو آخری طور پر اپنے رب کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ حج کا سفر اس کے لئے وقت اور مال کی قربانی کے ہم معنے ہے۔ احرام باندھنا اس بات کی علامت ہے کہ بندہ ضروری احتیاجات کے سوا ہر چیز سے دست کش ہو گیا ہے۔ طواف اور سعی اپنے آپ کو ہمہ تن رب کعبہ کے لئے وقف کر دینے کی تصویر ہے۔ رمی جمار اس بات کا مظاہرہ ہے کہ خدا کے دشمنوں کے ساتھ اس کا رویہ مصالحت اور تعاون کا نہیں ہوگا۔

بلکہ اختلاف اور تصادم کا ہوگا۔ جانور کی قربانی اپنے رب کے لئے فدا کاری و جانسپاری کا عہد ہے۔ عرفات کے میدان میں قیام میدان حشر میں سارے انسانوں کے خدا کے حضور جمع ہونے کی تمثیل ہے۔ اس طرح حج کے مختلف اعمال کے ذریعہ بندہ کو فدائیت، قربانی اور خدا و آخرت کے استحضار کا سبق دیا جاتا ہے اور اس کے اندر اپنے مولیٰ سے وہ عشق پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی مرضی پوری کرنے کے لئے دیوانہ وار اس کی راہ پر چل پڑے۔

اسلام کے چاروں عبادتی ارکان چار مختلف پہلوؤں سے ایک ہی مشترک کیفیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں، اور وہ یہ کہ انسان کا رخ ہمہ تن اپنے خالق کی طرف ہو جائے اور وہ اس کی مرضی پوری کرنے کے سوا اپنی زندگی کا کوئی اور مقصد نہ سمجھے۔ روزہ اس کیفیت کو طبیعی حاجات کے ڈھانچہ میں انجام دیتا ہے۔ نماز اس کو اعضاء و جوارح کے واسطے سے بروئے کار لاتی ہے۔ زکوٰۃ میں یہی مقصد مالیات کے پہلو سے حاصل کیا جاتا ہے اور حج کی عبادت میں یہی مطلوب کیفیت، اسلامی تاریخ کے سانچہ میں گزار کر حاصل کی جاتی ہے۔[٭]

حج کی عبادت کا بہت گہرا تعلق حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے ہے۔ آپ قدیم عراق کے شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا باپ بت خانہ کا سردار تھا۔ آپ نے بتوں کو توڑا۔ اپنے باپ پر تنقید کی۔ بادشاہ کے سامنے حق کا اعلان کیا، قوم کو اس کی گمراہی سے آگاہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ آپ کو گھر بار چھوڑنا پڑا۔ آپ اپنی بیوی (سارہ) اور اپنے بھتیجے (لوط) کو لے کر وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ مگر حق کی تبلیغ کرنا آپ نے نہیں چھوڑا۔ بلکہ جو تبلیغی کام پہلے شہر اُر تک محدود تھا، اس کو اب آپ نے بین اقوامی سطح پر کرنے کا نظام بنایا۔ آپ نے اپنے بھتیجے لوط کو سدوم کے علاقہ میں مبلّغ بنا کر بٹھایا۔ یہ وہ علاقہ تھا جس کو آج کل شرق اردن کہا جاتا ہے۔ اپنے چھوٹے لڑکے اسحاق کو اسی مقصد کی خاطر کنعان کے علاقہ میں آباد کیا جو اب فلسطین کے نام سے مشہور ہے۔ بڑے لڑکے اسمٰعیل کو حجاز میں مکہ کے مقام پر متعین کیا۔ مکہ میں آپ نے ایک مرکز اسلام (بیت اللہ) کی تعمیر کی اور خدا سے دعا کی کہ میں نے اس وادی غیر ذی زرع میں اپنی اولاد کو لا کر تیرے دین کے لئے بسا دیا ہے تو ان کی نسل سے ایک نبی پیدا کر جو لوگوں کو حق سے آگاہ کرے (بقرہ۔ ۱۲۹) اسی دعائے ابراہیمی کے نتیجہ میں آپ کی نسل کی اسماعیلی شاخ میں پیغمبر آخر الزماں پیدا ہوئے۔

حضرت ابراہیم کو ۱۷۵ سال کی عمر ملی۔ اُر سے لے کر مکہ تک آپ کی دعوتی زندگی تقریباً ایک صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس دعوتی زندگی میں جو مختلف مراحل پیش آئے، انھیں کو مختصر مدت میں علامتی طور پر دہرانے کا دوسرا نام حج ہے۔ سفر کر کے مرکز اسلام میں پہنچنا، بیت اللہ کا طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، منیٰ کے لئے روانگی، عرفات کے میدان میں ٹھہرنا، مزدلفہ میں رات گزارنا، جمرات میں کنکریاں مارنا، منیٰ میں قربانی کرنا، یہ سب کیا ہے،

٭ حج کے لغوی معنی ہیں قصد کرنا۔ حججت فلانا۔ یعنی میں فلاں کے پاس گیا۔ اس عبادت کی ادائگی کے لئے چوں کہ ساری دنیا کے مسلمان اپنے اپنے ملکوں سے نکل کر ایک خاص مقام پر آتے ہیں اس لئے اس کا نام حج پڑ گیا۔ یہ لفظ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں بھی موجود تھا۔

یہ سب حضرت ابراہیمؑ کی دعوتی زندگی کے تاریخی مراحل ہیں جن کو ہم ترتیبی طور پر دہراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دور کے مسلمانوں پر فرض کر دیا کہ وہ ان واقعات کو دہرا کر عہد دعوت کی تجدید کریں:

وفدیناہ بذبح عظیم وترکنا علیہ فی الآخرین (صافات ــ ۸-۱۰۷)

اور اس کے عوض میں دی ہم نے ایک بڑی قربانی اور باقی رکھا ہم نے اس کو پیچھے آنے والوں میں۔

قرآن بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم جب ہر قسم کے امتحان میں پورے اترے اور ہر حال میں دعوت حق کے مشن پر قائم رہے تو اللہ تعالےٰ نے ان کے حق میں وہ فیصلہ کر دیا جو علم الٰہی میں پہلے سے مقدر تھا:

واذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماماً (بقرہ ـ ۱۲۴)

جب ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں میں آزمایا تو اس نے ان کو پورا کر دکھایا۔ خدا نے کہا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

امامت سے مراد کوئی سیاسی اقتدار نہیں تھا۔ بلکہ آپ کو اس منصب پر فائز کرنا تھا کہ آپ کے ذریعہ خدا کا پیغام ہدایت اس کے بندوں تک پہنچے۔ قرآن میں ایک جگہ ابراہیم، لوط، اسحٰق، یعقوب (علیہم السلام) کا ذکر کر کے ارشاد ہوا ہے:

وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا واوحینا الیھم فعل الخیرات انبیاء ۶ـــ۷۳

ان کو ہم نے امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ بتاتے تھے اور ہم نے ان کو نیکی کے کاموں کا حکم دیا۔

یہ امامت جس کا دوسرا نام پیغمبری ہے، حضرت ابراہیم کے بعد آپ کی نسل میں مسلسل جاری رہی۔ ابتداءً آپ کے بیٹے اسحاق کی نسل میں پیغمبر آتے رہے اور لوگوں کو خدا کی مرضی سے باخبر کرتے رہے۔ اس سلسلے کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ تھے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل کے خاندان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۶۳۲ ـــ ۵۷۰) کی بعثت ہوئی۔ آپ کے بعد پیغمبر بھیجنے کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اور دین کو محفوظ اور مکمل کر کے اس کو امت محمدی کے سپرد کر دیا گیا اور امت محمدی کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ قیامت تک خدا کے بندوں کو خدا کی مرضی سے آگاہ کرتی رہے (حج ـ آخر)

حضرت ابراہیم کو جو صحیفے دیئے گئے، ان کی تعلیمات کا خلاصہ یہ تھا:

ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ۔ وابراھیم الذی وفیٰ۔ الا تزر وازرۃ وزر أخریٰ۔ وان لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ وان سعیہ سوف یریٰ۔ ثم یجزاہ الجزاء الاوفیٰ وان الیٰ ربک المنتھیٰ (نجم ــ ۴۲-۳۶)

کیا اس کو خبر نہیں جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم کے صحیفوں میں، جس نے احکام کی پوری بجا آوری کی۔ وہ یہ کہ کوئی شخص کسی کا بوجھ اپنے اوپر نہیں لے سکتا اور یہ کہ انسان کے لئے وہی ہے جو اس نے کمایا اور یہ کہ انسان کی سعی دیکھی جائے گی، پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ سب کو تیرے رب ہی کے پاس پہنچنا ہے

اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس لئے تمام انبیاء سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ ہر قیمت

پر انسان کو اس حقیقت سے باخبر کردیں:

واذ اخذنا من النبین میثاقھم ومنک ومن نوح و ابراھیم وموسیٰ وعیسی بن مریم واخذنا منھم میثاقاً غلیظا۔ لیسئل الصادقین عن صدقھم واعد للکافرین عذاباً الیما (احزاب ۸-۷)

اور جب ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا عہد لیا اور تم سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے، اور ہم نے ان سے خوب پختہ عہد لیا، تاکہ سچوں سے ان کے سچ کے بارے میں پوچھے، اور منکرین کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

دعائے ابراہیمی (بقرہ - ۱۲۹) کے نتیجہ میں پیغمبر آخرالزماں کی بعثت اسی غرض سے ہوئی۔ آپ کو عربی قرآن دیا گیا اور آپ کی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ آپ مکہ اور عرب کے دوسرے باشندوں کو حقیقت حال سے آگاہ کردیں:

وکذلک اوحینا الیک قرآناً عربیا لتنذر ام القریٰ ومن حولھا وتنذر یوم الجمع لاریب فیہ، فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر

شوریٰ ۸-۷

اور ہم نے اسی طرح عربی قرآن تمھارے اوپر نازل کیا، تاکہ تم مکہ والوں اور آس پاس کے لوگوں کو ڈرا دو اور انھیں جمع ہونے کے دن سے ہوشیار کردو، جس کے آنے میں شک نہیں۔ اس دن ایک گروہ جنت میں داخل ہوگا اور ایک دوزخ میں۔

اہل عرب کو براہ راست آپؐ کی اپنی زبان میں قرآن دیا گیا اور بقیہ قومیں جو ایمان لاکر ان سے "ملحق" ہوتی گئیں، بالتبع ان کے ساتھ شریک ہوتی گئیں:

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ، وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ وآخرین منھم لما یلحقوا بھم وھو العزیز الحکیم۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، واللہ ذو الفضل العظیم جمعہ ۴-۲

وہی ہے جس نے عرب کے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے اور ان دوسروں کے لئے بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم نے جو دعا کی تھی اس کا ایک حصہ یہ تھا: فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم (ابراہیم - ۳۷) یعنی تو اس جگہ کو خدا پرستوں کا مرکز بنا دے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے زمانہ ہی میں مشیت الٰہی نے یہ طے کردیا تھا کہ مکہ ملت اسلامی کا بین اقوامی اجتماع گاہ اور دعوت اسلام کا عالمی مرکز ہوگا۔ واذن فی الناس بالحج (حج - ۲۷) کی تفسیر کے تحت ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جب مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر ہوگئی تو

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ خدا نے تمھارے لئے ایک مرکز مقرر کیا ہے۔ پس وہاں آؤ (یاایھا الناس ان ربکم قد اتخذ بیتا فحجوہ) اس مرکز میں جمع ہونے کا مقصد وہی تھا جو رسول کا مقصد ہوتا ہے۔ اور جو امت محمدی کا مقصد وجود ہے، یعنی اہل عالم تک خدا کا پیغام پہنچانا:

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا و ھدی للعالمین آل عمران — ۹۶

یقیناً وہ گھر جو سب سے پہلے لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ برکت والا ہے اور جہان بھر کے لوگوں کو راہ دکھانے والا ہے۔

اس مقصد کے لئے کعبہ کو تمام مسلمانوں کے جمع ہونے کی جگہ بنایا گیا:

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا (بقرہ — ۱۲۵)

اور ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے اجتماع کی جگہ بنا دیا اور جائے امن قرار دیا۔

کعبہ کی اسی مرکزی حیثیت کو دوسری جگہ قیاما للناس (مائدہ — ۹۷) کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ گویا مکہ اہل اسلام کا بین اقوامی اجتماع گاہ ہے۔ وہ اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان وہاں ہر سال جمع ہوں۔ اپنے رب کی عبادت کریں اور پھر وہاں سے دعوت حق کی عالمی پیغام رسانی کی منصوبہ بندی کی جائے۔ بیت اللہ کی اصل حیثیت یہی ہے۔ باقی جو چیزیں ہیں وہ اسی مقصد کے ذیلی اہتمام کے اجزاء ہیں۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ پہلے جس طرح حج کے بعد باپ دادا کی عظمت بیان کرنے کا جذبہ لے کر لوٹتے تھے، اب خدا کی عظمت بیان کرنے کا جذبہ لے کر حج سے لوٹو (بقرہ — ۲۰۰)

جو لوگ حج کو صرف "زیارت" سمجھتے ہیں اور حج کی تعداد بڑھانے کو کمال سمجھتے ہیں، انھیں حضرت عبداللہ بن عباس کا قول پڑھنا چاہئے جس کو ابونعیم نے نقل کیا ہے:

لان اعول اھل بیت من المسلمین شھرا او جمعۃ او ماشاء اللہ احب الی من حجۃ بعد حجۃ (حلیۃ الاولیاء جلد اول)

مسلمانوں میں سے کسی گھر کے لوگوں کی خبر گیری میں ایک ماہ کروں یا ایک جمعہ یا جب تک اللہ چاہے، یہ مجھے حج پر حج کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

اس کام کے تسلسل کو یقینی بنانے کے لئے مزید اہتمام یہ کیا گیا کہ اس مرکز کو ایک محفوظ مرکز بنا دیا گیا۔ حکم ہوا کہ یہ مرکز صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہوگا جو خدا کی وفاداری کا اقرار کریں، دوسروں کو یہاں آنے کی اجازت نہ ہوگی:

وعھدنا الی ابراھیم واسمٰعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود بقرہ — ۱۲۵

ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل سے وعدہ لیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے مخصوص رکھنا اور اس کو غیروں سے پاک رکھنا۔

اس مرکز کی معاشیات کے لئے حضرت ابراہیم نے اللہ تعالےٰ سے دعا کی کہ "اے میرے رب! اس شہر کو امن والا شہر بنا اور اس کے باشندوں کو ثمرات (زمینی پیداوار) کا رزق عطا فرما۔ (بقرہ۔ ۱۲۶) اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ ساڑھے چار ہزار برس سے یہ شہر مقامی طور پر "غیر ذی زرع" ہونے کے باوجود ہر قسم کی خوش حالی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں عرب تیل کی دولت نے ثابت کیا ہے کہ اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں مالک کائنات نے یہ اہتمام بھی کر دیا تھا کہ صنعتی دور (Industrial age) میں بھی یہ علاقہ اپنی "زمینی پیداوار" سے اتنی کثیر دولت حاصل کرے جو نہ صرف اس کی اپنی ضروریات کو بفراغت پورا کرنے کی ضامن ہو بلکہ دعوتی ذمہ داری کو بھی اعلیٰ ترین سطح پر انجام دے سکے۔ ارضیات کے ماہرین اس کو جغرافی اتفاق (Accident of geography) قرار دیتے ہیں کہ دنیا کے تیل کے ذخائر کا تقریباً تہائی حصہ اسی زمین کے نیچے جمع ہو گیا جس کو جدید اصطلاح میں شرق اوسط کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس دعائے ابراہیمی کا نتیجہ ہے جس میں آپ نے اللہ تعالےٰ سے کہا تھا کہ خدایا! یہاں کے باشندوں کو زمینی پیداوار، بالفاظ دیگر ان کے قدموں کے نیچے ان کا رزق عطا فرما تاکہ وہ دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور تیری عائد کردہ ذمہ داریوں کو ہر دور میں بحسن وخوبی ادا کرنے کے وسائل پا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم کو امامت سپرد کی اور آپ کے بنائے ہوئے "بیت" کو ھدیٰ للعالمین (راہ نمائندہ مر عالمیان را) اور مثابۃ للناس (مرجع مردمان، شاہ ولی اللہ) قرار دیا تو ان کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ دنیا بھر میں جو خدا کے وفادار بندے ہیں وہ اس مرکز میں آئیں، اپنے امام سے ملیں، اپنے دینی و دنیوی منافع کے لئے یہاں حاضر ہوں۔ لیشھدوا منافع لھم، حج۔ ۲۸) اور اسی کے ساتھ اپنے خدا کی عبادت کریں۔ سال میں ایک بار تمام دنیا کے نیکو کار بندے خدا کے مرکزی گھر میں آکر اپنے دینی فرائض و مسائل پر غور کریں۔ اپنے امام کے احکام کو سنیں اور سنت ابراہیمی کی تجدید کے لئے تیار ہو کر اپنے اپنے وطن کو واپس جائیں۔

حج میں جو عبادتیں کی جاتی ہیں، وہ ذریعہ ہیں خدا کے قرب اور اس کی نصرت کے حصول کا۔ حج کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان یکجا ہو کر اپنے منافع دینی کی دیکھ بھال کریں اور اپنے عہد کا محاسبہ کر کے از سر نو اس پر سرگرم عمل ہونے کے لئے تیار ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو ملت ابراہیمی کو زندہ اور قائم کرنے آئے تھے آپ نے نہ صرف حج کے مراسم میں بگاڑ کو درست کیا بلکہ اس کو دینی مرکز بھی بنایا۔ آپ حج کے موقع پر یہاں امر حق کا اعلان کرتے (خطبہ حجۃ الوداع) دینی فرائض و احکام کو بیان کرتے، ملی معاہدوں کو قبول اور فسخ کرنے کا اعلان بھی اسی حج کے دن ہوتا۔ اپنی امت کے لئے آخری گواہی بھی آپ نے حج کے موقع پر لی جب کہ اپنے خطبہ کے بعد آپ نے فرمایا الا ھل بلغت، لوگوں نے کہا، بلی یا رسول اللہ۔ منکرین حق کو آخری الٹی میٹم دینا ہوا تو اس کے لئے بھی اسی حج کے دن کو منتخب کیا گیا:

واذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر — اور اعلان کر دینا بڑے حج کے دن خدا اور رسول کی طرف سے ..... توبہ ــ ۳

آیت کے نزول کے وقت امام وقت (پیغمبر) مدینہ میں تھا مگر براءت کا اعلان مکہ میں حج کے دن کیا گیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مکہ اسلامی تحریک کا دائمی مرکز ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

ان الدین لیارز الی الحجاز کما تارز الحیۃ الی جحرھا	دین حجاز کی طرف سمٹے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی
مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنہ	طرف واپس آتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے مقام فضیلت (بقرہ ـ ۴۷) پر فائز کیا تھا۔ یہ وہی چیز ہے جس کے لئے امت محمدی کے سلسلے میں خیر امت (آل عمران ـ ۱۱۰) کے الفاظ آئے ہیں۔ بنی اسمٰعیل (امت محمدی) سے پہلے بنی اسرائیل کو اس مقصد کے لئے چنا گیا تھا کہ وہ لوگوں کو امر حق سے آگاہ کریں:

"بنی اسرائیل کا واحد فریضہ دنیا میں خدا کا گواہ بننا تھا" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۶، صفحہ ۲)

"بنی اسرائیل پر خاص فرض عاید ہوا تھا کہ توحید باری کی دعوت دیتے رہیں اور آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی کواکب پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہیں" (صفحہ ۵)

جب بنی اسرائیل کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تو اسی کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام (۱۴۰۰ـ ۱۵۲۰ ق م) کے زمانہ میں ان کی معاشیات کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خصوصی انتظام فرمایا۔ یہ من و سلویٰ تھا جو نہایت آسانی سے بفراغت انھیں اپنی قیام گاہوں پر مل جاتا تھا۔ انھیں حکم تھا کہ اس خدائی انتظام سے اپنی معاشیات لیتے ہوئے زیادہ سے زیادہ خدائی مشن کے لئے مصروف ہوں۔ مگر وہ اس مصلحت کو سمجھ نہ سکے۔ انھیں کام و دہن کی لذتیں اور شہری زندگی کی آسائشیں یاد آنے لگیں۔ وہ حالت خیر کے مقابلہ میں حالتِ ادنیٰ کو ترجیح دینے لگے۔ بالآخر انھیں مقام فضیلت سے معزول کر دیا گیا۔ کیوں کہ یہ خدا کی نظر میں اللہ کی نشانیوں سے انکار کے ہم معنی تھا:

واذ قلتم یٰموسیٰ لن نصبر علیٰ طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مما تنبت الارض من بقلھا و قثاءھا وفومھا وعدسھا وبصلھا، قال اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر، اھبطوا مصراً فان لکم ما سألتم، وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباءو بغضب من اللہ ذلک بانھم کانوا یکفرون بآیات اللہ	اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک کھانے پر نہیں رہ سکتے پس اپنے رب سے کہئے کہ وہ ہمارے لئے نکال دے جو زمین سے اگتا ہے۔ ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور، پیاز۔ موسیٰ نے کہا کیا تم چاہتے ہو ایک چیز جو ادنیٰ ہے بدلے ای چیز کے جو بہتر ہے۔ اترو کسی شہر میں وہاں تم کو ملے گا تم مانگتے ہو اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی او وہ مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے۔ یہ اس لئے ہوا کہ انکار کرتے تھے اللہ کی نشانیوں کا۔
بقرہ ـ ۶۱	

عرب دنیا کو تیل کی جو دولت ملی ہے، اس کی حیثیت ٹھیک وہی ہے جو بنی اسرائیل کے من و سلویٰ کی تھی۔ من و سلویٰ "خدا کے دین کی گواہی" دینے کی قیمت تھی، اسی طرح تیل کی دولت اس لئے ہے کہ عالمی سطح پر اور اعلیٰ ترین م

کے ساتھ خدا کا پیغام پہنچانے کا کام جو بڑی سے بڑی قیمت مانگتا ہے اس کو ادا کرتے ہوئے اس کام کو جاری رکھا جائے۔

عالمِ عرب میں کعبہ کو قائم کرکے اس علاقہ کو دائمی طور پر اسلامی دعوت کا مرکز بنا دیا گیا ہے۔ ایک طرف اس علاقہ کے اندر ایسی تاریخی کشش رکھ دی گئی ہے کہ ساری دنیا کے لوگ کھنچ کھنچ کر ہر سال وہاں لاکھوں کی تعداد میں پہنچتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کو حرم اور امن کی نسبت دی گئی ہے، یعنی اس کے اردگرد ایسے اسباب جمع کر دیئے گئے ہیں جس کے بعد یہ علاقہ دائمی طور پر اہل اسلام کے قبضہ میں رہے اور کبھی اس پر دوسروں کا سیاسی یا انتظامی قبضہ نہ ہونے پائے — ان دو انتظامات کے بعد حیرت انگیز طور پر یہ تیسرا انتظام بھی کیا گیا ہے کہ اس علاقہ کی اقتصادیات کو انتہائی محکم بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے تاکہ یہاں کے باشندے نہ صرف یہ کہ اپنی ضروریات زندگی کے لئے محتاج نہ رہیں بلکہ دین کے اعلان و اظہار کی وہ بڑی سے بڑی قیمت بھی ادا کر سکیں جو مختلف زمانوں میں انھیں اس سلسلے میں درکار ہو گی۔

صراط مستقیم

صراط مستقیم کیا ہے۔؟

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے پوری کائنات کے لئے ایک محکم راستہ مقرر کر دیا ہے۔ ہر چیز نہایت درجہ پابندی کے ساتھ اسی مقرر راستہ پر چلی جارہی ہے (حم سجدہ ۔ ۱۱) حتیٰ کہ شہد کی مکھی بھی (نحل : ۶۹ ۔ ۶۸) جس طرح کائنات کی دوسری چیزوں کی صحیح کارکردگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سبیل اللہ پر بالکل ذلول بن کر چلتی رہیں (نحل ۔ ۶۹) اسی طرح انسان کی کامیابی کا راز بھی اسی میں ہے ۔ البتہ انسان چوں کہ حالت امتحان میں ہے، اس لئے اس کو صرف بتانے پر اکتفا کیا گیا ہے اور اس کو موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ارادے سے خواہ اس کو پکڑے یا اس سے انحراف کرے (دہر ۔ ۳) جب خدا نے خود یہ بتا دیا ہے کہ سبیل اللہ کیا ہے تو انسان کو چاہئے کہ اس پر اعتماد کرے اور اس یقین کے ساتھ اس کو اختیار کرلے کہ یہی واحد راستہ ہے جو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے (ابراہیم ۔ ۱۲) اگر آدمی کسی وقتی سبب سے متاثر ہو کر کسی اور راستہ کی طرف جھکا تو سبیل اللہ اس سے چھوٹ جائے گی اور جس سے سبیل اللہ چھوٹ جائے اس کے لئے اس دنیا میں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں : (انعام ۔ ۱۵۳)

اللہ تعالےٰ کے نزدیک وہی انسان انسان ہے جو صراط مستقیم پر ہو، جو صراط مستقیم سے ہٹ جائے وہ گویا مقام حیوانیت پر جاگرا :

أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ (ملک ۲۳ ۔ ۲۲)	کیا وہ شخص جو (جانور کی طرح) اوندھے منھ چلتا ہو، راہ یافتہ ہے یا وہ شخص جو (انسان کی طرح) سیدھا صراط مستقیم پر چل رہا ہو۔ کہہ دو، خدا ہی نے تم کو پیدا کیا، اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے مگر تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو۔

معلوم ہوا کہ صراط مستقیم پر ہونا یہ ہے کہ آدمی سمع و بصر و فواد کی صلاحیتوں کو استعمال کرکے زندگی گزار رہا ہو یہ سمع و بصر و فواد کیا ہیں۔ یہ وہی چیزیں ہیں جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں، جو ایک "جاندار" کو محض جان دار کے مقام سے اٹھا کر انسان کے مقام پر کھڑا کرتی ہیں ۔ اس کے برعکس حیوانوں کی مثال ہے، جو اگرچہ چلتے پھرتے ہیں مگر سمع و بصر و فواد کی ان صلاحیتوں سے محروم ہیں جو مخصوص طور پر انسان کو دی گئی ہیں۔ اب جو لوگ انسانی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہوئے ان سے کام نہ لیں انھوں نے گویا اپنے کو مقام انسانیت سے گرا کر مقام حیوانیت پر ڈال دیا۔ چنانچہ ان کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ کتے کی مانند ہیں (اعراف ۔ ۱۷۶) وہ گدھے کی مانند ہیں (جمعہ ۔ ۵) وہ چوپائے کی مانند ہیں (فرقان ۔ ۴۴) حتیٰ کہ ان کی زیادہ بگڑی ہوئی قسموں کو بندر اور سور (مائدہ ۔ ۶۰) قرار دیا

گیا ہے۔ بلکہ ان سے بھی بدتر:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (انفال۔ ۲۲)

خدا کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں، گونگے ہیں، کچھ نہیں سمجھتے۔

ایک بات جو عقل کے استعمال سے بخوبی سمجھی جا سکتی ہو اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا گویا مخاطب کے پاس عقل ہی نہیں، اللہ کی نظر میں آدمی کو اندھا بہرا بنا دیتا ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین تقویم پر پیدا کیا۔ پھر اس کو بدترین پستی میں ڈال دیا۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں (التین)۔ اول الذکر سے مراد مقام انسانیت اور ثانی الذکر سے مراد مقام حیوانیت ہے۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مقام انسانیت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو مقام حیوانیت میں ڈال دیا۔ اب اس کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پستی سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جائے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (اعراف۔ ۱۷۶)

اگر ہم چاہتے تو اپنی نشانیوں کی بدولت اس کو بلند مرتبہ کر دیتے۔ مگر وہ زمین سے لگ گیا اور اپنی خواہش کی پیروی کی۔

اس قسم کی آیتوں میں جن لوگوں کو اندھا، بہرا، بے عقل کہا گیا ہے، وہ عضویاتی معنوں میں اندھے بہرے نہیں ہو گئے تھے، نہ پاگلوں کی طرح فی الواقع کسی گڑھے میں اندھے منھ پڑے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے وقت میں علم اور دانش کے امام سمجھے جاتے تھے۔ وہ عالی شان مکانات اور قلعے بناتے تھے۔ تجارت، زراعت اور باغبانی کے ماہر تھے۔ وہ قوموں اور ملکوں کی قیادت کر رہے تھے۔ سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت (۱۷۶) کے سلسلے میں شان نزول کی جو روایتیں ہیں، ان میں عرب کے امیہ بن ابی الصلت کا نام آتا ہے جو نہ صرف اپنی امارت اور فیاضی کے لئے بلکہ شاعری اور حکمت کے لئے بھی مشہور تھا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کے آخر زمانہ کے ایک شخص بلعام ابن باعورا کا نام آیا ہے جو عالم اور زاہد کی حیثیت سے اس وقت کے عراق کا ایک ممتاز ترین آدمی تھا۔ عبادہ بن الصامت سے مروی ہے کہ وہ قریش کے سرداروں کو اس کا مصداق سمجھتے تھے، جو کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے پورے عرب کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ (البحر المحیط)

پھر اندھے بہرے ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے انسان اور حیوان کے فرق پر غور کیجئے۔ حیوان میں بظاہر وہ ساری چیزیں ہوتی ہیں جو انسان کے اندر ہیں۔ وہ چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، دیکھتا سنتا ہے۔ دکھ درد کا احساس کرتا ہے۔ پھر وہ کیا چیز ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں۔ ماہرین حیاتیات بتاتے ہیں کہ وہ فرق یہ ہے کہ انسان تصوری فکر (Conceptual Thought) کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سوچ کر کسی بات کو ماننا بغیر اس کے کہ وہ چیز ایک مادی حقیقت کے طور پر اپنے آپ کو منوانے کے لئے سامنے موجود ہو۔ حیوانات اس قسم کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسی سے مقام انسانیت اور مقام حیوانیت کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مقام حیوانیت یہ ہے کہ آدمی کو مادی حقائق اور مفاد و مضار کے سوا کوئی اور چیز متحرک نہ کر سکے۔ اس کے برعکس مقام انسانیت

یہ ہے کہ ذہنی طور پر کسی چیز کی سچائی ثابت ہو جانے کے بعد اس کو مان لیا جائے اور اس کی بنیاد پر اپنی زندگی کا نقشہ بنایا جائے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ بقرہ ــ ۲	اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ راہ دکھاتی ہے ڈرنے والوں کو، جو یقین کرتے ہیں بن دیکھے۔

قرآن میں ہدایت ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جن کا حال یہ ہو کہ صرف مادی حقائق کا زور یا نفع و نقصان کا اندیشہ ہی انھیں متاثر کر سکتا ہو۔ اس کتاب سے وہ لوگ ہدایت پاتے ہیں جو ایسی صداقتوں کو ماننے کے لئے تیار ہوں جن کی اہمیت تمام تر ذہنوں میں ہوتی ہے۔ خارجی حقائق کا زور جن کو منوانے کے لئے دنیا میں موجود نہیں ہوتا۔ گویا ایمان بالشہود مقام حیوانیت ہے اور ایمان بالغیب مقام انسانیت۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر کے قبول اسلام کی بابت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما دعوت احدا الی الاسلام الا کانت عنده كبوة وتردد ونظر الا ابابكر ما عكم عنه حين ذكرته ولا تردد فيه (البدایہ والنہایہ، جلد ۳، صفحہ ۲۷)	میں نے جس شخص کو بھی اسلام کی دعوت دی، اس کو کچھ نہ کچھ جھجک اور تردد اور فکر ضرور ہوا، سوا ابوبکر کے، جب میں نے ان کو اسلام کے متعلق بتایا تو انھوں نے کسی تردد اور تامل کے بغیر فوراً اسلام قبول کر لیا۔

یہ مقام انسانیت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے جو ابوبکر صدیق کو حاصل تھا۔ وہ خالص جوہر ذاتی کی بنیاد پر کسی چیز کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتے تھے۔ کوئی شخص پیغمبر اسلام کی اعلیٰ شخصیت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوا، کوئی معجزات سے، کوئی قرآن کے ما فوق ادب سے، کوئی فتح مکہ سے، کوئی اسلام کی مادی برکات سے۔ مگر ابوبکر صدیق اتنے بلند فکری مقام پر تھے کہ مجرد حسن و قبح کی بنیاد پر کسی چیز کو قبول یا رد کر سکتے تھے۔ اسی طرح جب حضرت ابوبکر نے مرض وفات کے وقت حضرت عمر فاروق کے حق میں خلافت کی وصیت فرمائی تو لوگوں میں عام بے چینی پیدا ہو گئی:

فدخل عليه طلحة بن عبيد الله فقال انا رسول من ورائي اليك يقولون: قد علمت غلظة عمر علينا في حياتك فكيف بعد وفاتك اذا افضيت اليه امورنا والله سائلك عنه فانظر ما انت قائل	طلحہ بن عبید اللہ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں نے مجھے اپنا قاصد بنا کر آپ کے پاس بھیجا ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم لوگوں پر حضرت عمر کی سختی آپ نے اپنی زندگی ہی میں دیکھ لی ہے پھر اپنے بعد جب ہمارے کام آپ ان کے حوالے کر دیں گے تو کیا حال ہوگا۔ اور اللہ آپ سے ان کے بارے میں سوال کرے گا پھر آپ اس وقت کیا جواب دینگے۔

مگر جو لوگ مقام انسانیت کے اعلیٰ درجہ پر تھے، وہ ظاہر سے گزر کر باطن کو دیکھ رہے تھے، انھیں نظر آ رہا تھا کہ حضرت عمر کی سختی اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ دین کے لئے ہوتی ہے اور ان کے سینہ کے اندر جو قلب خاشع ہے وہ ان کے حق پر قائم رہنے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ ان کے ظاہر پر نہ جاؤ، کیوں کہ ان کا باطن ان کے

ظاہر سے بہتر ہے (سریرتہ خیر من علانیتہ) یہی بات حضرت ابوبکر نے بھی دوسرے الفاظ میں فرمائی۔

جو شخص صراط مستقیم پر ہو اس کے اندر اعتراف کا اعلیٰ ترین مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ قریش نے آپ کی زبان سے قرآن کو سنا تو بول اٹھے: "یہ تو شاعر کا کلام ہے" شاعر کا لفظ ان کے یہاں کوئی برا لفظ نہ تھا۔ مگر اللہ کے نزدیک وہ "ایمان قلیل" تھا، ایمان کلی نہ تھا (حاقہ۔ ۴۱) وہ اس کو شاعر کا کلام بتا کر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ یہ بس ایک ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں ملت ابراہیمی کی قدیم تعلیمات کو اچھوتے انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب الٰہی کی یہ حیثیت ہو جاتی تھی کہ ایک ادبی اعتراف اس کا حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے۔ حالاں کہ قرآن کا اصلی حق یہ تھا کہ اس کو صداقتِ اعلیٰ کا اظہار سمجھا جائے اور اس کو "حق الیقین" کے ساتھ پکڑ لیا جائے۔ مکہ میں داخلہ سے ایک دن پہلے جب آپ نے ابوسفیان سے کلمہ اسلام کا اقرار کرنے کے لئے فرمایا تو انھوں نے کہا: بأبی انت وامی ما احلمك واكرمك واوصلك، هذه والله كان فی النفس منها شئ حتی الآن۔ اس کے بعد جب آپ کے چچا عباس نے صورت حال کی نزاکت کا احساس دلایا تو انھوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ ابوسفیان کے لئے آپ کی شرافت، آپ کی بردباری کا اعتراف کرنا آسان تھا۔ کیونکہ اس کے بعد بھی ان کو یہ نفسیاتی تسکین حاصل رہتی تھی کہ ان کے اور آپ کے درمیان اگر فرق ہے تو وہ صرف اخلاقی ہے نہ یہ کہ آپ کا نظریہ صحیح ہے اور ان کا غلط۔ اور بلاشبہ نظریاتی اعتراف کسی انسان کے لئے اخلاقی اعتراف کے مقابلہ میں بہت زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

انفرادی صراط مستقیم

متفرق اور منحرف راستوں کے درمیان اللہ کا سیدھا راستہ کیا ہے۔ اس کو قرآن میں نہایت وضاحت کے ساتھ بتا دیا گیا ہے۔ انفرادی زندگی کے بارے میں بھی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں بھی۔

قرآن کی چھٹی سورہ کا ایک ٹکڑا حسب ذیل ہے:

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا به شیئاً وبالوالدین احسانا ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاهم ولا تقربوا الفواحش ما ظهر منها وما بطن ولا تقتلوا النفس التی حرم الله الا بالحق، ذلکم وصٰکم به لعلکم تعقلون ۔ ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی هی احسن حتی یبلغ اشده و اوفوا الکیل والمیزان بالقسط لا نکلف نفسا الا وسعها۔ واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ وبعهد الله اوفوا۔ ذلکم وصکم به لعلکم تذکرون

کہو، آؤ میں سنا دوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ شریک نہ کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اپنی اولاد کو مار نہ ڈالو مفلسی کے ڈر سے، ہم روزی دیتے ہیں تم کو اور ان کو، اور نزدیک نہ جاؤ بے حیائی کے کام کے خواہ وہ کھلا ہو یا چھپا، اور مار نہ ڈالو جان، جس کو حرام کیا ہے اللہ نے، مگر حق پر۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو اور نزدیک نہ جاؤ یتیم کے مال کے۔ مگر ایسے طریقے سے جو کہ مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور ناپ اور تول

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ انعام: ۱۵۲ - ۵۳	کو پورا کرو انصاف کے ساتھ ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتے۔ اور جب بات کہو تو حق کی کہو، گو وہ شخص قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، اللہ تم کو یہ بتاتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ اور یہ کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ سو اس پر چلو اور مت پیروی کرو اور راہوں کی وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اللہ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم خلاف ورزی سے بچو۔

یہ انفرادی زندگی کی صراط مستقیم ہے اور اس کا خلاصہ ہے ـــــــ توحید، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، خدا پر اعتماد، برائی سے بچنا، جان کا احترام کرنا، ظالمانہ رویہ سے پرہیز، لین دین میں دیانت داری، ہر حال میں انصاف پر قائم رہنا، خدا کے ساتھ عہد بندگی کو پورا کرنا۔ ہر معاملہ میں تقویٰ کی روش اختیار کرنا۔

جو لوگ صراط مستقیم پر ہوں، وہ اللہ کے انعام یافتہ گروہ ہیں (فاتحہ) ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لایا گیا ہے (ابراہیم ـ ۱) ان کو خدا کی رحمت اور فضل میں سے خصوصی حصہ ملا ہے (نساء ـ ۱۷۵) حتیٰ کہ ان پر خدا کی نعمتوں کا اتمام کر دیا گیا ہے (فتح ـ ۲) ظاہر ہے کہ جو لوگ ان خصوصیات کے حامل ہوں، ان کی زندگیاں عام انسانوں جیسی نہیں ہو سکتیں۔ ضروری ہے کہ ان کی زندگی میں یہ یافت مختلف شکلوں میں ظاہر ہو۔

۱۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انھیں اعلیٰ ایمانی کیفیات حاصل ہوتی ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے ایک شخص سے کہا: تعال نؤمن ساعة (آؤ ہم تھوڑی دیر کے لئے ایمان لائیں) یہ سن کر وہ آدمی بگڑ گیا۔ "کیا ہم مومن نہیں ہیں" (اولسنا بمومنین) اس نے کہا۔ ابن رواحہ نے جواب دیا بے شک ہم مومن ہیں۔ مگر جب ہم اللہ کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ابن رواحہ عجیب آدمی ہیں۔ وہ آپ کے ایمان کو چھوڑ کر ایک ساعت کے ایمان کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

یرحم اللہ ابن رواحة، انه یحب المجالس التی تتباهی بها الملائكة (احمد عن انس بن مالک)	اللہ ابن رواحہ پر رحم کرے، وہ ایسی مجالس کو پسند کرتے ہیں جن پر فرشتے بھی فخر کرتے ہیں۔

حضرت ابن رواحہ نے جو بات کہی، وہ برتر ایمانی کیفیت کا ایک جملہ تھا۔ مگر جو شخص قانونی اسلام کے مقام پر تھا، وہ اس کو سمجھ نہ سکا۔

۲۔ ایسے لوگوں کے لئے ایمان یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ اندیشہ انھیں تڑپا دیتا ہے کہ وہ ایسی زندگی گزاریں جو خدا کی راہ سے ہٹی ہوئی ہو۔ قرآن میں جب یہ آیت اتری:

اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ (توبہ۔۳۴) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تبا للذھب، تبا للفضۃ (خرابی ہو سونے کے لئے خرابی ہو چاندی کے لئے) آپ کے اصحاب پر یہ بات بہت شاق گزری۔ انھوں نے آپس میں کہا: فای مال نتخذ (اب ہم کس مال کو جمع کریں) اس کے بعد حضرت عمر اس مسئلہ کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

لیتخذ احدکم لسانا ذاکرا وقلبا شاکرا و زوجۃ مومنۃ تعین احدکم علی ایمانہ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۳۵۱)

تم میں سے ہر ایک یہ کرے کہ یاد کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل، اور ایسی بیوی اختیار کرے جو آدمی کے ایمان پر اس کی مدد کرے۔

۳۔ اس کے اندر اعتراف کا مادّہ کمال درجہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جابر بن الازرق غاضری ایک صحابی ہیں۔ وہ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سفر میں آپ کے ساتھ ہو گئے۔ راستہ میں ایک جگہ آپ نے قیام فرمایا اور سواری سے اتر کر اپنے چمڑے کے خیمہ میں داخل ہو گئے۔ خیمہ کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک شخص نے دھکا دے کر دروازے سے ہٹانا چاہا۔ میں نے کہا: اب اگر تو نے مجھے دھکا دیا تو میں بھی تجھے دھکا دوں گا اور اگر تو نے مجھے مارا تو میں بھی تجھے ماروں گا۔ یہ سن کر وہ آدمی بولا: یا اشر الرجال (اے لوگوں میں سب سے زیادہ شریر) میں نے کہا خدا کی قسم تو مجھ سے زیادہ شریر ہے۔ اس نے کہا تم نے یہ بات کیسے کہی۔ میں یمن کے اطراف سے آرہا ہوں تاکہ رسول اللہ سے کچھ سنوں اور واپس جا کر ان لوگوں سے بیان کروں جو میرے پیچھے ہیں۔ اور تو ہے کہ مجھے روک رہا ہے۔ یہ سنتے ہی جابر بن ازرق غاضری کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ فوراً ان کی زبان سے نکلا:

صدقت نعم واللہ لا نا اشر منک (کنز العمال) ہاں تو نے سچ کہا۔ خدا کی قسم میں تجھ سے زیادہ شریر ہوں۔

۴۔ وہ اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ مسند امام احمد میں ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی ایک مقدمہ لے کر آئے۔ ایک وراثتی جائداد پر دونوں جھگڑ رہے تھے۔ ہر ایک کہتا تھا کہ یہ میری ہے جب کہ دونوں میں سے کسی کے پاس اپنے حق میں واضح ثبوت نہیں تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ اپنے مقدمے میرے پاس لاتے ہو۔ مگر میں انسان ہوں، ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی زیادہ بہتر وکالت کرنا جانتا ہو اور اس کی باتوں کو سن کر میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ مگر یاد رکھو اگر میں نے کسی کو اس کے بھائی کا حق دیا ہو گا تو قیامت کے دن وہ اس کے لئے آگ کا ٹکڑا ثابت ہو گا۔ آپ کی زبان سے یہ سنتے ہی دونوں شخص رو پڑے اور دونوں کا یہ حال ہوا کہ ہر ایک کہنے لگا کہ میرا حق میرے بھائی کے لئے، میرا حق میرے بھائی کے لئے (حقی لاخی حقی لاخی)

۵۔ اس سے آدمی کے اندر وہ بلند نظری پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کا بھی اس طرح لحاظ کرنے لگتا ہے گویا کہ وہ اس سے بڑے ہوں۔ امیر معاویہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں ایک بار ایک انصاری کے پاس پانچ سو دینار بھیجے۔ انصاری کو یہ مقدار کم معلوم ہوئی۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا ان کو لے کر معاویہ کے پاس جاؤ اور ان کے

منھ پر مار کر واپس کردو۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو قسم دلائی کہ وہ ایسا ہی کرے۔ وہ رقم لے کر امیر معاویہ کے پاس آیا اور کہا: اے امیر المومنین میرے باپ نے مجھے ایسا حکم دیا ہے اور میں اس کی مخالفت کرنے کی قدرت نہیں رکھتا"۔ امیر معاویہ نے اپنا ہاتھ اپنے منھ پر رکھ لیا اور کہا، جو کچھ تیرے باپ نے کہا ہے اس کی تعمیل کر۔ مگر اپنے چچا سے ذرا نرمی کا سلوک کرنا"۔ لڑکے کو شرم آگئی اور دینار علیحدہ پھینک کر چلا آیا۔ امیر معاویہ نے اس کے بعد تعداد کو دگنا کر کے اسے انصاری کے پاس بھیج دیا۔ (تاریخ الفخری)

۶۔ اس سے وہ حقیقت شناسی پیدا ہوتی ہے کہ معمولی آدمی بھی ایسی باتیں کرنے لگے جو بڑے بڑے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیں۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں جب سعد بن ابی وقاص نے قادسیہ (فارس) پر چڑھائی کی۔ اس زمانہ میں فارسی سپہ سالار رستم اور ان کے درمیان قاصدوں کا تبادلہ ہوا۔ اسی دوران ایک قاصد جب اپنے معمولی سروسامان کے ساتھ رستم کے پرشوکت دربار میں پہنچا تو وہ اس کو حقیر دکھائی دیا۔ اس نے اس کے نیزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تکلے کی طرح تمھارے ہاتھ میں کیا چیز ہے"۔ قاصد نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: "انگارہ کے لئے اس کا چھوٹا ہونا اس میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتا"۔ (تاریخ الفخری)

۷۔ اس سے وہ نظر پیدا ہوتی ہے کہ آدمی دشمن کی باریک ترین چالوں کو بھی دیکھ سکے۔ حضرت عمر کے ساتھ ہجرت کرنے والوں میں ایک شخص عیاش بن ربیعہ تھے۔ قریش کو جب معلوم ہوا کہ وہ مدینہ پہنچ گئے تو ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام جو ان کے رشتہ دار تھے، ان کے پیچھے مدینہ پہنچے اور عیاش بن ربیعہ سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ مکہ واپس چلو۔ تمھاری ماں کو تمھارے چلے آنے کا بہت صدمہ ہے۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تمھیں نہیں دیکھے گی نہ بالوں میں کنگھی کرے گی اور نہ سایہ کے نیچے جائے گی۔ حضرت عمر بات کی تہ کو پہنچ گئے۔ انھوں نے عیاش بن ربیعہ سے کہا کہ یہ تم کو واپس لے جانے کی سازش ہے۔ تمھیں ان باتوں سے گھبرانا نہیں چاہئے:

فواللہ لو قد آذی امك القمل لامتشطت ولو	خدا کی قسم تمھاری ماں کو جوں کاٹے گی تو وہ ضرور کنگھی کرےگی
قد اشتد علیها حر مکة لاستظلت (البدایہ والنہایہ جلد ۳)	اور جب مکہ کی گرمی ستائے گی تو وہ ضرور سایہ میں جائے گی۔

مگر عیاش بن ربیعہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ مکہ واپس گئے اور وہاں لوگوں نے انھیں فتنہ میں مبتلا کر دیا۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے اس اجر عظیم (طلاق ۔ ۵) کی خوش خبری دی گئی ہے کہ ان کی سیئات بھی حسنات میں تبدیل کر دی جاتی ہیں (فرقان ۔ ۷۰) حقیقت یہ ہے کہ غلطیاں ہر ایک سے سرزد ہوتی ہیں۔ مومن سے بھی اور غیر مومن سے بھی۔ مگر جس کو حقیقی مقام عبدیت حاصل ہو جاتا ہے، اس سے جب غلطی ہوتی ہے تو اس کے بعد وہ دگنی شدت کے ساتھ خدا کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی غلطی اس کو نئی شدید تر ایمانی کیفیت سے لبریز کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ غلطیوں کے اندھیرے میں گم رہتا ہے۔ اس کی غلطیاں اس کو نئی ایمانی خوراک دینے کے بجائے صرف اس کی قساوت میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ	یقیناً جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب پڑتا ہے ان پر شیطان

تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ
اعراف ۲۰۲ — ۲۰۱

کا گزر، وہ چونک جاتے ہیں۔ سو یکایک ان کو سوجھ آجاتی ہے اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں پھر کمی نہیں کرتے۔

اجتماعی صراط مستقیم

پیغمبر کے ذریعہ جس طرح نماز روزہ کا طریقہ بتایا گیا۔ اسی طرح یہ بھی بتایا گیا کہ تحریک کس طرح چلائی جائے۔ حریف طاقتوں کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اور اسلام کو کس طرح دنیا میں غالب کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح انفرادی زندگی کی ایک صراط مستقیم ہے اسی طرح اجتماعی زندگی کی بھی ایک صراط مستقیم ہے۔ صلح حدیبیہ (۶۲۸) اسلام کی اجتماعی جدوجہد کا اہم ترین واقعہ ہے۔ قرآن کی ۴۸ ویں سورہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

ولتکون آیۃ للمومنین ویھدیکم صراطاً مستقیما
فتح — ۲۰

اور تاکہ ایک نمونہ ہو اہل ایمان کے لئے، اور تاکہ تم کو دکھادے سیدھی راہ۔

صلح حدیبیہ کے سیاق میں اس آیت کا آنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح عبادات اور اخلاق میں ایک صراط مستقیم ہے، اسی طرح صلح و مقابلہ کے معاملات میں بھی ایک صراط مستقیم ہے۔

جو شخص صراط مستقیم پر ہو، دوسرے لفظوں میں اس مقام انسانیت پر ہو جہاں فیصلے تمام تر سمع و بصر و فواد کی بنیاد پر ہوتے ہیں نہ کہ ضد اور ردعمل کی بنیاد پر، اس کو انتہائی دوررس نگاہ حاصل ہو جاتی ہے، وہ تمام جذباتی محرکات اور اضافی پہلوؤں سے گزر کر براہ راست اصل حقیقت کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس حقیقت رسی کی بنا پر اس کی منصوبہ بندی نہایت صحیح اور قطعی ہوتی ہے۔ وہ اتنا بے پناہ ہو جاتا ہے کہ اس کا نشانہ کبھی نہ چوکے، اس کا وار کبھی خطا نہ کرے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے:

اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ

مومن کی فراست سے بچو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

قرآن میں جہاں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان اپنے مقابلہ میں۔ اگنا زیادہ تعداد پر غالب رہیں گے۔ وہاں کثرت تعداد کے باوجود حریف کی شکست کی وجہ یہی بتائی گئی ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو "سمجھ" نہیں رکھتے:

ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفا من الذین کفروا بانھم قوم لا یفقھون
(انفال — ۶۵)

اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور سو ہوں گے تو وہ ہزار منکروں پر غالب آئیں گے، اس لئے کہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ اس سلسلہ کی ایک نمایاں مثال ہے۔ یہ صلح صریح طور پر "دب کر" کی گئی۔ عقل حیوانی اس کے لئے کسی طرح تیار نہ ہو سکتی تھی کہ ڈیڑھ ہزار جاں نثار ساتھیوں کے ہوتے ہوئے ایسے صلح نامہ پر دستخط کر دیئے جائیں جس کا مسودہ تمام تر دشمن کے مطالبات کی بنیاد پر بنایا گیا ہو۔ مگر عقل انسانی جو حقائق کو بے آمیز شکل میں

دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس کو نظر آرہا تھا کہ یہ صریح طور پر "فتح مبین" (فتح - ۱) کا معاملہ ہے۔

اسی طرح زندگی کے تمام معاملات اور دنیا و آخرت کے سارے مسائل کے لئے ایک صراط مستقیم یا سبیل اللہ بتا دی گئی ہے۔ کائنات مکمل طور پر اسی سبیل اللہ پر چل رہی ہے۔ انسان کے لئے بھی نجات اور کامیابی کا راستہ یہی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ کائنات طوعاً و کرہاً (حم سجدہ - ۱۱) اس پر چلنے کی پابند ہے اور انسان کو خود اپنی مرضی سے اسی راہ پر چلنا ہے۔

قرآن نے جس طرح فرد کے ذاتی سفر کے لئے صراط مستقیم کے خطوط متعین کر دیئے ہیں، اسی طرح اجتماعی معاملات میں بھی صراط مستقیم کی وضاحت کے لئے یہ اہتمام کیا ہے کہ ایک طرف حقیقی تجربات کی شکل میں کچھ مثالیں ہمارے سامنے رکھ دی ہیں۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ کی حکمتیں بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے۔ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا (فتح - ۲) دوسری طرف کچھ ایسے بنیادی اصول بتائے ہیں جو بیشتر عملی معاملات کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور اگر انسان اپنے آپ کو مقام حیوانیت سے بلند کر کے مقام انسانیت پر پہنچالے تو وہ کبھی یہ سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا کہ کسی خاص اجتماعی معاملہ میں اسے کون سا رویہ اختیار کرنا چاہیئے جو اس کو نصرت الٰہی اور فتح کی طرف لے جانے والا ہو۔

۱۔ اس سلسلے کا پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ منفی ذہن کے تحت کبھی کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ ہمیشہ مثبت طور پر اپنا اصل مقصد سامنے رکھا جائے اور اپنی ساری اجتماعی منصوبہ بندی انھیں مثبت مقاصد کے مطابق کی جائے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (مائدہ — ۹)

اے ایمان لانے والو، اللہ کے لئے اٹھنے والے، عدل کی گواہی دینے والے بنو، اور کسی گروہ کی عداوت تم کو نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

غور سے دیکھئے تو تاریخ کی بیشتر ناکامیوں کا سبب یہی ملے گا کہ ضد، نفرت، بغض، جھنجھلاہٹ اور مخالفت سے متاثر ہو کر کسی کے خلاف اقدام کیا گیا۔ جب بھی کوئی شخص یا گروہ اس قسم کے جذبات سے متاثر ہو کر اپنا عملی نقشہ بنائے گا، وہ لازماً غلط راہ پر پڑ جائے گا۔ اس کے برعکس اگر یہ بنیادی ہدایت سامنے ہو اور آدمی اپنی عقل کو حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانی سطح پر پہنچا چکا ہو تو ممکن نہیں کہ وہ منفی جذبات کا شکار ہو۔ وہ لازماً مثبت بنیادوں پر اپنی منصوبہ بندی کرے گا اور جو منصوبہ بندی مثبت بنیادوں پر کی جائے وہ کبھی ناکام نہیں ہوتی۔

اجتماعی معاملات میں صراط مستقیم کا یہ بنیادی اصول صلح حدیبیہ کے ذیل میں نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (فتح - ۲۶)

جب رکھی منکروں نے اپنے دل میں ضد، نادانی کی ضد پھر اللہ نے اپنی طرف سے رسول اور مومنوں کو تحمل عطا کیا اور ان کو تقویٰ کے کلمہ پر جمائے رکھا اور وہ اس کے حق دار اور لائق تھے اور اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔

گویا اسلام کی اجتماعی جدوجہد کو صراط مستقیم پر رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ فریق ثانی کی طرف سے خواہ کتنی ہی حمیت جاہلیہ کا مظاہرہ ہو، ہم اس کو برداشت کرتے ہوئے تقوی کے کلمہ کو مضبوطی سے پکڑے رہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ حریف کے رویہ سے متاثر ہو کر جوابی ذہن یا ردعمل کی نفسیات کے تحت ہرگز کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ بلکہ مثبت نفسیات کے ساتھ خود اپنے متعین اصولوں اور اپنے مستقل مقاصد کی روشنی میں اپنا اجتماعی پروگرام بنایا جائے اور حال کے بجائے ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھی جائے۔

۲۔ اسی طرح اجتماعی ہدایت کا ایک اور اہم اصول یہ ہے کہ سبیل رب (نحل - ۶۹) کی پیروی کی جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں درخت کی مثال دی گئی ہے۔ درخت اولاً زمین میں اپنی جڑ جماتا ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے اوپر اٹھتا ہے۔ اسی طرح ملت کی تعمیر میں اندرونی استحکام کو اولین اہمیت دی جائے۔ جڑ مضبوط کرنے سے پہلے ہرگز کوئی خارجی اقدام نہ کیا جائے۔ تلقین کی گئی ہے کہ درخت کو اگانے کے سلسلے میں قدرت نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اسی کو تم اپنی ملی تعمیر کے سلسلے میں اختیار کرو:

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّھَا وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ وَمَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیْثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیْثَۃِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَھَا مِنْ قَرَارٍ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ

ابراہیم: ۲۴-۲۷

تو نے نہ دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال۔ کلمہ طیبہ ایسا ہے جیسا ایک ستھرا درخت، اس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں بلند ہیں، دیتا ہے پھل اپنا ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے۔ اور اللہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں اور کلمۂ خبیثہ کی مثال خراب درخت کی سی ہے کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے، نہیں اس کو ٹھہراؤ۔ اللہ ثابت رکھتا ہے ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں اور بھٹکا دیتا ہے ظالموں کو۔ اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

غور کیجئے تو وہ ساری مثالیں جن میں کوئی گروہ اپنی ناکامیوں کا الزام کسی دوسرے گروہ کے سر رکھ رہا ہے، وہ حقیقۃً صرف اس بات کا اعلان ہے کہ اس نے "شجرۂ خبیثہ" کی باغبانی کی تھی۔ اگر وہ اپنی اجتماعی تعمیر کو شجرۂ طیبہ کے اصول پر کھڑی کرتا تو ناممکن تھا کہ بالآخر اس کے حصہ میں یہ فریاد و ماتم آئے کہ "فلاں گروہ نے میرے درخت کو اکھاڑ لیا ہے"۔

۳۔ ۲ھ میں جب کہ غزوۂ بدر پیش آیا، مسلمانوں کے سامنے دو نشانے تھے۔ ایک قریش کا تجارتی قافلہ جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے مکہ واپس ہو رہا تھا۔ اس قافلہ میں ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا سامان تھا۔ دوسری طرف قریش کا ایک ہزار کا لشکر جو مدینہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور جس میں ابوجہل اور دوسرے بڑے بڑے

سرداران قریش شامل تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا تو کچھ مسلمانوں کا رجحان یہ سامنے آیا کہ تجارتی قافلہ کی طرف بڑھا جائے۔ قریبی تاریخ میں اس رائے کا پس منظر بھی موجود تھا۔ کیوں کہ ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک یہ لائحہ عمل رہا تھا کہ مشرکین مکہ کے تجارتی قافلے جو شام کی طرف جاتے تھے، ان پر حملہ کر کے دشمن کی اقتصادی طاقت توڑ دی جائے اور مسلمانوں کی مالی حالت مضبوط کی جائے۔ ہجرت کے پہلے سال ابواء، بواط، عشیرہ وغیرہ چھوٹے چھوٹے غزوات جن کا ذکر احادیث وسیر کی کتابوں میں ملتا ہے، اسی سلسلے میں وقوع پذیر ہوئے۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بڑے بڑے صحابہ کی رائے یہ تھی کہ قریش کے لشکر کا مقابلہ کیا جائے:

إِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَ
تَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَ
يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ
دَابِرَ الْكَافِرِينَ (انفال ۔ ۷)

جب وعدہ کر رہا تھا اللہ دو جماعتوں میں سے کہ ایک تمھارے ہاتھ آجائے گی اور تم چاہتے تھے کہ جس میں تم کو کانٹا نہ لگے وہ ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو حق کر دکھائے اپنے کلمات سے اور منکرین کی جڑ کاٹ دے۔

عقل حیوانی کبھی سمجھ نہیں سکتی کہ مدینہ کے لٹے پٹے لوگ جو معاشیات کے انتہائی طور پر محتاج تھے، بے زور تجارتی قافلہ کو چھوڑ کر اپنے سے تین گنا فوجی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلیں، صرف وہ شخص جو مقام انسانیت پر ہو، وہی سمجھ سکتا تھا کہ فوجی طاقت کو توڑنا کتنے عظیم نتائج کا حامل ہے۔ حتیٰ کہ خود معاشیات کا حصول بھی، دور رس معنوں میں، اسی طریق پر ممکن ہے نہ کہ فوجی لشکر کو چھوڑ کر تجارتی قافلے کی طرف دوڑنے میں۔ اس میں یہ تعلیم ہے کہ فوری مفادات کی بنیاد پر اقدام نہ کیا جائے بلکہ اپنے اقدام کے سلسلے میں ہمیشہ دور تر مفادات کو سامنے رکھا جائے اور اس کا بھی بنیادی اصول احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو نہ کہ دنیوی مقاصد کو حاصل کرنا۔ کیوں کہ دنیوی مقاصد تو اپنے آپ آتے ہیں۔ پھر ان کو نشانہ بنانے کی کیا ضرورت۔

۴۔ اجتماعی عمل کو صراط مستقیم پر چلانے کا ایک اصول یہ ہے کہ بروقت جو مواقع حاصل ہیں، ان کو استعمال کیا جائے نہ یہ کہ مستقبل کے حوصلوں کی بنیاد پر بڑے بڑے اقدامات کئے جاتے رہیں۔ اس اصول پر عمل کرنے کی ایک مثال صحیفہ مدینہ (سنہ ۱ھ) ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں اہل ایمان کے علاوہ مشرکین اور یہود کی بھی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ اگرچہ مشرکین اور یہود کے لئے مستقبل میں یہ مقدر تھا کہ مدینہ سے ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر اول مرحلہ میں آپ نے اس کے مقابلہ میں ایک کمتر درجہ کی چیز پر قناعت اختیار کی۔ آپ نے ایک صحیفہ جاری کیا جس میں ان کی موجودہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مسلمان اپنے طریقے پر رہیں گے اور یہود اپنے طریقے پر (للیہود دینھم وللمسلمین دینھم) یہ اصل مقصود یا اپنے اسلامی حوصلہ کے اعتبار سے "دوسرے درجے کی چیز" تھی۔ مگر آپ نے پہلے مرحلہ میں اسی پر قناعت کر لیا۔ اور بعد کے نتائج نے اس تاریخی کلیہ کی تصدیق کر دی کہ جو شخص پہلے مرحلہ میں "دوسری بہتر چیز" پر قناعت کرتا ہے وہ بالآخر "پہلی بہتر چیز" کو پا کر رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص پہلے ہی دن "پہلی بہتر چیز" کے لئے دوڑ پڑے، اس کے حصہ میں نہ پہلی بہتر چیز آتی ہے نہ دوسری بہتر چیز۔

۵۔ حریف کے مقابلہ میں جوابی کارروائی سے آخری حد تک پرہیز کیا جائے۔ اہل اسلام کے سامنے جو مستقل پروگرام ہونا چاہئے وہ یہ کہ مواقع حیات پر اس طرح قبضہ کیا جائے کہ فریق ثانی کے لئے میدان تنگ ہوتا چلا جائے ۔
حضرت علی کی ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

والجاؤھم الی مضائق الطریق (ترمذی) ان کو راستہ میں تنگ جگہ چلنے پر مجبور کر دو۔

یہی حقیقت قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے :

اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا اَفَھُمُ الْغٰلِبُوْنَ انبیاء ۔ ۴۴
کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو گھٹاتے جا رہے ہیں اس کے کناروں سے، کیا اب بھی وہی جیتنے والے ہیں ۔

اس آیت میں اس صورت حال کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام اپنی خاموش تبلیغ کے ذریعے مسلسل پھیل رہا ہے مکہ کی بہت سی اہم شخصیتیں مسلمان ہو چکی ہیں۔ مکہ کے اطراف کے قبائل (غفار، مزینہ، جھینہ) اسلام کے دائرہ میں آ چکے ہیں ۔ مدینہ جو اہل مکہ کی تجارتی شاہ راہ پر واقع ہے، اس کے دونوں قبائل (اوس و خزرج) مسلمان ہو چکے ہیں ۔ اس طرح مخالفین اسلام کی زمین دن بدن سکڑتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا دائرہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ اہل مکہ کے سامنے اس کے سوا کوئی راہ نہ ہوگی کہ وہ چاروں طرف کے دباؤ سے مجبور ہو کر اسلام کے آگے ہتھیار ڈال دیں ۔

قرآن میں طاقت کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر اس لئے نہیں کہ اس کو لازماً استعمال کیا جائے، بلکہ اس لئے کہ مخالفین اسلام پر رعب و دبدبہ قائم ہو (انفال ۔ ۶۰) اسی لئے پیغمبر اسلام نے فرمایا:

نصرت بالرعب علیٰ مسیرۃ شھر مجھے ایک مہینہ کی مسافت تک کے رعب سے مدد دی گئی ہے۔

یعنی مجھے ایسا طریق عمل بتایا گیا ہے جس میں استعمال طاقت کے بجائے اکثر اظہار طاقت کافی ہوتا ہے اور محض رعب و وقار کے ذریعہ فتوحات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اسی طریق عمل کا نتیجہ تھا کہ آپ کی زندگی میں اگرچہ ۸۰ غزوات پیش آئے مگر باقاعدہ جنگ و قتال کی نوبت صرف ۹ غزوات میں آئی۔ بقیہ غزوات زیادہ تر رعب و دبدبہ کے ذریعے فتح ہوتے چلے گئے۔

موجودہ دور میں علوم کے پھیلاؤ اور صنعت و ٹکنالوجی کی ترقی نے اس طریق عمل کے لئے بے پناہ حد تک نئے مواقع پیدا کر دیئے ہیں۔ جاپان نے دوسری عالمی جنگ کے بعد اس طریقہ کو استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کے لئے جاپان میں عرصۂ حیات اس قدر تنگ ہوا کہ اس کو جاپان چھوڑ دینا پڑا۔ حالاں کہ جاپان نے امریکہ کے خلاف کوئی فوجی یا سیاسی طاقت استعمال نہیں کی تھی۔

۶۔ اس سلسلے کا آخری مگر اہم ترین اصول حقیقت پسندی ہے۔ عام انسانی طبائع کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز حقیقت پسندی ہوتی ہے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول نے اجتماعی جدوجہد کے لئے جو طریق عمل تجویز کیا ہے، اس کا انتہائی ناگزیر جزو حقیقت پسندی ہے۔ حقیقت پسندی کیا ہے۔ جذباتی ردعمل کے جوش میں اٹھ پڑنے کے بجائے عقلی فیصلہ کے تحت اقدام کرنا، ظاہری مرغوبات کے بجائے گہرے اسباب و عوامل کو سامنے رکھ کر کام کرنا، قریبی مفادات

کے بجائے دور تر مواقع کے پیش نظر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرنا۔ فوری کامیابیوں کے بجائے ان فیصلہ کن قوتوں کو نشانہ بنانا جن کا سرا ہاتھ آجانے کے بعد مخالف کا ہر وار بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی دعوت کو جس نہج پر چلایا، اس کو کسی ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو اس کے لئے حقیقت پسندی سے زیادہ موزوں لفظ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مکہ میں آپ کے سامنے حرم کعبہ میں ۳۶۰ بُت (بعض روایات کے مطابق اس سے زیادہ) رکھے ہوئے تھے۔ مگر ان کو حرم سے نکالنے کے لئے آپ نے کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ اطراف عرب کی "سامراجی حکومتوں" کے عزائم آپ کو معلوم تھے۔ مگر آپ نے اس کے خلاف کوئی "بیان" تک نہیں دیا۔ مکہ والوں نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا تو پُر جوش قائد کی طرح آپ نے اپنے کو شہادت کے لئے نہیں پیش کر دیا، بلکہ خاموشی سے مکہ چھوڑ کر چلے گئے۔ انصار کے وفد نے جب مکہ آکر آپ سے بیعت کی تو بیعت کی تکمیل کے بعد ان کے لیڈر نے کہا:

یا رسول اللہ! والذی بعثک بالحق ان شئت لنمیلن علیٰ اھل منی غدا باسیافنا	اے خدا کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم کل ہی اہل منیٰ پر اپنی تلواروں کے ذریعہ حملہ کر دیں۔

تہذیب سیرۃ ابن ہشام جلد ۱، صفحہ ۱۰۹

آپ نے فرمایا ہم کو اس کا حکم نہیں دیا گیا۔ تم لوگ اپنی منزل گاہوں کی طرف واپس جاؤ۔ خیبر مستقل طور پر آپ کے خلاف سازش کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ مگر اس وقت تک آپ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جب تک اہل مکہ سے یہ معاہدہ نہ ہو گیا کہ وہ آپ کے دشمنوں کے ساتھ شریک ہو کر آپ کے خلاف جنگ نہ کریں گے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کے لیڈروں نے اتنی زیادہ اشتعال انگیزی کی کہ ایک حضرت ابوبکر کو چھوڑ کر تمام صحابہ جوش اور غصہ میں بھر گئے۔ مگر آپ نے انتہائی صبر اور برداشت سے کام لیتے ہوئے صلح کے معاہدہ پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

قرآن میں اس صابرانہ اور حقیقت پسندانہ طریق عمل کو انتہائی اہمیت دی گئی ہے۔ سورۂ ہود کے آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ دوسرے لوگوں کی عارضی کامیابیاں تمھیں اس شبہ میں نہ ڈالیں کہ انھیں کا طریق عمل زیادہ مفید ہے۔ تم کو جو طریقہ تلقین کیا گیا ہے، اس پر جمے رہو۔ اسی قسم کے شبہ میں مبتلا ہو کر یہود اختلاف میں پڑ گئے اور دوسرے راستوں کی طرف جا نکلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صراط مستقیم ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ تم ہرگز ایسا کرنا۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ تمھیں آگ پکڑے اور تم خدا کی اس مدد سے محروم ہو جاؤ جو حقیقی کامیابی کی طرف پہنچانے والی ہے (ہود ۱۱۳-۱۱۴)

نصرت کا اصول

جو شخص صراط مستقیم پر ہو، اس کے لئے وعدہ ہے کہ اس کو اللہ کی نصرت حاصل ہو گی۔

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا	اور تاکہ اللہ تجھ کو صراط مستقیم کی ہدایت کرے اور مدد کرے تمھاری زبردست مدد۔

فتح — ۳

نصرت الٰہی جتنی یقینی ہے، اتنی ہی یقینی یہ بات ہے کہ استحقاق نصرت کے بغیر نصرت الٰہی کسی کو نہیں ملتی۔ یہ اللہ تعالےٰ

کی سنت ہے اور سنت اللہ میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی (فاطر ـ ۴۳)

اگر ایک شخص مقام اضطرار پر ہو تو صرف دعا ہی نصرت کو کھینچنے کے لئے کافی ہے:

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ — کون قبول کرتا ہے دعا مضطر کی جب کہ وہ پکارتا ہے اور اس کی مصیبت دور کر دیتا ہے۔ (نمل ـ ۶۲)

گویا جو شخص مضطر ہو، اس کے لئے مستحق نصرت ہونے کی شرط صرف کلمات دعا سے پوری ہو جاتی ہے اور خدا کی نصرت اسے پہنچ جاتی ہے۔ لیکن جو شخص یا گروہ مقام اضطرار پر نہ ہو، اس کے لئے دعا کے علاوہ دو مزید شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ وہ دعا کے موافق عمل کرے۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ — اس کی طرف چڑھتے ہیں کلمات پاکیزہ اور عمل صالح اس کو بلند کرتا ہے۔ (فاطر ـ ۱۰)

دعا کے لحاظ سے عمل صالح یا دوسرے لفظوں میں موافق عمل کیا ہے۔ یہ اس دعا سے متعین ہوتا ہے جو کسی معاملہ میں نصرت کو طلب کرنے کے لئے آدمی مانگ رہا ہو ـــــ اگر کوئی شخص قرآن کے اسرار و حکم جاننے کی دعا کر رہا ہو تو اس کے لئے اس دعا کے موافق عمل یہ ہوگا کہ وہ کتاب الٰہی میں تدبّر کرے (ص ـ ۲۹) کوئی شخص نصرتِ معاش کا طلب گار ہے تو اپنی دعا کے ساتھ اس کو معاش کی راہوں میں اپنی ممکن جدوجہد صرف کرنی ہوگی (جمعہ ـ ۱۰) اغیار کے خلاف نصرتِ رعب مطلوب ہے تو اپنے درمیان اتحاد پیدا کرنا ہوگا (انفال ـ ۴۶) اگر اعدائے اسلام پر نصرت فتح کی دعا کی جا رہی ہے تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ان کے اوپر دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا جائے اور اس کو اتمام حجت کی حد تک لے جانے کی کوشش کی جائے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی گروہ کو پوری طرح آگاہ کرنے سے پہلے ہلاک نہیں کرتا۔ (انعام ـ ۱۳۱)

نصرت کا استحقاق ثابت کرنے کے لئے دوسری ضروری چیز صبر ہے، یعنی جس کے خلاف خدا کی نصرت مانگی جا رہی ہے، اس کی ایذا پر صبر کیا جائے (ابراہیم ـ ۱۲) یہ صبر مذکورہ بالا ایجابی عمل کا سلبی پہلو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حریف کے خلاف کوئی بلیتا بانہ اقدام نہ کیا جائے، اس کے وار کو اس کی طرف لوٹانے کے بجائے اپنے اوپر لیا جاتا رہے۔ اس کی خدمت میں عرضداشت پیش کرنے کے بجائے اس کے ڈالے ہوئے مصائب کو برداشت کیا جائے، اس سے مطالبہ کرنے کے بجائے خاموش مقاومت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ان شرائط کے ساتھ جو نصرت مانگی جائے، اس کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ اہل اسلام اگر ۲۰ کی تعداد میں ہوں تو اہل باطل کے دو سو آدمیوں پر غالب آئیں گے (انفال ـ ۶۵) یہ تناسب اس سے بھی کم ہو سکتا ہے، جیسا کہ اسلامی تاریخ کے متعدد واقعات سے ثابت ہے۔ مگر بنیادی بات یہ ہے کہ دونوں گروہوں کے درمیان جو فرق ہو، وہ باعتبار کمیت ہو نہ کہ باعتبار نوعیت۔ یعنی اہل باطل جس چیز میں "دو سو" ہوں، اہل حق کو اسی چیز میں "بیس" ہونا چاہئے نہ کہ کسی اور چیز میں۔ مثال کے طور پر اہل باطل اگر دو سو بندوقوں سے مسلح ہوں تو اہلِ اسلام کے پاس بھی بیس بندوقیں

ہونی چاہئیں۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایک طرف دو سو بندوقیں ہوں اور دوسری طرف بیس تلواریں تو یہ وعدہ متحقق نہ ہوگا۔ کیونکہ اس دوسری صورت میں فرق کمیت کا نہ رہا، نوعیت کا ہو گیا۔ اسی طرح اگر اہل اسلام کے پاس روایتی علم ہو اور اہل باطل کے پاس سائنسی علم۔ اہل اسلام جوش سے مسلح ہوں اور اہل باطل نے ہوش کا خزانہ جمع کر رکھا ہو، اہل اسلام کے پاس زمانہ سے بے خبری ہو اور اہل باطل کے پاس زمانہ سے آگاہی، اہل اسلام کے پاس اختلاف کا سرمایہ ہو اور اہل باطل کے پاس اتحاد کا۔ اہل اسلام کے پاس بے ترتیبی ہو اور اہل باطل کے پاس منصوبہ بندی، اہل اسلام قدیم قوتوں کے مالک ہوں اور اہل باطل جدید قوتوں کے تو اہل اسلام کو کبھی یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں نصرت خداوندی کے مستحق قرار پا سکتے ہیں، کیوں کہ ان تمام صورتوں میں دونوں گروہوں کے درمیان نوعی فرق ہے اور جب نوعی فرق پایا جائے تو کسی بھی تعداد پر کوئی نصرت نازل نہیں ہوتی۔ جب بھی ایسا ہو کہ دونوں گروہوں کے درمیان فرق باعتبار نوعیت ہو جائے تو اہل اسلام کا پہلا کام یہ ہوگا کہ اس کو ختم کر کے کمیت کی سطح پر لے آئیں۔ اس کے بعد ہی وہ نصرت الٰہی کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔

"صراط مستقیم پر چلنے والا خدا کی مدد سے کامیاب ہوتا ہے"۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو نقصان نہیں اٹھانا پڑتا۔ جدوجہد کے دوران میں بلاشبہ اس کو بھی اسی طرح کے نقصانات اور وقتی ہزیمتوں سے سابقہ پیش آتا ہے جس طرح فریق ثانی کو پیش آتا ہے (آل عمران — ۱۴۰) تاہم آخری کامیابی اسی گروہ کو ملتی ہے جو خدا کی صراط مستقیم کو وفاداری کے ساتھ پکڑ لے اور اس پر پوری طرح قائم ہو جائے۔

اسلام کی تاریخ میں مسلمانوں کو متعدد بار نقصانات سے سابقہ پیش آیا۔ اُحد (شوال ۳ھ) میں ایک جنگی ہدایت کی نادانستہ خلاف ورزی سے مسلمانوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ حنین (شوال ۸ھ) میں مسلمانوں کا جاسوسی نظام مکمل نہ تھا۔ اسلامی لشکر جب وادی میں اتر گیا تو اس کے دونوں طرف پہاڑیوں میں چھپے ہوئے دشمن نے اسلامی لشکر کو تیروں کی زد میں اس طرح لے لیا کہ ان کے پاس بچاؤ کی کوئی سبیل نہ تھی۔ طائف کا محاصرہ (ذی قعدہ ۸ھ) جس کو تین ہفتہ بعد نقصان اٹھا کر واپس لینا پڑا، اور موتہ (جمادی الاول ۸ھ) جس میں تین ہزار مسلمانوں میں سے ۷۰۰ شہید ہو گئے اور اسلامی کمانڈر نے بہترین جنگی حکمت عملی یہ سمجھی کہ بقیہ کو بچا کر مدینہ واپس لے جائیں، ان دونوں غزوات میں پیشگی یہ اندازہ نہ کیا جا سکا تھا کہ حریف کی تیاری کی نوعیت کیا ہے۔

تاہم قرآن کے وعدے کے مطابق لوگوں کو یقین تھا کہ یہ وقتی ہزیمتیں ہیں جو انسانی جدوجہد میں بہرحال پیش آتی ہیں۔ عام طور پر مسلمانوں میں یہ ذہنی فضا بن گئی تھی کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کا کام آجانا نقصان کی بات نہیں۔ کیوں کہ مرنے والا خود تو مر کر جنت میں پہنچ جاتا ہے اور اس کی قربانی زندہ رہنے والوں کے لئے نصرت الٰہی کا وہ استحقاق پیدا کرتی ہے جو ان کے لئے فتح کا نیا دروازہ کھول دیتی ہے۔ خلافت فاروقی کے زمانہ میں جب ربعی بن عامر رستم کے دربار میں گئے اور اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو اس سلسلہ میں انھوں نے کہا، ہم اس وقت

تک مقابلہ کرتے رہیں گے جب تک خدا کے وعدے (موعود اللہ) کو نہ پہنچ جائیں۔ اس نے کہا خدا کا وعدہ کیا ہے۔ ربعی بن عامر نے جواب دیا:

الجنۃ لمن مات علیٰ قتال من ابیٰ والظفر لمن بقی (البدایہ والنہایہ)	جنت اس کے لئے جو منکرین سے لڑتے ہوئے شہید ہوا اور فتح اس کے لئے جو باقی رہا۔

اس میں شک نہیں کہ عزم اور وفاداری کا جو معیار پیغمبر اسلام کے اصحاب نے دکھایا، اگر وہ معیار کسی گروہ میں پیدا ہو جائے تو خدا کی نصرت یقینی ہو جاتی ہے۔ اور خدا کی نصرت ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب بیعت کرتے تو یہ سمجھ کر کرتے کہ اسلام کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تقاضوں کو آخری حد تک نبھایا جائے، خواہ اس راہ میں اپنے کو فنا کر دینا پڑے۔ بیعت ان کے لئے موت کے ہم معنی تھی:

اخرج البخاری عن سلمۃ رضی اللہ عنہ قال: بایعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم عدلت الی ظل الشجرۃ۔ فلما خف الناس قال: یا ابن الاکوع الا تبایع، قال قلت: قد بایعت یا رسول اللہ، قال ایضا۔ فبایعتہ الثانیۃ۔ فقلت لہ یا ابا مسلم! علی ای شئ کنتم تبایعون یومئذ، قال علی الموت	حضرت سلمہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ پھر ایک درخت کے سایہ میں چلا گیا۔ جب مجمع کم ہوا، آپ نے فرمایا اے ابن الاکوع! تم بیعت نہیں کرتے۔ میں نے کہا اے خدا کے رسول، میں بیعت کر چکا، فرمایا پھر کر لو۔ چنانچہ میں نے دوبارہ آپ سے بیعت کی۔ راوی کہتے ہیں، میں نے حضرت سلمہ سے پوچھا تم لوگ ان دنوں کس چیز پر بیعت کرتے تھے۔ انھوں نے کہا موت پر۔

ان کے جذبۂ اطاعت کا یہ عالم تھا کہ جو کہا جاتا اسے فوراً کرنے کے لئے تیار ہو جاتے:

عن ابی ثعلبۃ الخشنی رضی اللہ عنہ قال: کان الناس اذا نزلوا تفرقوا فی الشعاب والاودیۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان تفرقکم فی الشعاب والاودیۃ انما ذلکم من الشیطان فلم ینزلوا بعد ذلک منزلا الا انضم بعضھم الی بعض حتی لو بسط علیھم ثوب لوسعھم	حضرت ابو ثعلبہ خشنی کہتے ہیں۔ رسول اللہ کے اصحاب سفروں میں کسی مقام پر اترتے تو وہ گھاٹیوں اور وادیوں میں منتشر ہو جاتے۔ آپ نے فرمایا وادیوں اور گھاٹیوں میں تمھارا منتشر ہو جانا شیطان کی جانب سے ہے۔ اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ لوگ جب کہیں اترتے تو ایک دوسرے سے ملے رہتے حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے اوپر ایک کپڑا پھیلا دیا جائے تو سب اس کے نیچے آ جائیں گے۔

جب وہ اسلام میں داخل ہو گئے تو اپنی کسی چیز کو اس سے محفوظ نہ رکھا۔ جنگ بدر سے پہلے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی رائے پوچھی تو حضرت سعد بن معاذ نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا:

یا رسول اللہ! خُذْ من اموالنا ماشئت واعطنا	اے خدا کے رسول! ہمارے مالوں میں سے آپ جو

تک مقابلہ کرتے رہیں گے جب تک خدا کے وعدے (موعود اللہ) کو نہ پہنچ جائیں۔ اس نے کہا خدا کا وعدہ کیا ہے۔ ربعی بن عامر نے جواب دیا:

الجنۃ لمن مات علیٰ قتال من ابیٰ والظفر لمن بقی (البدایہ والنہایہ)	جنت اس کے لئے جو منکرین سے لڑتے ہوئے شہید ہوا اور فتح اس کے لئے جو باقی رہا۔

اس میں شک نہیں کہ عزم اور وفاداری کا جو معیار پیغمبر اسلام کے اصحاب نے دکھایا، اگر وہ معیار کسی گروہ میں پیدا ہو جائے تو خدا کی نصرت یقینی ہو جاتی ہے۔ اور خدا کی نصرت ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب بیعت کرتے تو یہ سمجھ کر کرتے کہ اسلام کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تقاضوں کو آخری حد تک نبھایا جائے، خواہ اس راہ میں اپنے کو فنا کر دینا پڑے۔ بیعت ان کے لئے موت کے ہم معنی تھی:

اخرج البخاری عن سلمۃ رضی اللہ عنہ قال: بایعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم عدلت الی ظل الشجرۃ۔ فلما خف الناس قال: یا ابن الاکوع الا تبایع، قال قلت: قد بایعت یا رسول اللہ، قال ایضا۔ فبایعتہ الثانیۃ۔ فقلت لہ یا ابا مسلم! علی ای شئ کنتم تبایعون یومئذ، قال علی الموت	حضرت سلمہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ پھر ایک درخت کے سایہ میں چلا گیا۔ جب مجمع کم ہوا، آپ نے فرمایا اے ابن اکوع! تم بیعت نہیں کرتے۔ میں نے کہا اے خدا کے رسول، میں بیعت کر چکا، فرمایا پھر کر لو۔ چنانچہ میں نے دوبارہ آپ سے بیعت کی۔ راوی کہتے ہیں، میں نے حضرت سلمہ سے پوچھا تم لوگ ان دنوں کس چیز پر بیعت کرتے تھے۔ انھوں نے کہا موت پر۔

ان کے جذبۂ اطاعت کا یہ عالم تھا کہ جو کہا جاتا اسے فوراً کرنے کے لئے تیار ہو جاتے:

عن ابی ثعلبۃ الخشنی رضی اللہ عنہ قال: کان الناس اذا نزلوا تفرقوا فی الشعاب والاودیۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان تفرقکم فی الشعاب والاودیۃ انما ذلکم من الشیطان فلم ینزلوا بعد ذلک منزلا الا انضم بعضھم الی بعض حتی لو بسط علیھم ثوب لوسعھم	حضرت ابو ثعلبہ خشنی کہتے ہیں۔ رسول اللہ کے اصحاب سفروں میں کسی مقام پر اترتے تو وہ گھاٹیوں اور وادیوں میں منتشر ہو جاتے۔ آپ نے فرمایا وادیوں اور گھاٹیوں میں تمہارا منتشر ہو جانا شیطان کی جانب سے ہے۔ اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ لوگ جب کہیں اترتے تو ایک دوسرے سے ملے رہتے حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے اوپر ایک کپڑا پھیلا دیا جائے تو سب اس کے نیچے آ جائیں گے۔

جب وہ اسلام میں داخل ہو گئے تو اپنی کسی چیز کو اس سے محفوظ نہ رکھا۔ جنگ بدر سے پہلے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی رائے پوچھی تو حضرت سعد بن معاذ نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا:

یا رسول اللہ! خذ من اموالنا ما شئت واعطنا	اے خدا کے رسول! ہمارے مالوں میں سے آپ جو

ماشئت وما اخذت منا کان احب الینا مما ترکت

چاہیں لے لیں اور جتنا چاہیں ہمیں دیں، اور جو آپ ہم سے لیں گے وہ ہمیں اس سے زیادہ محبوب ہوگا جو آپ ہمیں عطا کریں گے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو ہر قسم کے تحفظات اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے اپنے کو آزاد کر کے خدا کے دین میں داخل ہوتے ہیں ایسے لوگ اگر چند سو کی تعداد میں بھی اکٹھا ہو جائیں تو وہ تاریخ انسانی کو ایسا دھکا دے سکتے ہیں جس کے اثرات اس وقت تک ختم نہ ہوں جب تک وہ دور ہی ختم نہ ہو جائے جس میں وہ دھکا دیا گیا تھا۔

اسلام کا طریقِ دعوت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ (شوریٰ — ۱۳)

اللہ نے تمھارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور جس کی وحی ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا۔ یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ مشرکوں پر وہ بات بہت گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلاتے ہو

اقامت دین کی اس آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ "دین کو قائم کرو، باطل کو مت قائم کرو" بلکہ یہ فرمایا کہ "دین کو قائم کرو، دین میں متفرق نہ ہو"، جس حالت کو اختیار کرنے کا حکم ہے اور جس حالت سے منع فرمایا گیا ہے دونوں، آیت کے الفاظ کے مطابق، خود دین سے متعلق حالتیں ہیں۔ اور ان دونوں حالتوں میں سے ایک دینی حالت کو چھوڑنے اور دوسری دینی حالت کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا اس آیت میں جو حکم ہے وہ اقامتِ باطل کے مقابلہ میں اقامت دین کا نہیں ہے بلکہ تفریق فی الدین کے مقابلہ میں اقامتِ دین کا ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں دین سے مراد صرف اساسی دین ہے۔ کیوں کہ اساسی دین تمام انبیاء کے درمیان یکساں تھا اور اسی میں سب کی مشترک پیروی کی جا سکتی ہے۔ تفصیلی شریعت قرآن کی تصریح (لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا) کے مطابق ان کے درمیان مختلف تھی۔ اس لئے تفصیلی شریعت میں بیک وقت سارے نبیوں کی پیروی ممکن نہیں۔

تفصیلی شریعت میں نبیوں کے درمیان جو فرق تھا وہ کسی ارتقائی تشریع کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ حالات اور دعوتی مراحل میں فرق کی بنا پر تھا۔ یہ فرق مختلف مسلم گروہوں کے درمیان آج بھی ہے اور ہمیشہ پایا جاتا رہے گا۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دین کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جو دائمی طور پر یکساں حالت میں مطلوب ہے۔ دوسرا وہ جو حالات کے تابع ہوتا ہے۔ پہلا حصہ اساسی تعلیم سے متعلق ہے اور اس کو قرآن میں الدین (شوریٰ) کہا گیا ہے۔ دوسرا حصہ شرعۃ اور منہاج (مائدہ ۴۸) کا ہے۔ یعنی فرعی قوانین اور طریق کار۔ پہلے حصۂ دین کو قرآن میں سبیل (راستہ) سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے حصۂ دین کو سُبُل (راستے) کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا حصہ ہمیشہ ایک رہتا ہے، وہ ہر زمانہ کے لئے واحد شاہ راہ ہے۔ اس کے برعکس دوسرے حصۂ دین کا تعلق حالات سے ہے اور اس میں ایک سے زیادہ صورتوں کی گنجائش رہتی ہے۔ حکم ہے کہ دعوت و اقامت کا موضوع الدین کو بناؤ، سُبل متفرقہ کو مت بناؤ۔ متفق علیہ دین کو قائم کرنے میں لگو، مختلف فیہ دین کے پیچھے پڑ کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔

قرآن میں مختلف مقامات پر اہلِ ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ نے تمھارے لئے عمل کی ایک

شاہراہ مقرر کردی ہے۔ تم اسی پر چلو، اِدھر اُدھر کے راستوں پر مت چلو۔ ورنہ تم اصل خدائی شاہراہ سے بھٹک جاؤ گے۔ اس شاہراہ کو قرآن میں دین قیم (بینہ) حبل اللہ (آل عمران) سواء السبیل (مائدہ) اور صراط مستقیم (انعام) وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انعام کے ۱۹ ویں رکوع میں چند بنیادی چیزوں کا حکم دینے کے بعد ارشاد ہوا ہے:

وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل	کہہ دو کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ، سو تم اسی پر چلو اور
فتفرق بکم عن سبیلہ ذٰلکم وصّٰکم بہ لعلکم	دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ تم کو اصل راہ سے
تتقون (انعام - ۱۵۳)	جدا کر دیں گی۔ اللہ تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم متقی بنو۔

اس آیت میں متفرق راستے (سُبل) سے مراد کفر و شرک کے راستے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ راستے ہیں جو دین میں دین کے نام پر نکالے جاتے ہیں (قال مجاهد السبل البدع، قرطبی)۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے جو کچھ مطلوب ہے وہ واضح الفاظ میں قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ قرآنی تعلیمات عملاً زندگی میں کس طرح متشکل ہوتی ہیں، اس کا واضح نمونہ رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کی زندگیوں میں موجود ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے اسی ثابت شدہ الدین پر قائم رہے۔ اس کے سوا دین میں ایسی باتیں نکالنا جو قرآن اور سنت سے بلا اختلاف ثابت نہ ہوں، اِدھر اُدھر کے راستوں پر بھٹکنا ہے جو آدمی کو اصل خدائی راستہ سے دور کر دیتا ہے۔ بطور خود آدمی سمجھتا ہے کہ وہ دین پر چل رہا ہے، حالانکہ اصل خدائی دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

دین اور شریعت کا فرق

الدین کیا ہے۔ یہ توحید ہے۔ یعنی ایک ہستی کو خالق و مالک ماننا، اسی کو اپنی تمام توجہات کا مرکز و محور بنانا، اسی کو اپنا سب کچھ سمجھنا، اسی کے آگے اپنے آپ کو جھکا دینا۔ یہی دین کا اصل سرا ہے۔ اس کا ہاتھ آنا تمام چیزوں کا ہاتھ آنا ہے۔ یہ اگر چھوٹ جائے تو کوئی بھی چیز آدمی کے حصہ میں باقی نہیں رہتی۔ خواہ ظاہرداری اور جدال کی سطح پر وہ اپنے آپ کو کتنا ہی دین دار ثابت کر رہا ہو۔ قرآن میں اقامت دین کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اسی الدین سے متعلق ہے۔ سورہ شوریٰ کی اس آیت میں اقامت دین سے مراد دراصل اقامت توحید ہے۔ یعنی بندے کو حقیقی معنوں میں خدا سے جوڑنا۔ اس کو وحدہٗ لاشریک کا سچا پرستار بنانا۔ اگر کوئی گروہ عبادت کے جزئی اور اختلافی مسائل پر فقہی نزاع کھڑی کرے یا دین قائم کرنے کے نام پر حکمراں جماعت سے سیاسی مقابلہ آرائی شروع کر دے تو یہ اقامت دین نہیں ہوگا بلکہ قرآن کے الفاظ میں سُبل متفرقہ کا اتباع ہوگا جو دین میں قطعاً ممنوع ہے۔ اس قسم کے ذیلی اور اختلافی امور پر معرکے کھڑے کرنا امت کی وحدت کو ختم کر دیتا ہے۔ امت فرقوں فرقوں میں بٹ کر اللہ کی اجتماعی نصرت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اقامت دین متفق علیہ مسئلہ کے لئے جدوجہد کرنے کا نام ہے نہ کہ مختلف فیہ مسائل کو لے کر مسلمانوں میں جدال و نزاع برپا کرنے کا۔

الدین سے مراد اصلاً اگرچہ توحید ہے۔ تاہم تبعاً اس میں وہ تمام مسائل شامل ہوتے چلے جائیں گے جو قرآن

سنت کے مطابق متفق علیہ ہوں اور جن میں ایک سے زیادہ رایوں کی گنجائش نہ ہو۔

مثلاً خدا کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کی ربوبیت کو لوگوں کے سامنے لایا جائے تو اس سے اُمت میں کوئی اختلاف واقع نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ عقائد محکم آیات واحادیث سے ثابت ہیں۔ اس کے برعکس اگر اس قسم کی بحثیں نکالی جائیں کہ خدا جسم رکھتا ہے یا نہیں۔ خدا کا عرش کہاں قائم ہے۔ خدا اپنا نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں۔ وغیرہ تو ان چیزوں میں کبھی تمام امت متفق الرائے نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ یہ تمام چیزیں استنباطی نوعیت کی ہیں۔ ان میں خوض کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی کا استنباط اس کو ایک رائے کی طرف لے جائے گا، کسی کا دوسری طرف۔ اس طرح مختلف تعبیرات وجود میں آئیں گی۔ ہر تعبیر کے گرد اہلِ ایمان کا ایک گروہ جمع ہوجائے گا۔ ایک دین کے اندر کئی دین بن جائیں گے ——— اگر اول الذکر معتقدات کی تلقین کی جائے تو یہ اقامت دین ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ثانی الذکر قسم کی اعتقادی موشگافیاں کی جانے لگیں تو یہ قرآن کے الفاظ میں تفریق فی الدین ہے۔ پہلی چیز مطلوب ہے اور دوسری چیز غیر مطلوب۔

یہی معاملہ ان امور کا ہے جن کو عبادات کہا گیا ہے۔ مثلاً نماز کے لئے وضو کا لازمی ہونا ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ مگر اس کے ارکان وشروط کی تعداد کے بارے میں ایک سے زیادہ رائیں ہیں۔ سنن ومستحبات کی تعداد تو درکنار فرائضِ وضو کی تعداد کے بارے میں بھی فقہاء متفق الرائے نہیں ہیں۔ حنفیہ کے نزدیک فرائض وضو چار ہیں، مالکیہ کے نزدیک سات، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک چھ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ) اب اگر ان اختلافی امور میں تعداد کے تعین کو بحث ومباحثہ کا موضوع بنایا جائے تو مسئلہ کے استنباطی ہونے کی وجہ سے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ ان کی تعداد کے بارے میں سب کی رائیں ایک ہوجائیں۔ اس قسم کی کوشش اتحاد عملاً صرف اختلاف وانتشار پیدا کرنے کا سبب بنے گی۔ یہ ایک امت کو کئی امتوں میں تقسیم کردے گی۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ امورِ اتفاقی کو مدارِ دعوت بناؤ، امورِ اختلافی کو مدار دعوت نہ بناؤ۔

یہی معاملہ اسلامی سیاست کا ہے۔ اگر ایک شخص ایسا کرے کہ اپنے حکمرانوں کی اصلاح کے لئے اللہ سے دعا کرے، ان سے انفرادی ملاقات کرکے ان کو خدا پرستی اور آخرت پسندی کی تلقین کرے۔ سنجیدہ انداز میں تحریر وتقریر کے ذریعہ اسلامی سیاست کے پہلوؤں کو نمایاں کرے تو اس سے امت میں کوئی تفریق وجود میں نہیں آئے گی۔ اس کے برعکس اگر کچھ لوگ احتجاج ومطالبات کا جھنڈا لے کر کھڑے ہوجائیں اور سیاسی محاذ بنا کر حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلانے لگیں تو اس کے نتیجہ میں لازماً یہ ہوگا کہ امت فرقوں فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک فرقہ حکمرانوں کا ساتھ دینے والوں کا ہوگا، دوسرا اس کو اقتدار سے ہٹانے والوں کا۔ اس طرح امت دو جتھوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑنا شروع کردے گی۔ اقامتِ دین کے نام پر تفریق فی الدین وجود میں آجائے گا۔

وضو کے آداب وقواعد کی "تعداد" کا معاملہ ایک استنباطی معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تعین کے بارے میں اہل علم کی کئی رائیں ہوگئی ہیں۔ یہی کیفیت امتِ مسلمہ کے سیاسی مشن کی ہے۔ یہ بھی تمام تر ایک استنباطی معاملہ ہے۔ کیوں کہ قرآن وحدیث میں کوئی نص ایسی موجود نہیں ہے جو سیاسی مشن کی نوعیت کو صراحۃً متعین کررہی ہو۔ اسی کا

یہ نتیجہ ہے کہ اس باب میں اہل علم کی رایوں میں تعدد پایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے ایک گروہ کا اصرار ہے کہ امت مسلمہ کا اصل نصب العین یہ ہے کہ حکومت اسلامی کے قیام کی جدوجہد کی جائے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ حکومت ایک امر موعود ہے۔ یعنی وہ اللہ کی طرف سے بطور انعام ملتی ہے نہ کہ اس کو نشانہ بنا کر براہ راست جدوجہد کرنے سے۔ ایک اور طبقہ یہ کہتا ہے کہ اصل کام اصلاح معاشرہ ہے نہ کہ اصلاح حکومت۔ معاشرہ کی اصلاح ہو جائے تو خود بخود صالح حکومت قائم ہو جائے۔ ان نظری اختلافات کے علاوہ حکومت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں شدید عملی نزاکتیں بھی شامل ہیں۔ جب بھی کسی برسر اقتدار گروہ کو اقتدار سے ہٹانے کی کوشش کی جائے گی، وہ لازماً اپنی طاقت کو اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کرے گا۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر باہمی قتل و خون وجود میں آئے گا۔ "اقامت دین" عملاً تفریق فی الدین پر منتج ہو گا۔ شریعت کا ایسا معاملہ جس میں ایک سے زیادہ نقطۂ نظر قائم کرنے کی گنجائش ہو اس میں تمام لوگوں کو ایک جھنڈے کے نیچے لانے کی کوشش ہمیشہ یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے کہ کئی جھنڈے وجود میں آجاتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ کے لئے حکم دے دیا گیا کہ اختلافی امور کو مدار تحریک نہ بناؤ۔ صرف اتفاقی امور پر اپنی تحریکوں کی بنیاد قائم کرو۔

انھیں اسباب کی بنا پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صدر اول کے بعد خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور ہزار برس تک چلتی رہی مگر صلحائے امت نے کبھی اس کے خلاف خروج نہیں کیا۔ انھوں نے حکمرانوں کو انفرادی نصیحتیں کیں مگر ان کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ یہ صرف عصر حاضر کی نظامی تحریکوں کی دین ہے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو سیاسی انقلاب کو امت مسلمہ کا اصل مشن بتاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہر مسلم ملک میں مسلمانوں کے دو حصے بن گئے ہیں۔ ایک حکمراں گروہ کا۔ دوسرا ان کے مخالف انقلابیوں کا۔ دونوں مسلم گروہوں کے درمیان لامتناہی سیاسی جنگ جاری ہے جو حرث اور نسل کی ہلاکت (بقرہ ۲۰۵) کے سوا کوئی اور تحفہ مسلمانوں کو نہیں دے رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے اقامت دین کے نام پر۔

سیاسی مشن کی نوعیت کے بارے میں علمائے امت کے درمیان کئی رائے کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ سیاسی تحریکات کا مسئلہ "سُبل متفرقہ" کے ذیل کا مسئلہ ہے نہ کہ "الدین" کے ذیل کا مسئلہ۔ اس لئے ایک مصلح کے لئے یہ تو درست ہے کہ وہ مسلم حکمرانوں کے اندر بگاڑ دیکھے تو ناصحانہ انداز سے اس کو اصلاح حال کی تلقین کرے۔ مگر دین کی اقامت کا نام لے کر حکمرانوں سے سیاسی ٹکراؤ کرنا کتاب اللہ سے انحراف کے ہم معنی ہے۔ یہ سبلِ متفرقہ کا اتباع ہے نہ کہ حقیقۃً اقامتِ دین۔

اس تقسیم کا یہ مطلب نہیں کہ دین میں صرف کلیات مطلوب ہیں، جزئیات مطلوب نہیں ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دین میں مطلوب حقیقی اور مطلوب اضافی کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ رکھا جائے۔ حقیقی حصہ میں تاکید و تشدید کرتے ہوئے اس کے اضافی اجزاء میں توسع اور رواداری کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کھانے کے سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ حرام و حلال کے درمیان فرق کیا جائے۔ صرف حلال چیزوں کو اپنی غذا بنایا جائے اور حرام چیز کو حلق کے نیچے نہ اتارا جائے۔ دوسرا مسئلہ آداب

طعام کا ہے۔ مثلاً ہاتھ سے کھایا جائے یا چمچہ سے۔ فرش پر کھایا جائے یا میز کرسی پر۔ جوتا پہن کر کھایا جائے یا جوتا آتار کر۔ وغیرہ۔ پہلا مسئلہ کلیات دین کا مسئلہ ہے۔ اللہ نے نام لے کر متعین طور پر بتا دیا ہے کہ بندے کے لئے کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام۔ مگر جہاں تک دوسری چیز کا تعلق ہے، اس میں اس قسم کی تعییناتی زبان استعمال نہیں کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور اصحاب کرام کی زندگیوں میں اس سلسلے میں ایک سے زیادہ نمونے ملتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص حرام وحلال کے منصوص احکام کو تاکید وتشدید کا موضوع بنائے تو امت میں فرقہ بندی کی نوبت نہیں آئے گی۔ کیونکہ یہ عملاً انھیں چیزوں کی تاکید وتشدید ہوگی جو تمام علمار امت کے درمیان پہلے سے متفق علیہ ہیں۔ رائے کی حد تک ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس اگر آداب طعام کے مسائل پر تاکید وتشدید کی جانے لگے تو ساری امت کا کسی ایک مسلک پر متحد الرائے ہونا ممکن نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہے گا کہ جوتا آتار کر کھانا ضروری ہے۔ کیوں کہ حدیث میں ہے اخلعوا نعالکم۔ دوسری طرف کسی اور کو یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ یہ کوئی جائز ناجائز کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ضرورت کا معاملہ ہے۔ جس میں سہولت ہو ویسا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پوری حدیث اس طرح ہے: اخلعوا نعالکم فانها اروح لاقدامکم (اپنے جوتے آتار دو کیونکہ اس میں تمھارے پیروں کے لئے زیادہ راحت ہے)۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ کلوا من الطیبات واعملوا صالحا (مومنون ۵۱) پر تو خوب زور دیا جائے۔ مگر آداب طعام کی نوعیت کی چیزوں میں روا داری اور توسع کا طریقہ اختیار کیا جائے ـــــــــ تحریک اہل حدیث اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں اسی کا نام تھی۔ اگرچہ بعد کو وہ اس مسلک پر قائم نہ رہ سکی۔ کم از کم عوام کی سطح پر یہی صورت حال ہے۔

دین کی تکمیل کیا ہے

موجودہ زمانہ میں "مکمل اسلامی انقلاب" کے علم برداروں اور "غیر مکمل حاملین دین" کے درمیان مختلف ملکوں میں جو تصادم جاری ہے، اس کی بنیاد دراصل "دین کامل" کا غلط نظریہ ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک کامل (تمدنی قوانین کے اعتبار سے کامل) دین ہے اس لئے دین کو قائم کرنے کا مطلب لازماً یہی ہے کہ اس کو ایک کامل تمدنی نظام کی حیثیت سے برپا کیا جائے۔ اگر کامل دین کا یہ مطلب ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ناقص دین تھا۔ کیوں کہ معلوم ہے کہ ان کو تمدنی ضوابط وقوانین سرے سے دیئے نہیں گئے اور اسی طرح دوسرے اکثر انبیاء کو۔ حالاں کہ قرآن میں صراحت ہے کہ تم کو بھی وہی دین دیا گیا ہے جو دوسرے نبیوں کو دیا گیا تھا اور اسی دین کو تمھیں قائم کرنا ہے (شوری ۱۳)

اصل یہ ہے کہ دین نام ہے پورے معنوں میں موحد بننے کا۔ دین کا کامل ہونا دراصل توحید کا کامل ہونا ہے۔ کوئی شخص جتنا زیادہ اپنے رب کو پالے اتنا ہی اس نے اپنے دین کو کامل کیا اور جس نے اپنے رب کو جتنا کم پایا اتنا ہی اس کا دین ناقص رہا۔ قانونی دفعات خواہ کتنی ہی زیادہ لکھ دی جائیں پھر بھی وہ دین کو مکمل نہیں کریں گی۔ مثال کے طور پر

قرآن میں اگر ساتویں صدی عیسوی کی دنیا سے متعلق سارے احکام وضوابط بالتفصیل درج کر دیئے جاتے جب بھی بہت سی قانونی باتیں لکھنے سے رہ جاتیں، جیسے سمندری قوانین، خلائی ضوابط وغیرہ۔ کیوں کہ ان مسائل کا اُس وقت کوئی وجود ہی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کامل کا یہ مطلب لیا جائے تو اسلام بھی دین کامل نظر نہ آئے گا۔

امیر ہمدانی کی مثال

مذکورہ اسلامی طریق کار کی ایک مثال کشمیر کی تاریخ میں پائی جاتی ہے۔ کشمیر کو عام طور پر لوگ اس کے قدرتی حسن کی وجہ سے جانتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں اس سے بھی زیادہ بڑی چیز موجود ہے۔ یہ اسلامی طریق کار کا وہ نمونہ ہے جو میر سید علی ہمدانی (۱۳۸۴-۱۳۱۴ء) کی زندگی میں ملتا ہے۔ موصوف نے، جن کو کشمیری عام طور پر "امیر کبیر" کہتے ہیں اپنے عمل سے ایک عظیم قابل تقلید نمونہ قائم کیا ہے جس کی مثال حالیہ صدیوں میں کم ملے گی۔ کشمیر اپنے قدرتی مناظر کی وجہ سے اگر جنت نظیر ہے تو اپنے تاریخی نمونہ کے ذریعہ وہ ہم کو اسلام کے طریق دعوت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۷) نے امیر کبیر کی بابت کہا تھا:

دستِ او معمار تقدیر امم

امیر کبیر کی بابت یہ الفاظ صد فی صد درست ہیں۔ موجودہ مسلم کشمیر زیادہ تر آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مگر امیر کبیر نے یہ کام "شمشیر و سناں"، یا "بازمانہ ستیز" کے ذریعہ نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ رہا ہے۔ انھوں نے یہ کامیابی "شمشیر و سناں" کو ترک کرکے حاصل کی۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ـــــــ اسلام کو زندہ کرنا چاہتے ہو تو مقابلہ آرائی کے ذہن کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دو، مذہبی اور سیاسی جھگڑے کھڑے کرنے سے مکمل پرہیز کرو۔ اس کے بعد تم کو خدا کی نصرتیں ملیں گی اور اسلام اور مسلمانوں کو عزت و سربلندی حاصل ہوگی۔

میر سید علی ہمدانی ایران کے رہنے والے اور تیمور لنگ (۱۴۰۵-۱۳۳۵ء) کے ہم عصر تھے۔ شاہ تیمور ان سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور ان کو ایران سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اب امیر کبیر کے لئے ایک راستہ یہ تھا کہ وہ تیمور لنگ کے خلاف جہاد کا نعرہ لگائیں اور ایران میں حکومت صالحہ قائم کرنے کی جدوجہد کریں خواہ اس کے نتیجہ میں ان کو شہید ہو جانا پڑے۔ مگر امیر کبیر نے سیاسی تصادم سے پرہیز کیا۔ وہ اپنے چالیس ساتھیوں کو لے کر اپنے وطن ہمدان سے نکل پڑے۔ افغانستان ہوتے ہوئے یہ قافلہ ۷۸۱ھ میں کشمیر پہنچا جس کو امیر کبیر اس سے پہلے ۷۶۲ھ میں سیاحت کے دوران دیکھ چکے تھے۔

کشمیر پہنچ کر دوبارہ موقع تھا کہ یہاں سے شاہ تیمور کے خلاف سیاسی تحریک چلائی جائے۔ تیمور کے معاصرین میں ایسے لوگ تھے جو سیاسی وجوہ سے اس سے بغض رکھتے تھے۔ امیر کبیر ان کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر تیموری اقتدار کو ختم کرنے کی مہم جاری رکھ سکتے تھے۔ مگر امیر کبیر نے اس قسم کی کسی بھی کارروائی سے مکمل پرہیز کیا۔ اسی طرح قیادت کا ایک اور راستہ ان کے لئے پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ یہ اس وقت کے کشمیری مسلمانوں کی اقلیت کے معاشی اور سماجی حقوق کا مسئلہ تھا۔ اس وقت کشمیر میں اگرچہ ایک مسلم خاندان کا راج تھا۔ مگر کشمیری مسلمان ریاست میں ایک کمزور اور غریب اقلیت

کی حیثیت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ ان سے جبراً بت خانوں کے نذرانے وصول کئے جاتے تھے۔ امیر کبیر ان کی طرف سے حقوق طلبی کی مہم چلا کر فی الفور مسلمانوں کے قائد بن سکتے تھے۔ مگر امیر کبیر نے اس قسم کی "ملی سیاست" سے بھی کوئی سروکار نہ رکھا۔

اسی طرح امیر کبیر کے لئے ایک راستہ یہ تھا کہ وہ "انسانیت" کے پیام بر بن کر اٹھیں اور ریاست کے مختلف فرقوں کو امن کے ساتھ رہنے کا وعظ سنائیں۔ ایسا کر کے وہ بہت جلد دونوں فرقوں کے درمیان ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کر سکتے تھے۔ کیوں کہ ہر وہ تحریک لوگوں کو بہت پسند آتی ہے جس میں حق و باطل کا مسئلہ چھیڑے بغیر رواداری اور میل جول کا اپدیش دیا گیا ہو۔ جس میں کوئی اپنے اوپر زد پڑتی ہوئی محسوس نہ کرے۔ مگر اس قسم کی تحریک جلسوں اور تقریروں کی سطح پر خواہ کتنی ہی کامیاب نظر آئے، عملی نتیجہ کے اعتبار سے وہ ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کام کا اسلامی دعوت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کا کام، اپنی ظاہری خوش نمائی کے باوجود، صرف مسائل دنیا کی طرف متوجہ کرنے کا کام ہے۔ جب کہ اسلامی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو مسائل آخرت کی طرف متوجہ کیا جائے۔

امیر کبیر کا پروگرام نہ شاہ تیمور کے خلاف ردعمل کے طور پر بنا اور نہ کشمیری مسلمانوں کے وقتی حالات سے متاثر ہو کر۔ اس وقت کشمیر میں ایک مسلم راجہ (سلطان قطب الدین) کی حکومت تھی۔ اس کے اندر بہت سی اعتقادی اور عملی خرابیاں موجود تھیں۔ آپ نے سلطان کو ناصحانہ انداز کے خطوط بھیج کر اصلاح حال کی طرف متوجہ کیا۔ تاہم آپ نے اس کو اقتدار سے ہٹانے اور اس کی جگہ صالح حکمراں لانے کی کوئی مہم نہیں چلائی۔ امیر کبیر نے ان تمام عوامل سے اوپر اٹھ کر سوچا اور خود اپنے مثبت فکر کے تحت اپنا پروگرام بنایا۔ پھر یہ پروگرام بھی کوئی کنونشن یا کانفرنس کا انعقاد نہ تھا۔ یہ تمام تر ایک خاموش عملی پروگرام تھا۔ وہ اور ان کے رفقاء ریاست کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور خاموشی کے ساتھ یہاں کے باشندوں میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔ انھوں نے کشمیریوں کی زبان سیکھی۔ یہاں کے حالات سے اپنے کو ہم آہنگ کیا۔ اجنبی دیس میں اپنے لئے جگہ بنانے کی مصیبتیں اٹھائیں۔ اس طرح صبر و برداشت کی ایک زندگی گزارتے ہوئے اپنے خاموش دعوتی مشن کو جاری رکھا۔

کشمیر میں اسلام

کشمیر میں اسلام کا ابتدائی داخلہ اگرچہ محمد بن قاسم (۹۶ - ۶۶ ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ تاہم ریاست میں اسلام کی نمایاں اشاعت غالباً سید بلبل شاہ قلندر ترکستانی کے وقت سے شروع ہوئی۔ سات سو سال پہلے کشمیر میں ایک بودھ راجہ رینچن شاہ کی حکومت (۲۳ - ۱۳۲۰ء) تھی۔ یہ راجہ سید بلبل شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اس زمانہ میں لوگ اپنے سرداروں کے دین پر ہوتے تھے۔ راجہ کو دیکھ کر کشمیریوں کی ایک تعداد مسلمان ہو گئی۔ حضرت بلبل شاہ صاحب فقہی مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے۔ چنانچہ اس وقت جو لوگ مسلمان ہوئے، ان کے اثر سے وہ حنفی مسلک کے مطابق عبادت کرنے لگے۔ میر سید علی ہمدانی کی تبلیغ سے جب کشمیری باشندے مسلمان ہونے لگے تو ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ "یہ نو مسلم کس فقہی مسلک پر عبادت کریں" حضرت امیر کبیر خود شافعی المسلک تھے اور اس وقت کشمیر میں جو مسلمان تھے وہ حنفی

المسلک۔ امیر کبیر اگر ان نومسلموں کو اپنے فقہی مسلک کی تلقین کرتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمانوں میں دو گروہ بن جاتے۔ ایک امیر کبیر کے ہاتھ پر اسلام لائے ہوئے لوگوں کا۔ دوسرا بقیہ کشمیری مسلمانوں کا۔ حنفی اور شافعی کا یہ جھگڑا نہ صرف دونوں کے مدرسوں اور مسجدوں کو الگ کر دیتا بلکہ اپنے اپنے فقہی مسلک کی صحت و افضلیت ثابت کرنے کی کوشش میں اصل تبلیغی کام پس پشت پڑ جاتا۔ کشمیری مسلمان دو جتھوں کی صورت اختیار کر کے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیتے۔ وہ قوت جو دینِ حق کی اشاعت میں صرف ہوتی آپس کے جھگڑوں میں برباد ہو جاتی۔ نسلیں گزر جاتیں مگر یہ اختلاف کبھی ختم نہ ہوتا۔

میر سید علی ہمدانی نے صرف اساسات دین کی تبلیغ کی۔ انھوں نے فقہی مسالک کی کوئی بحث نہیں چھیڑی۔ انھوں نے یہاں تک احتیاط کی کہ اپنا شافعی المسلک ہونا اپنے پیروؤں سے پوشیدہ رکھا۔ عام مسلمانوں کے ساتھ خود بھی حنفی طریقہ پر نماز پڑھتے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اسی کے مطابق عبادت کرنے کی تلقین کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر میں ان کو کام کرنے کے مکمل مواقع ملے۔ ان کو ہر طبقہ کا تعاون حاصل رہا۔ غیر متعلق مسائل کے الجھاؤوں سے وہ بالکل محفوظ رہے۔ اپنی دعوتی جدوجہد میں ان کو اتنی کامیابی ہوئی کہ کشمیر دائمی طور پر مسلم اکثریت کا علاقہ بن گیا۔ امیر کبیر اگر یہاں حنفی مسلک اور شافعی مسلک کی بحثیں چھیڑتے تو ان کو یہ کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور بالفرض اگر کوئی کامیابی ہوتی تو وہ بھی اس قیمت پر کہ ان کی آمد کشمیری مسلمانوں کو دو متحارب فریقوں میں بانٹ دینے کا سبب بن جاتی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ اس راہ پر چلیں ان کا کسی سے اختلاف نہیں ہوگا۔ بامقصد آدمی کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ خود امیر کبیر کے حالات بتاتے ہیں کہ ۷۲ سال کی عمر میں موضع پکھلی (کشمیر) کے کچھ شر پسند لوگوں نے آپ کو زہر دے دیا۔ اور اسی میں آپ کا انتقال ہوا۔ تاہم اس قسم کا اختلاف محض ذاتی وجوہ سے ہوتا ہے اور وہ داعی کو صرف ذاتی نقصان پہنچاتا ہے جب کہ ایک غیر دینی مسئلہ کو دینی بنانا دین میں فرقہ بندی کو جنم دیتا ہے جو اتنا بڑا جرم ہے کہ کسی گروہ سے وہ تمام نعمتیں چھن جاتی ہیں جو کتاب الٰہی کا حامل ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے مقدر کی گئی تھیں۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی کی زندگی اسلامی طریق کار کی نہایت کامیاب عملی مثال ہے۔ اپنی دعوتی جدوجہد میں انھوں نے جس چیز کو مرکز توجہ بنایا وہ توحید و آخرت کا مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ سیاسی مسئلے، معاشی مسئلے، فقہی مسئلے انھوں نے بالکل نہیں چھیڑے۔ وہ اصل دین پر یکسو رہے نہ کہ متفرقات دین پر۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے نزدیک سیاست اور معاش دین سے خارج تھی یا عبادت کی ادائگی میں آداب اور مناسک کے لحاظ کو وہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔ وہ ہر ایک کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اور ہر چیز کو انھوں نے بالفعل اختیار کیا۔ تاہم انھوں نے جس چیز کو دعوت و اقامت کا عنوان بنایا وہ متفق علیہ دین تھا نہ کہ سبل متفرقہ۔

امیر کبیر فقہ کی تمام شرائط کے مطابق مکمل نماز پڑھتے تھے مگر فقہی اختلافات کے پیچھے پڑنا، ایک مسلک کو غلط ثابت کر کے اس کی جگہ دوسرے مسلک کی ترجیح قائم کرنا، انھوں نے اپنا مشن نہیں بنایا۔ اسی طرح معاشیات کے سلسلے میں انھوں نے ایک راستہ اختیار کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ اور ان کے ساتھی زندہ کیسے رہ سکتے تھے۔ مگر معاشی مسائل کو حل کرنے

یا اس کو پوری ملت کا مشترک مسئلہ بنا کر اس کی بنیاد پر تحریک چلانے کا طریقہ انھوں نے اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح سیاست کا نعرہ نہ لگانے کے باوجود ان کی ایک سیاست تھی، بلکہ نہایت گہری سیاست تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کشمیر کو یہ مقام نہ ملتا کہ یہاں صرف مسلم وزارت بنتی ہے۔ دوسری وزارت بننے کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ کشمیر کو یہ سیاسی عطیہ تمام تر امیر کبیر کی دین ہے۔ اگرچہ معروف معنوں میں انھوں نے کوئی سیاسی پروگرام اپنی زندگی میں نہیں چلایا اور نہ کوئی ان کو "سیاسی لیڈر" کی حیثیت سے جانتا ہے ــــــ امیر کبیر ہر چیز کے پیچھے نہیں دوڑے۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ حقیقت کا سرا پکڑ لیا۔ اس کے بعد سب چیزیں خود بخود ان کی طرف آتی چلی گئیں۔

خلاصہ

دین میں اصل اہمیت کی چیز یہ ہے کہ آدمی شرک سے مکمل طور پر بچے اور صرف خدائے واحد کو اپنا مرکز توجہ بنائے۔ اسی سے پوری زندگی سدھرتی ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ اسی کی سب سے زیادہ تاکید کریں اور اسی کو دعوت و تبلیغ کی بنیاد بنائیں۔ اس کے بعد تفصیلی معاملات میں دین کے جو تقاضے مطلوب ہیں ان میں حالات کے مطابق کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ تاہم ان چیزوں کو دعوتی مہم کے طور پر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری نوعیت کے کسی مسئلہ کو جب آدمی مدارِ دعوت بناتا ہے تو گویا وہ ایک فرعی مسئلہ کو اساسی مسئلہ کے مقام پر رکھتا ہے۔ اس قسم کا کوئی عمل دین کے نظام کو درہم برہم کر دینے والا ہے۔

آپ ایک خاص فقہی مسلک کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں تو کیجئے۔ مگر اس کی بنیاد پر مسجد اور مدرسہ نہ بنایئے۔ آپ ایک طریقہ کے تقدس کے قائل ہیں تو قائل رہئے۔ مگر اس کو دوسروں کی اسلامیت ناپنے کا پیمانہ مت قرار دیجئے۔ کسی مسلم حکمران نے "بنیادی جمہوریت" کا نظام قائم کر رکھا ہے اور آپ اس کے مقابلہ میں "عوامی جمہوریت" کو صحیح سمجھتے ہیں تو ناصحانہ انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچایئے۔ مگر اس مسئلہ کو لے کر ملک کو سیاسی اکھاڑا مت بنایئے۔ اگر آپ کو نظر آتا ہے آپ کی ملت کے معاشی اور سماجی حقوق "پامال" ہو رہے ہیں تو لوگوں میں یہ جذبہ ابھاریئے کہ وہ قوت و امانت (قصص ۲۶) کے ذریعہ اپنا مسئلہ آپ حل کرنے کی کوشش کریں۔ مگر اس کو لے کر مفروضہ ظالموں کے خلاف احتجاج اور مطالبات کا طوفان برپا نہ کیجئے ــــ اس قسم کی ہر تحریک دین کے سبیلِ واحد کو چھوڑ کر سُبل منفرقہ پر دوڑنا ہے ایسی کوششیں خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ کی جائیں، عملاً صرف فساد برپا کرتی ہیں۔ وہ نہ صرف آدمی کو حقیقی خدا پرستی سے دور کر دیتی ہیں، بلکہ امت کو مختلف ٹولیوں اور جماعتوں میں تقسیم کر دینے کا باعث بنتی ہیں۔ اور امت کا تقسیم ہونا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ ایسے لوگوں سے اللہ کی اجتماعی نصرتیں اٹھا لی جاتی ہیں اور وہ اس وقت تک واپس نہیں آتیں جب تک امت اپنی تفریقات کو ختم کر کے دوبارہ امتِ واحدہ نہ بن جائے۔

نوٹ: یہ مقالہ جمعیۃ اہل حدیث جموں و کشمیر کے سالانہ اجلاس بمقام سری نگر کے موقع پر ۳۰ جولائی ۱۹۷۸ کو پڑھا گیا۔

سیرت: ایک تحریک کی حیثیت سے

پیغمبر اسلام کی جو سیرتیں لکھی گئی ہیں، ان کا انداز عام طور پر یہ ہوتا ہے گویا آمنہ کے پیٹ سے ایک پُرعجوبہ شخصیت نکلی اور اس نے پُراسرار طریقوں سے پورے عرب کو مسخر کر ڈالا۔ سیرت کی کتابیں انسانی تاریخ سے زیادہ کرامات و معجزات کی ایک طلسماتی داستان نظر آتی ہیں۔ یہ ذوق اتنا بڑھا کہ جن واقعات میں کوئی معجزاتی پہلو نہ تھا وہاں بھی لوگوں نے اپنے قوت تخیل سے کوئی نہ کوئی چیز ڈھونڈ نکالی۔ مثال کے طور پر صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ کی ہجرت کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ مکہ سے روانہ ہوئے تو قریش کے کچھ نوجوانوں نے انھیں آگے بڑھ کر روکا۔ صہیب نے کہا، اگر میں تمھیں اپنا مال دے دوں تو کیا تم مجھے جانے دوگے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ چنانچہ چند اوقیہ سونا جو صہیب کے پاس تھا، وہ سب انھوں نے ان کو دے دیا اور مدینہ پہنچ گئے۔ بیہقی کی ایک روایت میں ان کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے:

فلما رآنی قال: یا ابا یحییٰ ربح البیع فقلت یا رسول اللہ ما سبقنی الیک احد وما اخبرک الا جبرائیل علیہ السلام

حضرت صہیب کہتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مدینہ میں دیکھا تو فرمایا: اے ابو یحییٰ تمھاری یہ تجارت بڑی نفع بخش رہی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ، مجھ سے پہلے آپ تک مکہ سے کوئی نہیں آیا یہ خبر یقیناً آپ کو جبریل فرشتہ نے دی ہے۔

مگر یہی واقعہ ابن مردویہ اور ابن سعد نے نقل کیا ہے تو اس کے الفاظ یہ ہیں:

فخرجت حتی قدمت المدینۃ، فبلغ ذلک النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ربح صہیب، ربح صہیب

میں قریش کے لوگوں کو اپنا مال دے کر مکہ سے روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گیا۔ اس کی اطلاع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا: صہیب کی تجارت نفع بخش رہی، صہیب کی تجارت نفع بخش رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی پوری زندگی ایک سادہ انسانی واقعہ ہے اور اسی لئے وہ ہمارے لئے نمونہ ہے۔ آپ کو راستہ چلتے ہوئے اسی طرح ٹھوکر لگی جس طرح عام انسان کو لگتی ہے (بخاری) آپ کے مخاطبین اولین کو آپ کا صاحب الہام ہونا اس لئے ناقابلِ فہم نظر آیا کہ آپ انھیں بظاہر اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے تھے:

فانک تقوم بالاسواق وتلتمس المعاش کما نلتمسہ (البدایہ والنہایہ)

آپ بازار میں خرید و فروخت کرتے ہیں اور اسی طرح تلاش معاش کرتے ہیں جس طرح ہم کرتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر خدا کی زندگی کی عظمت اس کے انسانی واقعہ ہونے میں ہے نہ کہ پُراسرار معجزاتی داستان ہونے میں۔ آپ کی کامیابی نصرت الٰہی کے تحت ہوئی، اس لحاظ سے بلاشبہ وہ معجزہ تھی۔ مگر اس معجزۂ الٰہی کا ظہور "بشر رسول" کی سطح پر ہوا نہ کہ کراماتی شخصیت کی سطح پر۔

قرآن میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تصویر دی گئی ہے، اس کو سامنے رکھا جائے تو آپ کی یہی تصویر اس کے مطابق نظر آئے گی۔

اپنی زندگی کے چالیسویں سال جب آپ کو غار حرا میں پہلی وحی ملتی ہے تو آپ پر ٹھیک وہی ردعمل ہوتا ہے جو ایک "انسان" پر ہونا چاہئے۔ آپ خوف زدہ حالت میں گھر واپس آتے ہیں۔ یہاں آپ کی بیوی خدیجہ ہیں۔ وہ خود واقعۂ وحی سے الگ ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں تھیں کہ اس کے بارے میں غیر متاثر رائے قائم کرسکیں۔ چنانچہ وہ آپ سے کہتی ہیں:

كلا والله ما يخزيك الله ابدا، انك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقري الضيف وتعين على نوائب الحق

(صحیحین عن عائشہ)

ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ بے روزگاروں کو کمانے کے قابل بناتے ہیں مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

دعوت کی جدوجہد کے سلسلہ میں آپ کے یہاں وہی فطری ترتیب نظر آتی ہے جو کسی نئے ماحول میں ایک داعی کو پیش آتی ہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ اولاً پوشیدہ طور پر کام کیا جائے:

ذكر ابن اسحاق ان علي بن ابي طالب جاء وهما يصليان. فقال علي: يا محمد ما هذا، قال: دين الله الذي اصطفى لنفسه وبعث به رسله فادعوك الى الله وحده لا شريك له والى عبادته وان تكفر باللات والعزى، فقال علي: هذا امر لم اسمع به قبل اليوم فلست بقاض امرا حتى احدث به ابا طالب فكره رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يفشي عليه سره قبل ان يستعلن امره، فقال له: يا علي، اذ لم تسلم فاكتم، فمكث علي تلك الليلة ثم ان الله اوقع في قلب علي الاسلام فاصبح غاديا الى رسول الله صلى الله (عليه) وسلم حتى جاءه فقال: ماعرضت علي يا محمد فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: تشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له وتكفر باللات والعزى وتبرأ من الانداد، ففعل علي واسلم۔ ومكث ياتيه على خوف من ابي طالب

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ علی بن ابی طالب آپ کے گھر میں آئے، اس وقت آپ اور حضرت خدیجہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا اے محمد! یہ کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا: اللہ کا دین جس کو اس نے اپنے لئے منتخب کیا اور اس کی تبلیغ کے لئے اپنے رسول بھیجے۔ میں تم کو ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کی عبادت کی تلقین کرتا ہوں۔ اور یہ کہ تم لات وعزیٰ کو ماننا چھوڑ دو۔ علی بن ابی طالب نے کہا، یہ ایسی بات ہے جس کو آج سے پہلے میں نے نہیں سنا۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا جب تک اپنے باپ ابوطالب سے اس کی بابت بات نہ کرلوں۔ آپ کو یہ پسند نہیں آیا کہ اعلان سے پہلے یہ راز کھل جائے۔ آپ نے کہا اے علی، اگر تم اسلام نہیں لاتے تو اس معاملہ کو پوشیدہ رکھو۔ علی بن ابی طالب اس رات رکے رہے پھر اللہ نے ان کے دل میں اسلام ڈال دیا۔ اگلے روز صبح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا، اے محمد! کل آپ نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ آپ نے فرمایا، گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

وکتم علی اسلامہ ولم یظہرہ
(البدایہ والنہایہ ج ۳ ۔ ص ۲۴)

اور لات و عزیٰ کو نہ مانو، اور جن کو خدا کا شریک وسہیم بنایا جاتا ہے، ان سے اظہار بیزاری کرو۔ علیؓ نے اس پر عمل کیا اور اسلام لے آئے۔ اس کے بعد ابو طالب کے ڈر سے آپ کے پاس چھپ چھپ کر آتے رہے اور علیؓ نے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اس کو ظاہر نہ کیا۔

اوس و خزرج کے ابتدائی مسلمان جب یثرب واپس ہوئے تو آغاز میں ان کا طریقہ بھی یہی تھا کہ خفیہ طور پر دعوتی کام کرتے (فرجعوا الی قومھم یدعوھم سرا، طبرانی)

آپ نے اپنی پوری زندگی میں شدت سے اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی اقدام اس وقت سے پہلے نہ کیا جائے جب کہ اس کی طاقت پیدا ہو چکی ہو۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳۸ صحابہ جمع ہو گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آپ سے "ظہور" کے لئے اصرار کیا۔ یعنی اب ہم لوگ سامنے آجائیں اور کھلم کھلا تبلیغ کریں۔ مگر آپ کا جواب تھا: یا ابابکر! انا قلیل (اے ابوبکر ابھی ہم تھوڑے ہیں) اسی طرح نبوت کے چھٹے سال جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو انھوں نے آپ سے کہا "اے خدا کے رسول! ہم کیوں اپنے دین کو چھپائیں جب کہ ہم حق پر ہیں۔ اس کے برعکس دوسروں کا دین نمایاں رہے، حالاں کہ وہ باطل پر ہیں،" آپ نے انھیں بھی یہی جواب دیا: یا عمر! انا قلیل۔ آپ کا یہی انداز مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ ہجرت کے بعد جب اسلامی طاقت ایک جگہ منظم اور مرتکز ہو گئی اور قریش فوج لے کر اس کے استیصال کے لئے آگئے، اس وقت مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ بدر کے میدان میں جب آپ کے اصحاب نے اسلام دشمنوں سے مقابلہ شروع کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ھٰذا یوم لہ ما بعدہ ۔ گویا اہل اسلام کے لئے عملی اقدام کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہ وہ اس پوزیشن میں ہو جائیں کہ اپنے اقدام سے اسلام کے لئے نیا مستقبل پیدا کر سکتے ہوں۔ اس سے پہلے عملی اقدام جائز نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کو دعوت عام کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ کو احساس ہوا کہ یہ بہت بڑا کام ہے جس کے لئے ہمہ تن مصروف ہونا ضروری ہے۔ آپ نے چاہا کہ آپ کے خاندان کے لوگ آپ کی اقتصادی ذمہ داریوں میں آپ کے کفیل ہو جائیں تاکہ آپ اس کام کو بخوبی طور پر انجام دے سکیں۔ آپ نے اپنے مکان پر خاندان عبدالمطلب کو جمع کیا جو اس وقت تقریباً ۴۰ افراد پر مشتمل تھے۔ ایک روایت کے مطابق ۳۰ آدمی جمع ہوئے۔ آپ نے ان کو بتایا کہ خدا نے مجھے نبوت عطا کی ہے تم لوگ میرے ساتھ تعاون کرو تاکہ میں اس ذمہ داری کو ادا کر سکوں:

یابنی عبد المطلب! انی بعثت الیکم خاصۃ و الی الناس عامۃ فایکم یبایعنی علی ان یکون اخی وصاحبی۔ من یضمن عنی دینی ومواعیدی ویکون معی فی الجنۃ ویکون خلیفتی فی اھلی فقال رجل: یا محمد، انت

اے خاندان عبد المطلب! میں تمہاری طرف خاص طور پر اور تمام لوگوں کی طرف عام طور پر بھیجا گیا ہوں پھر تم میں سے کون مجھ سے اس پر بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی اور ساتھی ہوگا۔ تم میں سے کون میرے قرضوں اور میرے وعدوں کا ضامن

كنت بها امن يقدم بهذا

(اخرجه احمد عن عائشہ)

بنتا ہے اور میرے پیچھے میرے گھر والوں کا ذمہ دار بنتا ہے اور وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ ایک شخص بولا، اے محمد، آپ تو ایک سمندر ہیں۔ کون اس ذمہ داری کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔

آپ کا خاندان آپ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ عباس بن عبدالمطلب آپ کے چچا تھے۔ وہ اقتصادی حیثیت سے اس پوزیشن میں تھے کہ آپ کی ذمہ داری لے سکیں۔ مگر وہ بھی خاموش رہے (فسکت العباسؓ خشیة ان یحیط ذلك بماله) مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمائی۔ اولاً آپ کی اہلیہ خدیجہ بنت خویلد اور اس کے بعد ابو بکر صدیقؓ کا مال مکی زندگی میں آپ کا اقتصادی سہارا بنا رہا۔

لوگوں کو دعوت حق پہنچانے کے لئے آپ بچوں کی طرح حریص تھے۔ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ مکہ کے ممتاز لوگ ایک روز غروب آفتاب کے بعد کعبہ کے پاس جمع ہوئے اور آپ کو بات چیت کے لئے بلایا (بعثوا اليه ان اشراف قومك قد اجتمعوا لك ليكلموك) اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فجاءهم رسول الله صلى الله عليه وسلم سريعا وهو يظن انه قد بدا لهم في امره بدء و كان عليهم حريصاً يحب رشدهم ويعز عليه عنتهم (ابن جریر عن ابن عباس)

پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیزی سے آئے۔ آپ کو خیال ہوا کہ شاید انھیں قبول حق کی طرف کچھ میلان ہو گیا ہے اور آپ قریش کی ہدایت کے لئے بے حد حریص تھے اور ان کی ہلاکت آپ پر بہت گراں گزرتی تھی۔

مگر بلانے والوں نے آپ کو محض بحث مباحثہ کے لئے بلایا تھا نہ کہ بات ماننے کے لئے۔ چنانچہ طویل گفتگو کے بعد آپ غمگین واپس لوٹے:

ثم انصرف رسول الله صلى الله عليه وسلم الى اهله حزيناً آسفا لما فاته مما كان يطمع به من قومه حين دعوه ولما رائ من مباعدتهم اياه (تہذیب سیرۃ ابن ہشام جلد ۱، صفحہ ۶۸)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم حزن اور افسوس کے ساتھ اپنے گھر واپس آئے کیونکہ قوم سے جس چیز کی امید لگا کر گئے اس کو نہ پایا۔ وہ لوگ اس سے بہت دور تھے۔

اسی طرح ابو طالب کے مرض الموت میں جب لوگ ان کے پاس جمع ہوئے تو انھوں نے کہا کہ ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیان اپنی موت سے پہلے کچھ طے کر دیجئے (فخذ لنا منه وخذ له منا ليكفّ عنا ولنكف عنه) ابو طالب نے آپ کو بلایا اور پوچھا کہ قوم سے آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تقولون لا اله الا الله وتخلعون ما تعبدون من دونه۔ مگر قوم اس کو ماننے پر تیار نہ ہوئی۔ اس کے بعد جب لوگ چلے گئے تو ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ابو طالب نے کہا، بھتیجے! خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ تم نے قوم سے کسی مشکل چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔ (والله يا ابن اخي ما رأيتك سألتهم شططا، ۹۷) ابو طالب کی زبان سے یہ جملہ سن کر آپ کی جو کیفیت ہوئی وہ یہ تھی:

قال، فطمع رسول الله صلى الله عليه وسلم فيه

راوی کہتے ہیں، یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو طالب

فجعل یقول لہ، ای عم افانت فقلہا استحل لک بہا الشفاعۃ یوم القیامۃ

کے بارے میں امید پیدا ہوگئی اور آپ ان سے کہنے لگے، اے چچا پھر آپ ہی اس کلمہ کو کہہ دیجئے تاکہ قیامت کے دن میرے لئے آپ کی سفارش کرنا حلال ہو جائے۔ (البدایہ والنہایہ)

آپ مدعو کی طرف سے ہر قسم کے اشتعال کو آخری حد تک برداشت کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد ہند بنت عتبہ بن ربیعہ آپ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوئی۔ آپ نے بیعت کے الفاظ ادا کرتے ہوئے حسب معمول جب یہ فرمایا: تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگی، تو ہند فوراً بولی:

وھل ترکت لنا اولادا نقتلھم

(جنگ کے بعد) کیا آپ نے ہمارے لئے کوئی اولاد چھوڑی ہے جس کو ہم قتل کریں۔ (ابن کثیر)

مگر آپ نے اس کے طنزیہ جملہ کا کوئی اثر نہیں لیا اور اس کو خوشی کے ساتھ بیعت کرلیا۔

اس مشن کی راہ میں آپ نے نہ صرف اپنے وقت اور اپنے جسم و دماغ کی ساری طاقت لگا دی۔ بلکہ اپنا سارا اثاثہ بھی اس کی راہ میں قربان کردیا۔ نبوت سے پہلے مکہ کی ایک دولت مند خاتون سے نکاح کی وجہ سے آپ کافی مال دار ہو گئے تھے۔ مکہ کے ابتدائی دور میں ایک بار سرداران قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس گفتگو کے لئے بھیجا۔ وہ آپ کے پاس پہنچ کر خود ہی مرعوب ہوگیا:

ولم یخرج الی اھلہ واحتبس عنھم فقال ابوجھل: واللہ یا معشر قریش ما نری عتبۃ الا صبا الی محمد واعجبہ طعامہ وما ذاک الا من حاجۃ اصابتہ، انطلقوا بنا الیہ فاتوہ، فقال ابوجھل: واللہ یا عتبۃ ما جئنا الا ان صبوت الی محمد واعجبک امرہ فان کان بک حاجۃ جمعنا لک من اموالنا ما یغنیک عن طعام محمد، فغضب واقسم باللہ لا یکلم محمد ابدا

(البدایہ والنہایہ جلد ۳)

اور عتبہ اس کے بعد گھر بیٹھ رہا اور لوگوں کے پاس نہ گیا۔ ابوجہل نے کہا اے برادران قریش، خدا کی قسم، میرا خیال ہے کہ عتبہ محمد کی طرف مائل ہوگیا اور اسے محمد کا کھانا پسند آگیا اور یقیناً اسے کسی حاجت کی بنا پر ایسا کرنا پڑا۔ آؤ ہم عتبہ کے پاس چلیں۔ چنانچہ وہ گئے۔ ابوجہل نے کہا اے عتبہ: خدا کی قسم ہم کو اس لئے آنا پڑا کہ تم محمد کی طرف مائل ہو گئے اور ان کا معاملہ تم کو پسند آگیا۔ اگر تمھیں ضرورت ہو تو ہم تمھارے لئے اتنا مال جمع کردیں جو تمھیں محمد کے کھانے سے بے نیاز کردے، عتبہ یہ سن کر بگڑ گیا اور قسم کھا کر کہا کہ میں محمد سے کبھی بات نہ کروں گا۔

اسی طرح عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ ولید بن مغیرہ آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اس کو قرآن سنایا۔ قرآن کے ادب نے اس کو شدید طور پر متاثر کیا۔ ابوجہل کو معلوم ہوا تو وہ ولید بن مغیرہ کے یہاں پہنچا اور اس سے کہا، لوگوں کا ارادہ ہے کہ تمھارے لئے مال جمع کریں۔ کیوں کہ تم کو محمد کے مال کی خواہش ہوگئی ہے۔

اس قسم کی مالی حیثیت سے آپ نے نبوت کا آغاز کیا۔ مگر تیرھویں سال جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی

تو آپ کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا حتیٰ کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے قرض لے کر سامان سفر درست کیا۔

دعوت کی زبان

دعوت اسلامی کے بنیادی نکات، منطقی طور پر، اگرچہ اتنے متعین ہیں کہ وہ انتہائی یکسانیت کے ساتھ شمار کئے جا سکتے ہیں۔ مگر دعوت کے کلمات جب داعی کی زبان سے نکلتے ہیں تو اس میں ایک اور چیز شامل ہو جاتی ہے، اور وہ داعی کی اپنی ذات ہے۔ یہ اضافہ دعوت کو ایک متعین مضمون کی ریکارڈنگ کے بجائے اس کو ایک ایسا زندہ عمل بنا دیتا ہے۔ جو با عتبار حقیقت ایک ہونے کے باوجود اتنی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے جس کی کوئی لگی بندھی فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ داعی کے سینے میں خوف خدا سے لرزتا ہوا دل، مدعو کے ایمان کے لئے بچوں کی سی معصوم اور بے قرار تمنا، یہ جذبہ کہ اگر میں خدا کے بندوں کو خدا کے قریب کر سکوں تو خدا مجھ سے خوش ہو جائے گا، یہ چیزیں نہ صرف کلمات دعوت میں کیفیت کا اضافہ کرتی ہیں بلکہ اس کو باعتبار ظاہر انتہائی متنوع بھی بنا دیتی ہیں۔ کیوں کہ مدعو کو متاثر کرنے کا پُر شوق جذبہ اس کو مجبور کرتا رہتا ہے کہ ہر ایک کے ذہن کی مکمل رعایت کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بات رکھے۔

پیغمبر اسلام کی زندگی میں یہ چیز کامل درجہ میں نظر آتی ہے۔ آپ شب و روز دعوت پہنچانے میں مشغول رہتے تھے۔ مگر آپ کا طریقہ یہ نہ تھا کہ کچھ مقرر الفاظ کو ہر ایک کے سامنے دہرا دیا کریں، بلکہ مخاطب کی رعایت کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بات رکھتے تھے۔

مکہ کے ابتدائی زمانہ میں ایک بار آپ نے ابوسفیان اور ان کی بیوی ہند کو دعوت دی۔ ابن عساکر کی روایت کے مطابق آپ نے حسب ذیل الفاظ کہے:

یا ابا سفیان بن حرب و یا هند بنت عتبة! والله لتموتن ثم لتبعثن ثم ليدخلن المحسن الجنة والمسيئ النار وانا اقول لكم بحق

اے ابوسفیان اور اے ہند! خدا کی قسم تم کو ضرور مرنا ہے۔ اس کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ پھر جو بھلا ہوگا جنت میں داخل ہوگا اور جو برا ہوگا جہنم میں جائے گا اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں حق کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔

ابن خزیمہ نے نقل کیا ہے کہ مکہ کے ایک بزرگ حصین سے آپ کی گفتگو اس طرح ہوئی:

قال يا حصين! كم تعبد من الٰه، قال سبعا في الارض وواحدا في السماء قال فاذا اصابك الضر من تدعو، قال الذي في السماء، قال فاذا هلك المال من تدعو، قال الذي في السماء قال: فيستجيب لك وحده وتشركه معهم (الاصابہ، جلد ۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے حصین! کتنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو۔ حصین نے کہا سات کی زمین میں اور ایک جو آسمان پر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ جب مصیبت آئے تو کس کو پکارتے ہو۔ حصین نے کہا آسمان والے کو۔ آپ نے فرمایا جب مال پر تباہی آئے تو کس کو پکارتے ہو۔ حصین نے کہا آسمان والے کو۔ آپ نے فرمایا وہ اللہ تو

تنہا تمھاری فریاد رسی کرتا ہے اور تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو۔

امام احمد نے ابو امامہ سے نقل کیا ہے کہ ایک قبیلہ کا آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ خدا نے آپ کو کیا چیز لے کر بھیجا ہے (بماذا ارسلك) آپ نے فرمایا:

بان توصل الارحام وتحقن الدماء وتؤمن السبیل وتکسر الاوثان ویعبد اللہ وحدہ لا یشرك بہ شیئ

یہ کہ صلہ رحمی کی جائے۔ قتل ناحق سے بچا جائے۔ راستوں میں امن رکھا جائے۔ بتوں کو توڑا جائے۔ صرف ایک خدا کی عبادت کی جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

مدینہ پہنچنے کے بعد اہل نجران کو آپ نے دعوتی مکتوب روانہ کیا تو اس کے الفاظ یہ تھے:

انی ادعوکم الی عبادۃ اللہ من عبادۃ العباد وادعوکم الی ولایۃ اللہ من ولایۃ العباد

میں تم کو بندوں کی عبادت سے خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔ بندوں کی ولایت سے خدا کی ولایت کی طرف بلاتا ہوں

ایک مستقل اور اہم ترین ذریعہ تبلیغ کا خود قرآن تھا۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص ملتا تو اس کو قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سناتے۔ روایتوں میں اکثر اس قسم کے الفاظ آتے ہیں: ثم ذکر الاسلام وتلا علیھم القرآن، فعرض علیھم الاسلام وقرأ علیھم القرآن۔ قرآن کی کشش عربوں کے لئے اتنی حیرت انگیز تھی کہ اسلام کے بعض کٹر مخالفین بھی راتوں کو چھپ کر آپ کے مکان کے پاس آتے اور آپ قرآن پڑھ رہے ہوتے تو دیوار سے لگ کر اسے سنتے۔ قرآن کا آسمانی ادب عربوں کو بے پناہ طور پر متاثر کرتا تھا۔ ولید بن مغیرہ جب قریش کا نمائندہ بن کر آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس کو قرآن کے حصے پڑھ کر سنائے۔ اس سے وہ اتنا مرعوب ہوا کہ واپس جا کر قریش سے کہا یہ تو اتنا بلند کلام ہے کہ دوسرے تمام کلام اس کے آگے پست ہو جاتے ہیں (وانہ لیعلو ولا یعلی وانہ لیحطم ما تحتہ) تبلیغ اسلام کے لئے قرآن سنانا اس زمانہ میں ایک عام طریقہ بن گیا تھا۔ مصعب بن زبیر جب مبلغ کی حیثیت سے مدینہ بھیجے گئے تو ان کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں سے باتیں کرتے اور قرآن سناتے (یحدثھم ویقص علیھم القرآن) قرآن سنانے کی وجہ سے ان کا نام مقری پڑ گیا تھا۔ (وکان یدعی المقری، حلیۃ الاولیاء جلد اول)

مکہ میں آپ کی دعوت انتہائی سنجیدہ اور علمی انداز میں قرآن کے اعلیٰ ادب کے زیر سایہ چل رہی تھی۔ دوسری طرف مخالفین کے پاس سب و شتم کے سوا اور کچھ نہ تھا، یہاں تک کہ مکہ کے سنجیدہ حلقوں میں کہا جانے لگا کہ محمد کے مخالفین کے پاس محمد کے جواب میں کوئی ٹھوس بات نہیں ہے۔ مکہ کے اعیان و اشراف نے ایک خصوصی اجتماع میں آپ کو بلا کر آپ سے بات کرنے کا منصوبہ بنایا تو اس کی وجہ ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ تھی کہ وہ اپنی قوم کے سامنے بری الذمہ ہو جائیں (ابعثو الی محمد فکلموہ وخاصموہ حتی تعذروا فیہ، ابن جریر)

عربوں کی صلاحیت

جہاں تک دعوت کی قبولیت کا تعلق ہے، اس کا معاملہ صرف دعوت کی سچائی یا داعی کی جد و جہد پر منحصر نہیں ہو

اس سے زیادہ وہ مدعو کے اپنے حالات پر موقوف ہوتا ہے۔ عرب کے جغرافیہ میں جو انسانی عنصر جمع تھا، وہ اس لحاظ سے انتہائی قیمتی تھا، اس کی ظاہری جہالت اور اکھڑپن کے پیچھے فطرت کی سادگی پوری طرح محفوظ تھی۔

۳۰ لاکھ کیلومیٹر رقبہ والا مسطح اور گرم ملک اعلیٰ ترین انسانی اقدار اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ ایک عرب اپنے اونٹ کو جو اس کی معاش کا واحد ذریعہ تھا، ذبح کرکے اس کا گوشت مہمانوں کو کھلا دیتا تھا تاکہ وہ بھوکے نہ رہیں، جس وقت ایک مظلوم شخص جنگل میں ایک عربی کے خیمہ میں پناہ لیتا تو وہ ہاتھ میں تلوار لے کر اس کی حمایت کرتا تھا۔ مخالفین جب تک خیمہ والے کو قتل نہ کرلیتے وہ مظلوم کو خیمہ سے نہیں لے جاسکتے تھے، حتیٰ کہ لوٹنے والے اگر یہ چاہتے کہ وہ قبیلہ کی عورتوں کے قیمتی لباس اور زیورات پر قبضہ کریں تو وہ ان کو ننگا نہیں کرسکتے تھے اور نہ انھیں چھوسکتے تھے، وہ اپنے لئے لازم سمجھتے تھے کہ عورتوں سے کہیں کہ اپنے زیورات اور لباس اتار دیں۔ جس وقت عورتیں لباس اتار رہی ہوتیں، حملہ کرنے والے اپنا منھ پھیر لیتے تاکہ ان کی نگاہ عورتوں کی برہنگی پر نہ پڑے۔

یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ عرب بادیہ بالکل سیدھے سادے "کم فہم" لوگ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت باشعور تھے اور بہت جلد باتوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔

ایک قبیلہ کے سات نومسلم آپ کے پاس آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ہم نے جاہلیت سے پانچ چیزیں سیکھی ہیں۔ ہم ان پر اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک آپ ہمیں ان سے منع نہ کردیں:

قال وما الخصال التی تخلقتم بها فی الجاهلیة، قلنا: الشکر عند الرخاء والصبر عند البلاء والصدق فی مواطن اللقاء والرضا بمر القضاء وترک الشماتة بالمصیبة اذا حلت بالاعداء۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقهاء ادباء کادوا ان یکونوا انبیاء من خصال ما اشرفها۔

کنز العمال ج ۱، صفحہ ۶۹

آپ نے فرمایا وہ خصلتیں کیا ہیں جو تم نے زمانہ جاہلیت سے پائی ہیں۔ آنے والوں نے جواب دیا: خوش حالی میں شکر کرنا، مصیبت میں صبر کرنا، مڈبھیڑ کے وقت سچا ثابت ہونا۔ تقدیر پر راضی رہنا۔ کسی کی مصیبت پر خوش نہ ہونا، خواہ وہ دشمن پر کیوں نہ ہو۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ لوگ اہل علم اور اہل ادب ہیں۔ ان کے اندر انبیاء کی شان ہے۔ کتنی اعلیٰ ہیں ان کی باتیں۔

ضماد، قبیلہ ازدشنوہ کے ایک شخص تھے، وہ بھوت پریت اتارنے کا منتر کیا کرتے تھے۔ ایک بار مکہ آئے تو لوگوں نے آپ کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان پر جن کا اثر ہوگیا ہے۔ ضماد اس خیال سے آپ سے ملے کہ اپنے فن کے ذریعہ آپ کا علاج کریں۔ مگر جب آپ کی باتیں سنیں تو کہا: "خدا کی قسم میں نے کاہنوں اور ساحروں کی باتیں سنی ہیں اور شعراء کے کلام دیکھے ہیں۔ مگر ایسے کلمات میں نے کبھی نہیں سنے۔ اپنا ہاتھ بڑھائیے کہ میں بیعت کرلوں۔" حسب عادت پیغمبر اسلام نے اس موقع پر کوئی لمبی تقریر نہیں کی تھی، بلکہ مسلم کی روایت کے مطابق صرف اتنا کہا تھا:

انّ الحمد للہ نحمده ونستعینه من یهده اللہ فلا مضل له ومن یضلل فلا هادی له اشهد

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اسی کی تعریف کرتا ہوں اور اسی سے مدد چاہتا ہوں جس کو اللہ ہدایت دے۔

ان لا اله الا الله وحدہٗ لا شریک لہٗ

اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو وہ ہدایت نہ دے کوئی اسے ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔

مگر انھیں مختصر کلمات میں انھوں نے معانی کا خزانہ پالیا:

فقال لہ ضماد، اعد علیّ کلماتک ھٰولاء فلقد بلغن قاموس البحر

ضماد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اپنے ان کلمات کو دوبارہ کہئے۔ یہ کلمات تو سمندر کی گہرائی میں اترے ہوئے ہیں۔

(البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۳۶)

ایک عرب کے لئے کہنے اور کرنے میں فرق کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ خود بھی قول و فعل میں سچے تھے اور دوسروں کو بھی سچا سمجھتے تھے۔ جیسے ہی اس کی سمجھ میں بات آجاتی، وہ فوراً اسے مان لیتا۔ ابن اسحاق نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ قبیلہ بنی سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو اپنا نمائندہ بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ وہ مدینہ آئے، اپنی اونٹنی مسجد کے دروازے پر بٹھائی اور اس کو باندھا۔ اس کے بعد مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ آپ اس وقت اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ضمام ایک بہادر اور سمجھ دار آدمی تھے۔ انھوں نے آپ کی مجلس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا: تم میں سے کون ابن عبد المطلب ہے (ایکم ابن عبد المطلب) آپ نے فرمایا، میں ابن عبد المطلب ہوں۔ ضمام نے کہا، اے محمد! آپ نے فرمایا ہاں۔ انھوں نے کہا اے ابن عبد المطلب میں آپ سے کچھ پوچھوں گا اور پوچھنے میں کچھ سختی کروں گا، آپ اس کو محسوس نہ کریں۔ آپ نے فرمایا میں کچھ محسوس نہیں کروں گا۔ جو تمھارے جی میں آئے پوچھو۔ ضمام نے کہا، میں آپ کو قسم دیتا ہوں آپ کے معبود کی اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ سے پہلے تھے اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ کے بعد آئیں گے، کیا اللہ نے آپ کو رسول بنا کر ہماری طرف بھیجا ہے (اللہ بعثک الینا رسولا) آپ نے فرمایا خدایا ہاں۔ ضمام نے کہا میں آپ کو قسم دیتا ہوں آپ کے معبود کی اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ سے پہلے تھے اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ کے بعد آئیں گے، کیا اللہ نے آپ سے کہا ہے کہ ہم کو حکم دیں کہ ہم تنہا اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ان بتوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا خدایا! ہاں۔ ضمام نے کہا میں آپ کو قسم دیتا ہوں، آپ کے معبود کی اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ سے پہلے تھے اور ان لوگوں کے معبود کی جو آپ کے بعد آئیں گے، کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم یہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ راوی کہتے ہیں کہ اسی طرح انھوں نے زکوٰۃ، روزہ، حج اور تمام احکام اسلام کا ذکر کیا۔ ہر فریضہ کو مندرجہ بالا طریقہ پر قسم دے کر پوچھتے، یہاں تک کہ جب فارغ ہو گئے تو کہا:

فانی اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ وساودی ھذہ الفرائض واجتنب

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور

ما نهيتني عنه ثم لا ازيد ولا انقص

البداية والنهاية جلد ۵)

اب میں ان فرائض کو ادا کروں گا اور ان چیزوں سے بچوں گا جن سے آپ نے منع کیا ہے۔ اس میں نہ کوئی کمی کروں گا اور نہ کوئی زیادتی۔

پھر اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے اور اپنی قوم میں پہنچ کر انھیں پوری بات بتائی۔ ایک روایت کے مطابق صبح کی شام نہیں ہونے پائی تھی کہ ان کی مجلس کے تمام مرد و عورت مسلمان ہو گئے۔

ان کے اندر نفاق نہ تھا۔ اقرار اور انکار کے درمیان وہ کسی تیسری چیز کو نہ جانتے تھے۔ جب وہ کسی کو ایک قول دے دیتے تو اس کو ہر حال میں پورا کرتے، خواہ اس کی خاطر جان و مال کی کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ عرب کردار کی یہ جھلک یثرب کے قبائل (اوس و خزرج) کی ان تقریروں میں ملتی ہے جو بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ان کے نمائندوں نے کی تھی۔

ان القوم لما اجتمعوا البيعة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال العباس بن عبادة بن نضلة اخو بني سالم بن عوف : يا معشر الخزرج ! هل تدرون علام تبايعون هذا الرجل، قالوا نعم، قال انكم تبايعونه على حرب الاحمر و الاسود من الناس، فان كنتم ترون انكم اذا انهكت اموالكم مصيبة واشرافكم قتلا اسلمتموه فمن الآن فهو والله ان فعلتم خزي الدنيا و الاخرة وان كنتم ترون انكم وافون بما دعوتموه اليه على نهكة الاموال وقتل الاشراف فخذوه فهو والله خير الدنيا والاخرة قالوا فانا ناخذه على مصيبة الاموال وقتل الاشراف، فما لنا بذلك يا رسول الله ان نحن وفينا، قال الجنة۔ قالوا: ابسط يدك، فبسط يده فبايعوه

البداية والنهاية، جلد ۳۔ صفحہ ۱۶۲

یثرب کے لوگ جب آپ سے بیعت کے لیے جمع ہوئے تو عباس بن عبادہ نے کہا: اے گروہ خزرج! کیا تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر ان کے ہاتھ بیعت کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ عباس بن عبادہ نے کہا، تم سرخ و سفید سے جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ جب تمھارا مال ضائع ہوا اور تمھارے اشراف قتل کئے جائیں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کی قوم کے حوالے کر دوگے تو ابھی ایسا کر لو۔ کیونکہ بعد کو تم نے ایسا کیا تو خدا کی قسم وہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہوگی، اور اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ تم نے جو کچھ وعدہ کیا ہے اس کو تم پورا کروگے، خواہ تمھارے مال ضائع ہوں اور تمھارے اشراف قتل کئے جائیں، تو ان کو اپنے ساتھ لے جاؤ، کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

انھوں نے کہا، ہم آپ کو لیتے ہیں خواہ ہمارے مال تباہ ہوں یا ہمارے اشراف قتل کئے جائیں۔ اے اللہ کے رسول اس کے بدلے میں ہمارے لئے کیا ہے۔ اگر ہم اس قول کو پورا کر دیں۔ آپ نے فرمایا جنت۔

انھوں نے کہا پھر اپنا ہاتھ بڑھائیے، آپ نے ہاتھ
بڑھایا اور انھوں نے بیعت کرلی۔

واقعات ثابت کرتے ہیں کہ یہ محض تقریر نہ تھی بلکہ انھوں نے لفظ بلفظ اپنے اس عہد کو پورا کیا۔ حتیٰ کہ جب اسلام غالب ہوگیا تو اس کے بعد بھی وہ اپنی قربانیوں کے لئے کسی سیاسی معاوضہ کے طالب نہ ہوئے بلکہ خلافت کو مہاجرین کے حوالے کرکے اس پر راضی ہوگئے اور اسی حال میں ایک ایک کرکے اس دنیا سے چلے گئے۔

دعوت کی ہمہ گیری

ابن اسحاق نے عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ ایک بار قریش کے اشراف ابوطالب کے یہاں جمع ہوئے۔ ان میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف اور ابوسفیان بن حرب جیسے لیڈر شامل تھے۔ ابوطالب کی معرفت ان لوگوں نے پوچھا کہ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں، آپ نے کہا:

کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم
البدایہ والنہایہ جلد ۲، صفحہ ۱۲۳

میں صرف ایک بات کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اگر تم اسے مان لو تو تم سارے عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمھارا مطیع فرمان ہوگا۔

توحید کا کلمہ بظاہر صرف ایک اعتقادی کلمہ ہے۔ مگر اس کے اندر ہر قسم کی انسانی فتوحات کا راز چھپا ہوا ہے۔ یہ انسانی فطرت کی آواز ہے، اس لئے وہ انسانی نفسیات کی انتہائی گہرائیوں میں شامل ہوجاتا ہے اور اکثر خود مخالفین کے اندر اپنے حامی پیدا کرلیتا ہے۔ خالد بن ولید فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام لائے۔ مگر اسلام کی سچائی بہت پہلے سے ان کے قلب میں ان کا پیچھا کئے ہوئے تھی۔ اسلام کے بعد انھوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میرے دل میں بہت پہلے یہ بات پڑ چکی تھی کہ حق قریش کی طرف نہیں بلکہ محمدؐ کی طرف ہے، اور مجھے آپ کے ساتھ مل جانا چاہئے:

قد شھدت ھذہ المواطن کلھا علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلیس فی موطن اشھدہ الا انصرف وانا اری فی نفسی انی موضع فی غیر شئ
(البدایہ والنہایہ، جلد ۴)

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمام جنگوں میں شریک رہا مگر کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں میں شریک ہوا ہوں اور یہ خیال لے کر واپس نہ آیا ہوں کہ میں صحیح جگہ نہیں کھڑا ہوں۔

اسی طرح بہت سے لوگوں کے بارے میں روایتیں ملتی ہیں کہ ان کے دل میں بہت پہلے سے اسلام کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوچکا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اس کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ مثلاً خالد بن سعید بن العاص نے اسلام سے پہلے خواب دیکھا کہ وہ آگ کے بہت بڑے گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی انھیں دھکا دے کر اس میں گرانا چاہتا ہے۔ اتنے میں پیغمبر اسلام آئے اور انھوں نے آپ کو آگ میں گرنے سے بچا لیا۔

دعوتی عمل بظاہر اقتصادیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مگر بالواسطہ طور پر وہ زبردست اقتصادی عمل ہے۔ کیونکہ دعوت کے نتیجہ میں جب ایک شخص اسلام کو اختیار کرتا ہے تو اس کے تمام ذرائع بھی خود بخود اسلام کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ میں خدیجہؓ کی دولت اسلام کے کام آتی رہی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر ایمان لائے جنھوں نے تجارت سے چالیس ہزار درہم کمائے تھے ان کا سرمایہ اسلامی تحریک کا اقتصادی سہارا بنا۔ ہجرت کے موقع پر وہ چھ ہزار درہم لے کر گھر سے روانہ ہوئے تھے جس سے سفر کے تمام اخراجات پورے کئے گئے۔ غزوۂ تبوک میں حضرت عثمانؓ نے دس ہزار دینار دیئے جس سے لشکر کی ضروریات کا تہائی حصہ ادا کیا گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے صرف ایک موقع پر پانچ سو گھوڑے جہاد کے لئے دیئے۔ اسی طرح جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے ان کی جان کے ساتھ ان کا مال بھی اسلام کے خزانہ کا ایک جزء بن جاتا تھا۔

توحید کا نظریہ واحد نظریہ ہے جس میں سماجی تقسیم اور طبقاتی امتیاز کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے جب اس نظریہ کی بنیاد پر کوئی تحریک اٹھتی ہے تو وہ عوام کو حیرت انگیز طور پر متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ توحید کے زیر سایہ وہ مساوات اور انسانی عظمت کا حقیقی مقام پا سکتے ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ فارس کے سپہ سالار رستم کے دربار میں گئے تو درباریوں پر ان کی تقریر کا ردعمل ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ تھا:

فقالت السفلة، صدق واللہ العربی وقالت الدھاقین، واللہ لقد رمی بکلام لایزال عبیدنا ینزعون الیہ، قاتل اللہ اولینا ماکان احمقھم حین کانوا یصغرون امر ھذہ الامۃ

(تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۳۶)

نیچے کے لوگوں نے کہا، خدا کی قسم، اس عربی نے سچ بات کہی۔ سرداروں نے کہا، خدا کی قسم اس نے ایسی بات پھینکی ہے کہ ہمارے سب غلام اس کی طرف چلے جائیں گے خدا ہمارے پہلوں کو غارت کرے، وہ کس قدر احمق تھے کہ انھوں نے اس قوم کے معاملہ کو ہلکا سمجھا۔

نبوت کے تیرھویں سال پیغمبر اسلام حضرت ابوبکر کے ساتھ مدینہ پہنچے تو یہاں کی آبادی کے تقریباً ۵۰۰ آدمی آپ کے استقبال کے لئے جمع ہوئے اور انھوں نے کہا:

انطلقا آمنین مطاعین (البدایہ والنہایہ جلد ۳) آیئے، آپ یہاں محفوظ ہیں اور ہمارے سردار ہیں۔

مدینہ کی یہ سرداری آپ کو کس طرح حاصل ہوئی، جواب یہ ہے کہ دعوت کے ذریعہ۔ مدینہ (یثرب) کا پہلا شخص جس کو آپ نے اسلام کی دعوت دی، غالباً سوید بن صامت خزرجی ہے۔ اس سے آپ نے اسلام کا ذکر کیا تو اس نے کہا "شاید آپ کے پاس وہی ہے جو میرے پاس ہے"، آپ نے پوچھا تمھارے پاس کیا ہے۔ وہ بولا "حکمت لقمان"۔ آپ نے فرمایا: بیان کرو، اس نے کچھ اشعار سنائے۔ آپ نے فرمایا، میرے پاس قرآن ہے جو اس سے بھی افضل ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کو قرآن سنایا وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ یثرب واپس ہو کر جب اس نے اپنے قبیلہ کے سامنے اسلام کا پیغام رکھا تو انھوں نے اس کو قتل کر دیا۔ (تاریخ طبری، ص ۲۳۲)

اس کے بعد یثرب کے ایک سردار ابوالحیسم انس بن رافع مکہ آئے، ان کے ساتھ بنی عبدالاشہل کے جوانوں کی

ایک جماعت بھی تھی۔ یہ لوگ اس لئے مکہ آئے تھے کہ قبیلہ خزرج کی حمایت کے لئے قریش سے معاہدہ کریں۔ آپ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ ان کے پاس گئے اور کہا: "تم لوگ جس کام کے لئے آئے ہو کیا اس سے زیادہ بھلی بات میں تم کو نہ بتاؤں"۔ اس کے بعد آپ نے توحید کی دعوت ان کے سامنے پیش کی۔ ان کے ایک نوجوان ایاس بن معاذ بولے: "اے قوم! خدا کی قسم یہ بات اس سے بہتر ہے جس کے لئے تم آئے ہو"۔ مگر وفد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ انھوں نے کہا: دعنا منك قد جئنا لغير هذا۔ (چھوڑو، ہم دوسرے کام کے لئے آئے ہیں) وہ یثرب واپس گئے اور اس کے جلد ہی بعد اوس اور خزرج کے درمیان وہ جنگ چھڑ گئی جو بعاث کے نام سے مشہور ہے۔

خبیب بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ یثرب کے دو شخص سعد بن زرارہ اور ذکوان بن قیس مکہ آئے اور عتبہ بن ربیعہ کے یہاں ٹھہرے۔ پیغمبر اسلام کا تذکرہ سنا تو آپ سے ملنے کے لئے آئے۔ آپ نے ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر وہ اپنے میزبان عتبہ بن ربیعہ کے پاس نہیں گئے، بلکہ آپ کے یہاں سے سیدھے یثرب واپس چلے گئے۔ یہ ان پہلے لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اہل یثرب تک اولاً اسلام پہنچایا۔ یہ نبوت کے دسویں سال کا واقعہ ہے۔

نبوت کے گیارھویں سال حج کے موقع پر یثرب سے قبیلہ خزرج کے چھ آدمی آئے۔ انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور واپس جا کر اپنی بستی میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ اگلے سال (۱۲ نبوی) بارہ آدمیوں نے آکر بیعت کی جو اسلام کی تاریخ میں عقبہ اولی (۶۲۱) کے نام سے مشہور ہے۔ نبوت کے تیرھویں سال اس تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور یثرب کے ۷۵ لوگ مکہ حاضر ہوئے اور بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ وجود میں آیا۔

مکہ کے برعکس یثرب میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ پہلے ہی مرحلہ میں وہاں کے ممتاز لوگوں نے اسلام قبول کر لیا (اسلم اشرافهم) چوں کہ یہ قبائلی دور تھا اور قبائل میں یہ رواج تھا کہ سردار قبیلہ کا جو مذہب ہوتا تھا وہی پورے قبیلہ کا مذہب ہوتا تھا۔ اس لئے یثرب میں بہت تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتی کہ کوئی گھر نہ بچا جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو (حتی لم تبق دار من دور الانصار الا وفيها رهط من المسلمين) اس طرح جب یثرب کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی تو فطری طور پر وہی بستی میں سب سے زیادہ با اثر ہو گئے۔

فكان المسلمون اعز اهلها وصلح امرهم — پس مسلمان مدینہ کے سب سے زیادہ با اثر گروہ بن گئے اور ان کا معاملہ درست ہو گیا۔
(اخرجه الطبرانی عن عروہ)

دعوت کے مصالح

ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو زمانہ کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں اور اپنی فطرت کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔ عرب معاشرہ میں بھی فطری سادگی اور ملت ابراہیمی کے بقایا کے نتیجہ میں ایسے متعدد لوگ تھے جو سچائی کی تلاش میں تھے اور بت پرستی کو ناپسند کرتے تھے۔ عرف عام میں ان کو حنیف کہا جاتا تھا۔ مثلاً

قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل وغیرہ۔ ایسے ہی ایک حنیف جندب بن عمرو الدوسی تھے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں کہا کرتے تھے:

ان للخلق خالقا لکنی ما ادری من ھو (ابن عبد البر فی الاستیعاب، ج ۲)

یقیناً خلق کا کوئی خالق ہے۔ مگر میں نہیں جانتا وہ کون ہے۔

جب انھیں آپ کی بعثت کی خبر ملی تو وہ اپنی قوم کے ۷۵ آدمیوں کو ساتھ لے کر آئے اور سب نے اسلام قبول کر لیا۔ ابو ذر غفاری بھی اسی قسم کے متلاشیوں میں سے تھے۔ انھیں آپ کے بارے میں علم ہوا تو اپنے بھائی کو مکہ بھیجا کہ آپ کی خبر لے کر آئے۔ بھائی نے واپس جاکر آپ کے بارے میں جو رپورٹ دی اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

رأیت رجلا یسمیہ الناس الصابی ھو اشبہ الناس بک (اخرجہ مسلم من طریق عبد اللہ بن الصامت)

میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کو لوگ بددین کہتے تھے، وہ تم سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔

ایسے لوگوں کو آپ کی دعوت سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئی۔

جب کسی معاشرہ میں دعوت کا آغاز ہوتا ہے تو اس کا بیج ایسے ایسے مقامات پر پڑتا ہے جس کا اندازہ خود داعی کو بھی نہیں ہوتا۔

عرب میں جو لوگ "دیر" سے اسلام لائے۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان پر بالکل اچانک اسلام منکشف ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اخلاقی زندگی، آپ کا شب و روز دعوت و تبلیغ میں مشغول رہنا، مخالفتوں کی وجہ سے آپ کا اور آپ کے پیغام کا مستقل چرچا جس کی وجہ سے ہر ایک کے لئے آپ کا وجود ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ ان چیزوں نے بے شمار عربوں کے ذہن میں اسلام کے بیج ڈال دیئے تھے۔ قبائلی عصبیت اور اسلاف پرستی کی وجہ سے ایک شخص بظاہر ضد اور عناد میں مبتلا ہوتا۔ مگر اندر اندر اسلام کی خاموش پرورش کو بھی وہ روک نہ سکتا تھا۔ حضرت عمر کے اسلام کے بارے میں عام شہرت یہ ہے کہ اچانک ایک واقعہ آپ کے اسلام کا سبب بن گیا۔ آخری مرحلہ میں آپ کے اسلام کا محرک بلاشبہ یہی واقعہ تھا۔ مگر اس کے ابتدائی بیج آپ کے دل میں بہت پہلے پڑ چکے تھے:

اخرج ابن اسحاق عن عبد العزیز بن عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ عن امہ ام عبد اللہ بنت ابی حثمۃ رضی اللہ عنہا قالت: واللہ انا لنترحّل الی ارض الحبشۃ وقد ذھب عامر فی بعض حاجتنا، اذ اقبل عمر، فوقف علیّ وھو علیٰ شرکہ، فقالت وکنا نلقی منہ اذی لنا وشدۃ علینا، قالت فقال: انہ الانطلاق یا ام عبد اللہ قلت نعم، واللہ لنخرجن فی ارض من ارض اللہ اذا آذیتمونا وقھرتمونا حتی یجعل اللہ لنا مخرجا،

ام عبد اللہ بنت ابی حثمہ کہتی ہیں، خدا کی قسم ہم لوگ ملک حبش کی طرف کوچ کر رہے تھے اور میرے شوہر عامر اپنی بعض ضروریات کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر بن الخطاب آگئے اور میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے، وہ ابھی تک اسلام نہ لائے تھے۔ ہم لوگوں کو ان سے بڑی تکلیفیں اور سختیاں پہنچی تھیں۔ انھوں نے کہا، اے ام عبد اللہ! کوچ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا ہاں، خدا کی قسم ہم لوگ اللہ کی زمین میں سے کسی زمین میں چلے جائیں گے۔ اس لئے کہ تم لوگ ہمیں ستاتے ہو

قالت فقال: صحبکم اللہ، ورأیت لہ رقۃ لم اکن اراھا ثم انصرف وقد احزنہ فیما اری خروجنا

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۷۹)

اور ہمارے اوپر زیادتیاں کرتے ہو۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے لئے کوئی نکاسی کی جگہ پیدا کر دے۔ام عبداللہ کہتی ہیں۔عمر نے کہا خدا تمھارا ساتھی ہو۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں رقت پیدا ہوگئی جو میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بعد وہ چلے گئے اور ان کو ہمارے مکہ سے جانے کا بہت ملال تھا۔

ہر زمانہ میں کچھ ایسے خیالات ہوتے ہیں جو عوامی ذہنوں میں جڑ پکڑ جاتے ہیں۔ جب تک خیالات کی یہ دیوار نہ ٹوٹے کوئی آواز محض اپنی فلسفیانہ صداقت کی بنیاد پر ان کے اندر قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ ابتدائی زمانہ میں اہل عرب کی طرف سے جس اختلاف کا مظاہرہ ہوا، وہ محض ہٹ دھرمی یا مصلحت پرستی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کعبہ کے متولیوں کے سوا بھی کسی کا دین صحیح اور برحق ہو سکتا ہے۔ جو عرب قبائل یہود کے پڑوس میں بسے ہوئے تھے وہ نسبتاً اس قسم کی اعتقادی پیچیدگی سے محفوظ تھے، کیوں کہ یہود سے وہ سنتے رہتے تھے کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ عرب میں ایک نبی کا ظہور ہوگا:

فلما سمعوا قولہ، انصتوا واطمأنت انفسھم الیٰ دعوتہ وعرفوا ماکانوا یسمعون من اھل الکتاب من ذکرھم ایاہ بصفتہ وما یدعوھم الیہ فصدقوہ وآمنوا بہ

(طبرانی)

انصار کے لوگوں نے جب آپ کا کلام سنا تو وہ چپ ہوگئے، ان کا دل آپ کی دعوت پر مطمئن ہو گیا۔ انھوں نے اہل کتاب سے آپ کے جو اوصاف سنے تھے اور جس چیز کی طرف آپ نے ان کو بلایا تھا، ان کو پہچانا۔ انھوں نے آپ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔

عکاظ کے میلے میں جب آپ بنو کندہ کے خیموں میں گئے اور ان کے سامنے اپنی بات پیش کی تو ایک نوجوان بول اٹھا:

یا قوم! اسبقوا الیٰ ھٰذا الرجل قبل ان تسبقوا الیہ فواللہ ان اھل الکتاب لیحدثون ان نبیا یخرج من الحرم قد اظل زمانہ

(ابونعیم فی الدلائل)

اے قوم، اس آدمی کا ساتھ دینے میں جلدی کرو قبل اس کے کہ اور لوگ اس کی طرف سبقت کریں۔ خدا کی قسم، اہل کتاب کہہ رہے ہیں کہ حرم سے ایک نبی ظاہر ہوگا جس کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔

مدینہ کے عرب قبائل، اوس اور خزرج کے ایمان لانے میں پیش قدمی کرنے کی وجہ ان کا یہی ذہنی پس منظر تھا۔ تاہم مکہ کے لوگوں اور بیشتر عرب قبائل کے لئے صداقت کا معیار کعبہ کا اقتدار تھا۔ قدیم عرب میں کعبہ کی حیثیت وہی تھی جو بادشاہی نظام میں "تاج" کی ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ تاج کے ساتھ صرف سیاسی اقتدار کا تصور وابستہ ہوتا ہے، جب کہ کعبہ کے ساتھ اقتدار کے علاوہ تقدس کی روایات بھی کامل درجہ میں شامل تھیں۔ عام عرب اپنے سادہ ذہن کے تحت یہ سمجھتے تھے کہ جو کعبہ پر قابض ہو جائے وہی صداقت کا حامل ہے۔ بنو عامر کے ذوالجوشن الضبابی بتاتے ہیں:

قال یا ذا الجوشن! الا تسلم فتکون من اول هذا الامر، فقلت لا، قال لم؟ قال قلت، رأیت قومك قد دلعوا بك قال: کیف بلغك عن مصارعهم ببدر قلت قد بلغنی، قال فانا نهدی لك قلت ان تغلب علی الکعبة وتقطنها قال لعلك ان عشت تری ذلك۔۔۔ قال فواللہ انی باهلی بالغور اذا اقبل راکب فقلت ما فعل الناس؟ قال: واللہ قد غلب محمد علی الکعبة وقطنها، قلت هبلتنی امی ولو اسلمت یومئذ ثم اسأله الحیرة لاقطعنیها

(طبرانی)

آپؐ نے فرمایا اے ذو الجوشن تم اسلام کیوں نہیں لاتے کہ تمھارا شمار اولین لوگوں میں ہو جائے۔ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کیوں۔ میں نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی قوم آپ کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ آپ نے فرمایا بدر میں ان کی شکست کے بارے میں تم نے کیا سنا۔ میں نے کہا ہاں مجھے معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا ہم کو تو تمھیں ہدایت کی بات بتانی ہے۔ میں نے کہا، ہاں، بشرطیکہ آپ کعبہ کو فتح کر کے اس پر قابض ہو جائیں، آپ نے فرمایا اگر تم زندہ رہے تو دیکھ لو گے اس کے بعد ایک روز میں اپنے وطن غور میں تھا کہ ایک سوار آیا۔ میں نے پوچھا لوگوں کا کیا ہوا۔ اس نے کہا خدا کی قسم محمدؐ نے کعبہ کو فتح کر لیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ میں نے کہا میری ماں مجھے گم کرے، اگر میں نے اسی دن اسلام قبول کر لیا ہوتا اور پھر محمدؐ سے حیرہ مانگتا تو وہ ضرور دے دیتے

یہی وجہ ہے کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے (نصر — ۲)

دعوت کا ردعمل

آپ نے اپنی دعوتی مہم کا آغاز کیا، تو وہ سارے واقعات پیش آنے شروع ہوئے جو کسی معاشرہ میں نئی آواز بلند ہونے کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ کچھ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔ عبد بن حمید نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ قریش کے سرداروں نے ایک بار عتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس بھیجا۔ اس نے آپ کی تردید میں ایک لمبی تقریر کی، جب وہ کہہ چکا تو آپ نے کہا فَرَغْتَ، اس نے کہا ہاں۔ آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور حٰم سجدہ کی ابتدائی ۱۳ آیتیں پڑھ کر اسے سنائیں۔ عتبہ نے سن کر کہا بس، اس کے سوا اور کچھ تمھارے پاس نہیں (حسبك! ما عندك غیر هذا) آپ نے فرمایا نہیں۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

فرجع الی قریش فقالوا ما وراءك قال ما ترکت شیئاً اری انکم تکلمونه الا کلمته۔ قالوا فهل اجابك۔ فقال نعم ثم قال! لا والذی نصبها بینة مافهمت شیئاً مما قال غیر انه انذرکم صاعقة

پھر عتبہ قریش کے پاس آیا۔ انھوں نے پوچھا کیا ہوا۔ عتبہ نے جواب دیا، تم لوگ جو کچھ کہتے وہ سب میں نے کہہ ڈالا۔ انھوں نے پوچھا پھر کیا کوئی جواب دیا۔ عتبہ نے کہا ہاں۔ پھر بولا خدا کی قسم اس نے جو دلیل دی، اس سے میں کچھ

مثل صاعقة عاد وثمود، قالوا، ویلك یکلمك الرجل بالعربیة لا تدری ما قال۔ قال لا واللہ مافہمت شیئاً مما قال غیر ذکر الصاعقة (بیہقی)

نہیں سمجھا، سوا اس کے کہ تم کو عاد و ثمود جیسے کڑکے سے ڈرایا ہے۔ قریش نے کہا تمھارا برا ہو ایک شخص تم سے عربی میں بات کر رہا ہے اور تم نہیں سمجھتے کہ اس نے کیا کہا۔ عتبہ نے کہا خدا کی قسم اس نے جو کچھ کہا اس سے میں کڑکے کے سوا کچھ نہیں سمجھا۔

کچھ لوگ جو مذہب کے ایک خاص روایتی ڈھانچے سے مانوس ہو چکے تھے، انھیں آپ کی دعوت میں اسلاف کی تحقیر کی بو نظر آئی۔ ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں نیز نسائی اور بغوی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت ضماد مکہ آئے تاکہ عمرہ کریں۔ ایک روز وہ ایک مجلس میں بیٹھ گئے جس میں ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف تھے۔ ابوجہل نے کہا:

ھٰذا الرجل الذی فرق جماعتنا وسفّہ احلامنا واضل من مات منا وعاب آلھتنا، فقال امیة الرجل مجنون غیر شك (الاصابہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۰)

اس شخص نے ہماری جماعت میں اختلاف ڈال دیا۔ ہم سب کو بیوقوف بتایا۔ ہمارے اسلاف کو گمراہ قرار دیا۔ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا۔ امیہ بولا اس آدمی کے پاگل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

عمرو بن مرہ جہنی نے اپنے قبیلہ جہینہ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو ایک شخص نے کہا:

یا عمرو بن مرة! امر اللہ عیشك اتامرنا برفض آلھتنا وان نفرق جمعنا وان نخالف دین آبائنا الشیم العلیٰ الیٰ ما یدعونا الیہ ھذ القرشی من اھل تھامة، لاحبا ولا کرامة (البدایہ والنہایہ جلد ۲)

اے عمرو بن مرہ! خدا تیری زندگی تلخ کر دے کیا تو ہم کو ہمارے معبودوں کو چھوڑنے کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ ہم اپنی جمعیۃ کو منتشر کر دیں، اور اپنے باپ دادا کے دین کی مخالفت کریں جو اخلاق عالیہ کے مالک تھے۔ یہ تہامہ کا رہنے والا قریشی ہمیں کس چیز کی طرف بلاتا ہے اس میں نہ کوئی شرافت ہے نہ کرامت۔

اس کے بعد اس نے تین شعر پڑھے۔ آخری شعر یہ تھا:

لیسفّہ الاشیاخ ممن قد مضی　　من رام ذلك لا اصاب فلاحا

وہ ہمارے گزرے ہوئے اسلاف کو احمق ثابت کرنا چاہتا ہے اور جس کا ایسا ارادہ ہو وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔

کچھ لوگوں کے لئے حسد مانع ہوگیا۔ کیوں کہ آپ اپنی پیغمبری کا اعلان کر رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ میرے پاس حقیقت کا علم ہے اور انسان کے لئے ہمیشہ یہ مشکل ترین امر رہا ہے کہ وہ کسی کے بارے میں یہ اعتراف کرے کہ خدا نے اس کو حقیقت کا وہ علم دیا ہے جو خود اسے نہ مل سکا۔ بیہقی نے مغیرہ بن شعبہ سے نقل کیا ہے کہ ابوجہل بن ہشام نے ایک روز ان سے علیٰحدگی میں کہا:

واللہ انی لاعلم ان ما یقول حق ولکن یمنعنی

خدا کی قسم میں خوب جانتا ہوں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں، حق ہے

شیئ ۔ ان بنی قصیؔ قالوا : فینا الحجابۃ فقلنا نعم، ثم قالوا فینا السقایۃ فقلنا نعم، ثم قالوا فینا الندوۃ فقلنا نعم، ثم قالوا فینا اللواء فقلنا نعم
حتیٰ قالوا منا نبی، واللہ لا افعل
(البدایہ والنہایہ جلد ۳)

مگر مجھے ایمان لانے میں ایک چیز مانع ہے۔ بنی قصی نے کہا کہ کعبہ کی دربانی ہماری ہے۔ ہم نے کہا ہاں، پھر بنی قصی نے کہا حاجیوں کو پانی پلانے کا کام ہمارا ہے۔ ہم نے کہا ہاں۔ پھر بنی قصی نے کہا کہ دار الندوہ میں ہمارا حق ہے، ہم نے کہا ہاں۔ پھر انھوں نے کہا جنگ میں جھنڈا اٹھانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم نے کہا ہاں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ نبوت ہمارے اندر رہے۔ پس خدا کی قسم میں ہرگز اس کو نہیں مانوں گا۔

کچھ لوگ آپ کے اس لئے مخالف ہو گئے کہ آپ کی دعوت کو مان لینے میں انھیں اپنا اقتصادی خطرہ نظر آتا تھا۔ اسلام سے قبل خانہ کعبہ ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس میں تمام مذاہب کے بت رکھے ہوئے تھے حتیٰ کہ اس میں مسیح اور مریم کی بھی تصویریں تھیں۔ اس طرح کعبہ تمام مذاہب کے لوگوں کی زیارت گاہ بن گیا تھا۔ چار حرام مہینوں کی غرض بھی یہی تھی۔ کیوں کہ اس زمانے میں تمام مذاہب کے لوگ مکہ آتے رہتے تھے۔ اگر بتوں کو خانہ کعبہ سے ہٹا دیا جاتا تو کوئی شخص کعبہ کی زیارت کے لئے نہ آتا اور مکہ کا بازار جو چار مہینوں تک لگا رہتا تھا، بند ہو جاتا۔ اس لئے مکہ کے باشندے آپ کی دعوت کو اپنے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر توحید کا دین فروغ پاگیا تو یہ غیر ذی زرع علاقہ بالکل تباہ ہو جائے گا۔ نیز کعبہ کی تولیت نے قریش کو مختلف قبائل میں سرداری کا مقام دے رکھا تھا۔ ایک مورخ لکھتے ہیں:

کانت اموالھا وتجاراتھا تسافر فی الشرق والغرب فی ظلال معاھدات تجاریۃ بینھا وبین امم وثنیۃ مثلھا کفارس وامم مسیحیۃ کالحبشۃ وکمثل بیزنطۃ وکانت قریش تتصوران تایید ھا لرسالۃ محمد انما یعنی شیئا واحدا ھو ان تتحلل الامم المجاورۃ لھا بل وقبائل العرب نفسھا المقیمۃ علی الوثنیۃ من تعھد اتھا بحمایۃ تجارۃ قریش وقوافلھا واذا حدث ذلک فھذا یعنی موت قریش تجاریا واقتصادیا وانتھاء عصر سیادتھا علی العرب

قریش کے اموال اور ان کی تجارتیں مشرق و مغرب میں سفر کرتی تھیں۔ یہ سفر تجارتی معاہدوں کے تحت ہوتا تھا جو انھوں نے دوسری قوموں سے کر رکھا تھا۔ مثلاً فارس، حبشہ اور بیزنطینی سلطنت۔ قریش کا خیال تھا کہ اگر انھوں نے رسالت محمدی کی تائید کی تو اس کا مطلب صرف ایک ہوگا، وہ یہ کہ پڑوسی قومیں اور عرب کے بت پرست قبائل معاہدات ختم کر دیں گے جو انھوں نے قریش کے تجارتی قافلوں کے بارے میں کر رکھے ہیں اور جب ایسا ہوگا تو یہ قریش کی تجارتی موت کے ہم معنی ہوگا اور عرب پر ان کی قیادت ختم ہو جائے گی۔

چنانچہ سورہ واقعہ کی آیت (وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ) کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ تم تکذیب کو اپنی غذا بنا رہے ہو۔ یعنی یہ سمجھ رہے ہو کہ پیغمبر اسلام کی دعوت توحید کا انکار کر کے تم اپنی اقتصادیات اور اموال کو محفوظ رکھ سکو گے۔

آپ کی دعوت کے نتیجہ میں آپ کا وجود ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ دیکھنے والا دوسرے شخص سے پوچھتا کیا یہی وہ ہیں (اھو ھو، ابویعلی):

ویمضی بین رحالهم وهم یشیرون الیه بالاصابع (احمد بروایت جابر)	آپ قافلوں کے درمیان چلتے تو لوگ انگلیوں سے آپ کی طرف اشارہ کرتے۔

اب کوئی مکہ آتا تو واپس جا کر اپنے ساتھی کو دوسری باتوں کے ساتھ یہ خبر بھی دیتا کہ محمد بن عبد اللہ تنبأ وقد تبعه ابن ابی قحافة (محمد بن عبد اللہ نے نبوت کا دعوی کیا ہے اور ابن ابی قحافہ ان کا ساتھ دے رہے ہیں) قریش نے آپ کا نام محمد کے بجائے مذمّم رکھ دیا۔ وہ آپ پر تحمیق اسلاف اور تسفیہ آبار کا الزام لگاتے۔ آپ کے راستہ میں رات کے وقت گندی چیزیں ڈال دیتے۔ ایک بار آپ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: یابنی عبد مناف، ای جوار هذا، تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ۸۶ (اے گروہ قریش یہ کیسا پڑوس ہے)

ابوطالب کی زندگی تک وہ آپ کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ کیونکہ قبائلی نظام کے تحت آپ سے جنگ کرنا پورے قبیلہ بنی ہاشم سے جنگ کرنے کے ہم معنی تھا۔ عمر بن الخطاب جب اسلام سے پہلے ایک بار تلوار لے کر آپ کے قتل کے ارادے سے نکلے تو ایک شخص کا یہ جملہ آپ کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی تھا: کیف تامن من بنی هاشم اذا قتلت محمدا۔ جب بھی کوئی شخص آپ کے خلاف جارحانہ ارادہ کرتا تو فوراً یہ سوال اس کے سامنے آجاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں جو جارحانہ مظالم ہوئے وہ زیادہ تر غلاموں اور لونڈیوں کے خلاف ہوئے۔ امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ ابتدائی دور میں سات افراد نے مکہ میں اسلام کا اعلان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمار، سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد:

فامارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمنعه اللہ بعمه واما ابوبکر منعه اللہ بقومه واما سائرهم فاخذهم المشرکون فالبسوهم ادرع الحدید وصهروهم فی الشمس (احمد بروایت ابن مسعود)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے ان کے چچا کے ذریعہ محفوظ رکھا۔ حضرت ابوبکر کی حفاظت ان کی قوم کے ذریعہ کرائی۔ بقیہ مسلمانوں کو مشرکین نے پکڑا۔ ان کو لوہے کی زرہیں پہنائیں اور سخت دھوپ میں انھیں تپایا۔

امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ جب بنی ہاشم کے سردار ابوطالب کی وفات ہوگئی تو قریش کے کسی بدتمیز شخص نے آپ کے اوپر مٹی ڈال دی۔ آپ گھر واپس آئے تو آپ کی ایک لڑکی نے مٹی جھاڑی۔ اس وقت آپ نے فرمایا: مجھے قریش سے اب تک کسی مکروہ چیز کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ابوطالب کی وفات ہوگئی تو انھوں

نے اس قسم کی حرکتیں شروع کر دیں۔ حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت میں ہے :

لما مات ابو طالب تجھموا بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا عم إما اسرع ما وجدت فقدك (ابونعیم فی الحلیہ، ج ۸)

ابوطالب کی وفات ہو گئی تو قریش مکہ نے آپ کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کیا، آپ نے فرمایا: چچا، آپ کے نہ ہونے کا احساس مجھے کتنی جلد ہو گیا۔

ابوطالب کی وفات کے بعد قریش میں آپ کے قتل کے مشورے شروع ہو گئے۔ ابوجہل کا آپ کے سر میں اوجھ ڈالنا اور عقبہ بن معیط کا آپ کی گردن میں چادر ڈال کر کھینچنا اسی دور کے واقعات ہیں جب کہ گلا گھونٹ کر آپ کو مار ڈالنے کی کوشش کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ ابوطالب کی وفات کے بعد بظاہر آپ کے خلاف جارحانہ کارروائی کے لئے راستہ صاف ہو گیا تھا تاہم ایک قسم کی جھجک اس لئے باقی تھی کہ یہ عرب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ اس کے علاوہ خود مشرکین میں اب بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو ضمیر کی آواز کے تحت آپ کی حمایت کرتے تھے۔ مثلاً ابوجہل نے جب پہلی بار آپ کے سر اور گردن میں اوجھ ڈال کر آپ کا گلا گھونٹنا چاہا تو تو ابوالبختری کو خبر ہوئی، وہ کوڑا لے کر خانہ کعبہ میں آیا، جہاں ابوجہل فاتحانہ انداز سے اپنے ساتھیوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ تحقیق کے بعد جب واقعہ صحیح نکلا تو اس نے اسی وقت ابوجہل کے سر پہ اتنے زور سے کوڑا مارا کہ وہ چلا اٹھا۔

مذاہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ شرک، اپنے خلاف تنقید سننے کے لئے، ہمیشہ بے حد حساس رہا ہے۔ پھر قدیم زمانہ میں چونکہ اجتماعی نظام کی بنیاد بھی شرک ہی پر قائم ہوتی تھی اس لئے اس شدت کے حق میں سیاسی اسباب بھی جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مکہ کے ماحول میں توحید کی دعوت آپ کے لئے انتہائی صبر آزما ثابت ہوئی۔ ابتدائی تین سال تک چند آدمیوں کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہ لا سکا۔ دو مربع کیلومیٹر میں آباد مکہ میں جس طرح درخت کا کوئی سایہ نہ تھا، اسی طرح وہ آپ کے ساتھیوں اور طرف داروں سے بھی خالی تھا۔ بستی میں صرف چار آدمی تھے جو آپ کے قریب ہو سکے تھے: خدیجہ، علی، زید اور ابوبکر۔ اگر حضرت ابوبکر کی بچی عائشہ کو بھی شامل کر لیا جائے، جو گویا پہلی پیدائشی مسلمان تھیں، تو آپ کے حامیوں کی تعداد پانچ ہو جاتی ہے۔

تین سال تک یہی سلسلہ جاری رہا، اس وقت یہ حال تھا کہ آپ گھر سے باہر نکلتے تو دیوانوں کی طرح آپ کا استقبال کیا جاتا۔ ایک روز ابوجہل کی تحریک سے ایک جماعت آپ کو گالیاں دے رہی تھی اور آپ کو برا بھلا کہہ رہی تھی کہ ایک شخص ادھر سے گزرا۔ مکہ کے ایک معزز شخص کے خلاف یہ سلوک اس کو ناقابل برداشت معلوم ہوا۔ وہ آپ کے چچا حمزہ کے یہاں گیا "آپ کی غیرت کو کیا ہوا" اس نے کہا " لوگ آپ کے بھتیجے کو ذلیل کر رہے ہیں اور آپ ان کی مدد نہیں کرتے "، حمزہ بن عبد المطلب کی عرب غیرت جوش میں آئی، اسی وقت ابوجہل کے یہاں پہنچے اور اپنی لوہے کی کمان اس کے سر پہ دے ماری اور کہا کہ "آج سے میں بھی محمد کا دین قبول کرتا ہوں، تم کو جو کرنا ہو کرو" (دینی دین محمد، فامنعو نی ذلك ان کنتم صادقین، طبرانی)

حمزہ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ اب کچھ لوگوں کو حوصلہ ہوا اور مسلمانوں کی تعداد ۳۰ تک پہنچ گئی۔ اس وقت مکہ میں دو انتہائی بااثر افراد تھے۔ ایک عمر بن الخطاب، دوسرے ابوجہل بن ہشام۔ آپ نے دعا فرمائی کہ خدایا، ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ اسلام کو طاقت پہنچا (اللّٰھم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب او بابی جھل بن ھشام) آپ کی یہ پکار اول الذکر کے حق میں قبول ہوئی۔ نبوت کے چھٹے سال حضرت عمر کا اسلام بہت سے دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کا سبب بنا اور اب مسلمانوں کی تعداد چالیس ہوگئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مسلمان ابن ارقم کے مکان میں اپنا پوشیدہ مرکز بنائے ہوئے تھے۔ البدایہ والنہایہ میں دار ارقم میں جمع ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ۳۹ بتائی گئی ہے۔

مگر جو لوگ مروجہ نظام کے زیر سایہ عمل کر رہے ہوں، ان کی طاقت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک عارضی وقفہ کے بعد مظالم کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ آپ کو ہر قسم کی تکلیف دینے کے باوجود وہ آپ کو قتل نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ قبائلی رواج کے مطابق کسی قبیلہ کے ایک فرد کو قتل کرنا پورے قبیلہ سے جنگ کرنے کے ہم معنی تھا۔ یہی مسئلہ تھا جس کی بنا پر حضرت شعیب کی قوم نے ان سے کہا کہ اگر تمہارے قبیلہ کا خوف نہ ہوتا تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے (ہود۔۹۱) قریش نے بنی ہاشم کے سردار اور آپ کے چچا ابوطالب بن عبدالمطلب سے مطالبہ کیا کہ وہ آپ کو قبیلہ سے خارج کر دیں تاکہ قریش کے لئے آپ کو قتل کرنا ممکن ہو جائے۔ مگر ابوطالب کی غیرت اس کے لئے تیار نہ ہوئی۔ ایک بار قریش کی شکایت پر جب ابوطالب نے آپ سے کہا کہ تم ان کے بتوں پر تنقید کرنا چھوڑ دو تو آپ کو اندیشہ ہوا کہ وہ آپ کو قریش کے حوالے کر دیں گے (فظن انہ قد بدالعمہ فیہ وانہ مسلمہ) مگر ابوطالب نے فوراً یہ یہ کہہ کر آپ کو مطمئن کر دیا: واللہ لا اسلمك لشئ ابدا (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۶۰)۔ اب قریش نے ایک اجتماعی معاہدہ کر کے بنی ہاشم کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ یہ نبوت کا ساتواں سال تھا، اس کے بعد ابوطالب آپ کو اور آپ کے خاندان کو لے کر مکہ کے باہر نکل گئے اور ایک گھاٹی میں مقیم ہوئے جس کو شعب ابی طالب کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خشک پہاڑی درہ تھا جس میں بعض جنگلی درختوں کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ آپ تین سال تک اس حال میں رہے کہ درخت کی پتیاں اور جڑیں کھا کر گزارہ کرتے، اس سے مستثنیٰ صرف وہ چار حرام مہینے تھے جب کہ آپ کے خاندان کے لوگ مکہ جاتے اور قربانی کے جانوروں کا گوشت لے آتے اور اس کو سکھا کر رکھ لیتے جو عرصہ تک غذا کا کام دیتا تھا۔

تین سال بعد نبوت کے دسویں برس معاہدہ ختم ہوگیا مگر اس کی شدت ابوطالب کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ابوطالب کے انتقال (۶۲۰) کے بعد قبیلہ کے سب سے بزرگ فرد کی حیثیت سے عبدالعزیٰ (ابولہب) بنی ہاشم کا سردار بن گیا۔ اب دشمن خود جج کی کرسی پر تھا۔ اس نے آپ کو قبیلہ سے خارج کیے جانے کا اعلان کر دیا۔

قبیلہ سے اخراج

عرب کی صحرائی زندگی میں کسی شخص کا قبیلہ سے خارج کر دیا جانا ایسا ہی تھا جیسے کسی کو سمندر میں دھکیل

دیا جائے۔ کیوں کہ قبائلی نظام میں، جب کہ کوئی ذمہ دار ملکی حکومت نہیں ہوتی تھی، کوئی شخص کسی قبیلہ کی حمایت ہی میں زندگی گزار سکتا تھا۔ منیٰ کی قیام گاہوں میں ایک بار آپ نے ایک قبیلہ کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ قبیلہ نے ماننے سے انکار کیا۔ تاہم ان میں سے ایک شخص میسرہ بن مسروق عبسی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے آپ کی دعوت کا اثر قبول کیا ہے:

فطمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی میسرۃ فکلمہ، فقال میسرۃ: ما احسن کلامک وانورہ ولکن قومی یخالفوننی وانما الرجل بقومہ (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میسرہ سے امید ہوئی۔ آپ نے ان سے بات کی، میسرہ نے جواب دیا، آپ کی بات کتنی اچھی اور نورانیت سے بھری ہوئی ہے۔ مگر میری قوم مخالف ہے اور آدمی اپنی قوم ہی کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

ان حالات میں قبیلہ سے اخراج آپ کے لئے انتہائی سنگین واقعہ تھا۔ اب اپنے وطن میں آپ کے لئے کوئی سایہ نہ تھا۔ آپ کے لئے واحد صورت یہ تھی کہ اپنے لئے کوئی دوسرا حمایتی قبیلہ تلاش کریں۔ مکہ سے نکل کر طائف جانا اس سلسلے میں آپ کی پہلی کوشش تھی۔ حضرت عائشہ سے اس سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے ایک بار آپ نے کہا: اذ عرضت نفسی علی ابن عبد یالیل بن عبد کلال (جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یالیل کے سامنے پیش کیا) عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں:

ومات ابوطالب وازداد من البلاء علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدۃ فعمد الی ثقیف یرجوان یؤووہ وینصروہ (ابونعیم فی دلائل النبوۃ)

ابوطالب کی وفات کے بعد آپ کو بہت زیادہ تکلیفیں پہنچائی جانے لگیں۔ اس وقت آپ نے قبیلہ ثقیف (طائف) کا رخ کیا، اس امید میں کہ وہ آپ کو پناہ دیں گے اور آپ کی مدد کریں گے۔

مگر وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا، اس کی ایک جھلک اس دعا میں نظر آتی ہے جو طائف سے واپسی کے وقت آپ کے لہولہان چہرہ سے نکلی تھی:

اللھم الیک اشکو اضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی الناس یا ارحم الراحمین (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)

خدایا میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کی کمی کی اور اپنے وسائل کی قلت کی اور لوگوں کی نظر میں حقیر ہونے کی۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔

طائف سے لوٹتے ہوئے آپ نے ان سے کہا: تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کی خبر مکہ تک نہ پہنچے، ورنہ انھیں مزید جسارت ہو جائے گی۔ (تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ۹۸)

طائف سے واپس ہو کر دوبارہ آپ مکہ کے باہر مقیم ہوئے اور شہر کے مختلف لوگوں کے پاس پیغام بھیجا کہ کوئی آپ کو اپنی شخصی حمایت میں لے لے تو مکہ میں آکر رہ سکیں۔ بالآخر مطعم بن عدی نے آپ کی حمایت قبول کی اور اس کے لڑکوں کی تلوار کے سایہ میں آپ دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے۔

اب آپ نے یہ منصوبہ بنایا کہ مختلف میلوں اور بازاروں میں اطراف کے جو قبائل مکہ آتے ہیں، ان میں جائیں اور ان کو آمادہ کریں کہ وہ آپ کو اپنی حمایت میں لے لیں۔ آپ نے اپنے چچا عباس سے کہا:

لا اری لی عندک ولا عند اخیک منعۃ فہل انت مخرجی الی السوق غدا حتی نقر فی منازل قبائل الناس (البدایہ والنہایہ، جلد ۳)	تمھارے اور تمھارے اقربا کے یہاں میرے لئے حفاظت نہیں۔ کیا آپ کل مجھے بازار لے چلیں گے تاکہ ہم لوگوں کی قیام گاہوں پر چل کر ٹھہریں اور ان سے بات کریں۔

آپ ایک ایک قبیلہ کی قیام گاہ پر جاتے اور اس سے پوچھتے کہ تم لوگوں کے یہاں حفاظت کا کیا انتظام ہے (کیف المنعۃ فیکم)۔ ان کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے (یعرض علیہم نفسہ) ان سے کہتے کہ میرے قبیلہ نے مجھ کو نکال دیا ہے (کذبنی وطردنی) تم مجھ کو اپنی حفاظت میں لے لو تاکہ میں تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دے سکوں (یمنعونی ویؤوونی حتی ابلغ عن اللہ عزوجل ما ارسلنی بہ، ۷۷) مورخین نے اس سلسلے میں پندرہ قبیلوں کے نام لکھے ہیں جن سے آپ فرداً فرداً ملے۔

مگر قبائل کو معلوم تھا کہ قریش کے نکالے ہوئے ایک شخص کو پناہ دینا کس قدر خطرناک ہے۔ چنانچہ ہر ایک نے آپ کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا۔ ایک قبیلہ کے کچھ لوگوں میں آپ کی بابت نرمی پیدا ہوئی تو اس کے ایک بزرگ نے کہا:

اخرجتہ عشیرتہ وتوؤونہ انتم تحملون حرب العرب (ابونعیم فی دلائل النبوۃ)	اس کے قبیلہ نے اس کو نکال دیا ہے اور تم اس کی پشت پناہی کرنا چاہتے ہو کیا تم تمام عرب سے لڑائی مول لینا چاہتے ہو۔

وہ جانتے تھے کہ کسی قبیلہ سے نکالے ہوئے شخص کو حفاظت میں لینا اس قبیلہ سے اعلان جنگ کے ہم معنے ہے اور جب کہ یہ قبیلہ قریش ہو جس کو پورے ملک پر سیادت حاصل ہو تو مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ عرب روایات میں یہ بات انتہائی معیوب تھی کہ کوئی شخص کسی سے پناہ طلب کرے اور وہ اس کو پناہ نہ دے۔ عرب تاریخ میں یہ پہلا نمایاں واقعہ تھا کہ آپ کئی سال تک مختلف قبائل کے درمیان پھرتے رہے، مگر کوئی آپ کو پناہ دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ نہ طائف کے لوگ نہ دیگر عرب قبائل۔ اس کی وجہ آپ کے معاملہ کی مخصوص نوعیت تھی۔ آپ کا "طرد" کرنے والے قریش تھے جو سارے عرب کے قائد تھے۔ قریش کے نکالے ہوئے ایک شخص کو پناہ دینے کا مطلب سارے عرب سے جنگ مول لینے کے ہم معنی تھا۔ یہی پس منظر تھا جس کی بنا پر انصار سے بیعت کے وقت ابوالہیثم بن التیہان ؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

فاعلموا انہ ان تخرجوہ رمتکم العرب عن قوس واحدۃ (طبرانی)	جان لو، اگر تم ان کو اپنے یہاں لے گئے تو سارے عرب مل کر تم کو ایک تیر سے نشانہ بنالیں گے۔

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی وہ قبائل جو سرحدی علاقوں میں آباد تھے، ان کے تمدن کی غیر عرب

حکومتوں سے معاہدات تھے، وہ ڈرتے تھے کہ آپ جیسی ایک متنازعہ شخصیت کو اپنے ساتھ لے جائیں تو ان حکومتوں سے کوئی جھگڑا نہ شروع ہو جائے۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ آپ منیٰ کے میلہ میں گئے وہاں بنو شیبان بن ثعلبہ کے سرداروں سے آپ کی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے آپ کے پیغام کی تحسین کی۔ مگر آخر میں ہانی بن قبیصہ نے کہا کہ ہم کسریٰ (شاہ فارس) کی مملکت کی سرحد پر بسے ہوئے ہیں اور شاہان فارس سے ہمارے معاہدے ہیں:

ولعل ھذا الامر الذی تدعو الیہ تکرھہ الملوك (البدایہ والنہایہ)

اور جس چیز کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں شاید وہ بادشاہوں کی ناراضگی کا باعث ہو۔

اس زمانہ میں آپ پر جو بے بسی کا عالم تھا اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہوتا ہے جو اس سلسلہ میں روایات میں آئے ہیں۔ ایک بار آپ ایک قبیلہ میں گئے جس کو بنو عبد اللہ کہا جاتا تھا:

فدعاھم الی اللہ وعرض علیھم نفسہ حتی انہ لیقول: یابنی عبد اللہ! ان اللہ قد احسن اسم ابیکم فلم یقبلوا منہ ما عرض علیھم (البدایہ والنہایہ)

ان کو آپ نے خدا کی طرف بلایا اور اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کیا کہ وہ آپ کو اپنی حمایت میں لے لیں۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا اے بنو عبد اللہ! اللہ نے تمھارا نام کتنا اچھا رکھا ہے، پھر بھی انھوں نے وہ چیز قبول نہ کی جو آپ نے ان کے سامنے پیش کی تھی۔

اس طرح مکی زندگی کے آخری تقریباً تین سال مختلف قبائل کے درمیان اپنا حامی تلاش کرنے میں گزر گئے۔ مگر ہر قسم کی جد وجہد کے باوجود کوئی قبیلہ بھی آپ کی حمایت کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ بعض قبائل کہہ اٹھے، کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ آپ ہم سے مایوس ہو جائیں (اما آن لك ان تیأس منا) بالآخر اللہ تعالیٰ نے یثرب (مدینہ) کے قبائل اوس اور خزرج کو اس کی توفیق عطا فرمائی۔ اوس اور خزرج کی اس آمادگی کا ایک خاص نفسیاتی پس منظر بھی تھا۔ یہ قبائل یہود کے پڑوس میں بسے ہوئے تھے۔ خیبر کے یہودی اس علاقہ کی بہترین زمینوں پر قابض تھے، تجارتیں بھی انھیں کے قبضہ میں تھیں۔ چنانچہ یثرب کے عربوں (اوس و خزرج) کی معاشیات کا بڑا ذریعہ خیبر کے یہودیوں کے یہاں مزدوری کرنا تھا۔ ہجرت کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اپنے ہاتھوں سے مسجد نبوی کی تعمیر کر رہے تھے تو آپ کی زبان پر یہ شعر تھا (البدایہ والنہایہ):

ھذا الحمال لاحمال خیبر — ھذا ابرّ ربنا واطھر

(یہ مزدوری ہے مگر خیبر کی مزدوری کی طرح نہیں۔ ہمارے رب کی قسم یہ اس سے بہت بہتر اور بھلی ہے)

یہودیوں کے اقتصادی غلبہ اور استحصال کی وجہ سے ان میں اور اوس و خزرج میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ ان سے یہودی کہا کرتے تھے کہ ہماری کتابوں کے مطابق جلد ہی عرب میں ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے۔ وہ جب آئے گا تو ہم اس کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں گے اور تم کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیں گے۔ یہودیوں کے اسی قول کی طرف قرآن کے ان الفاظ میں اشارہ ہے (وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا، بقرہ۔ ۸۹) اوس و خزرج

کے لوگوں نے آپ کی دعوت سنی تو انھوں نے کہا "بخدا یہی وہ نبی ہے جس کے بارے میں یہود ہم سے کہا کرتے تھے۔ قبل اس کے کہ یہود سبقت کریں ہمیں آپ پر ایمان لاکر آپ کے گروہ میں شامل ہو جانا چاہئے"۔ اس مخصوص پس منظر کے علاوہ دوسرے تاریخی اور سماجی اسباب بھی تھے جس کی وجہ سے اوس و خزرج کے لئے آپ کی بات کو سمجھنا اور اس کو مان لینا دیگر عرب قبائل کے مقابلہ میں آسان ہو گیا اور انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اب وہ وقت آگیا تھا جس کے آپ برسوں سے منتظر تھے۔ آپ کو ایک ایسی جگہ مل گئی تھی جہاں قبائلی حمایت کے تحت اپنی جدوجہد کو مؤثر شکل میں جاری رکھ سکیں اور مکہ اور اطراف مکہ کے مسلمانوں کو ایک مقام پر جمع کر کے اس کو اسلامی مرکز بنا دیں۔ اہل یثرب کا بڑی تعداد میں اسلام لانا اس بات کا امکان پیدا کرتا تھا کہ کہ اسلام کی متفرق طاقتوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کر دیا جائے اور پھر دعوت حق کی جدوجہد کو زیادہ مؤثر شکل میں جاری رکھا جا سکے۔ چنانچہ جب اوس و خزرج نے بیعت کر لی تو تاریخ میں آتا ہے کہ:

قال: فلم یلبث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا یسیرا حتی خرج الی اصحابہ فقال لھم: احمد واللہ کثیرا فقد لظفرت الیوم ابناء ربیعۃ باھل فارس

آپ فوراً اپنے اصحاب کی طرف لوٹے اور ان سے کہا۔ خدا کا شکر کرو، اللہ نے آج کے دن ربیعہ کی اولاد کو اہل فارس پر غلبہ دے دیا

البدایہ والنہایہ، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵

آپ نے ہجرت کی تیاری شروع کر دی۔ آپ کے انتہائی اخفا کے باوجود قریش کو بھی خبریں مل رہی تھیں۔ طبرانی نے حضرت عروہ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

ان مشرکی قریش اجمعوا امرھم ومکرھم حین ظنوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خارج وعلموا ان اللہ قد جعل لہ بالمدینۃ ماوی ومنعۃ وبلغھم اسلام الانصار ومن خرج الیھم من المھاجرین، فاجمعوا امرھم علی ان یاخذوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاما ان یقتلوہ واما ان یسجنوہ واما ان یوثقوہ واما ان یخرجوہ

مشرکین قریش نے جب یہ گمان کر لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے چلے جائیں گے اور انھیں معلوم ہوا کہ اللہ نے آپ کے لئے مدینہ میں ٹھکانا اور حفاظت کا انتظام کر دیا ہے اور انھوں نے سنا کہ انصار نے اسلام قبول کر لیا ہے اور مہاجرین مدینہ میں جمع ہو رہے ہیں تو انھوں نے آپ کے خلاف سازش کی اور طے کیا کہ آپ کو گرفتار کر لیں اور اس کے بعد یا تو قتل کر دیں یا قید میں ڈال دیں یا شہر بدر کر دیں یا باندھ کر رکھیں۔

(اخرجہ الطبرانی عن عروہ مرسلا)

اوس و خزرج کے ایمان کے بعد آپ نے چھ مہینے کے دوران سفر کا انتہائی کامل منصوبہ بنایا، اور اس کے بعد نہایت خاموشی سے مکہ سے نکل گئے۔

مدینہ کے قبائل (انصار) نے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا ساتھ دیا وہ تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ لوگ کسی کو کوئی چیز دیتے ہیں تو وہ یا بدلہ کے طور پر ہوتا ہے یا خوف کی وجہ سے۔ لین دین کی تیسری قسم وہ ہے جو "برکت" کے تصور کے تحت وجود میں آتی ہے۔ کچھ زندہ یا مردہ لوگوں کے بارے میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ "بزرگ" ہیں، اور ان کے اوپر خرچ کرنا یا چڑھاوا چڑھانا اولاد اور اموال میں ترقی کا باعث ہوگا۔ مگر معلوم انسانی تاریخ میں غالباً یہ پہلی نمایاں مثال ہے کہ ایک قوم نے خالص مقصدی بنیادوں پر لٹے پٹے مہاجرین کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے۔ ان کو نہ صرف اپنے گھروں میں جگہ دی بلکہ مواخاۃ قائم کرکے ان کو سگے بھائی کی طرح اپنی جائدادوں میں حصہ دار بنا دیا۔ اور یہ سب کچھ یہ جانتے ہوئے کیا کہ مہاجرین کی یہ امداد صرف اقتصادی قربانی ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ عرب وعجم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ حضرت علی کے یہ دو الفاظ ان کی بہترین تصویر ہیں:

کانوا اصدقاء صبراء	(اوس وخزرج کے لوگ) بڑے سچے اور بڑے صبر کرنے والے تھے۔
(البدایہ والنہایہ، جلد ۳)	

جب مہاجرین اپنا وطن چھوڑ کر یثرب پہنچے تو انصار کا یہ حال تھا کہ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ مجھے میزبانی کا شرف حاصل ہو۔ حتیٰ کہ اس کے لئے قرعہ اندازی کی نوبت آگئی۔ انھوں نے اپنے اموال کے بہترین حصہ کو مہاجرین کے حوالے کر دیا (ولقد تشاحّوا فینا حتی ان کانوا لیقترعون علینا ثم کنا فی اموالھم احق بھا منھم) ان کے غیر معمولی ایثار کے باوجود ان سے باقاعدہ بیعت لی گئی کہ عہدوں کی تقسیم میں دوسروں کو ان پر ترجیح دیجائیگی (اثرۃ علینا) مگر وہ اس کے لئے جھگڑا نہ کریں گے (ان لاننازع الامر اھلہ)

تہذیب سیرت ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۱۱۱

تاہم ہجرت کے بعد مدینہ کی زندگی آپ کے لئے کوئی آرام کی زندگی نہ تھی۔ اہل عرب کی متحدہ جارحیت کے بارے میں تمام اندیشے اپنی بدترین شکل میں صحیح ثابت ہوئے۔ حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں:

لما قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصحابہ المدینۃ وآوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ فکانوا لا یبیتون الا فی السلاح ولا یصبحون الا فیہ	جب آپ اور آپ کے اصحاب مدینہ آئے اور انصار نے انھیں پناہ دی تو تمام عرب نے مل کر آپ کو نشانہ پر لے لیا۔ مدینہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہوا کہ وہ ہتھیاروں کے ساتھ رات گزارتے اور ہتھیار کے ساتھ صبح کرتے۔
(کنز العمال جلد ۱، صفحہ ۲۵۹)	

قریش نے تمام عرب میں اہل مدینہ کے معاشی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ شہر کی معاشیات اچانک بڑھ جانے والی دگنی آبادی کے لئے انتہائی ناکافی ہو گئیں۔ اس پر مزید آئے دن ہونے والی جنگوں کے اخراجات، ان چیزوں نے

معاشی تنگی کو اپنے آخری درجہ پر پہنچا دیا۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اسلام کو مدینہ میں دیکھا ہے۔ آپ سارے دن بھوک سے بے قرار رہتے۔ ردی کھجوریں بھی اتنی میسر نہ آتیں جس سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ بعد کے دور میں حضرت عائشہ سے کسی نے چراغ کا ذکر کیا تو انھوں نے جواب دیا: اگر ہمارے پاس چراغ جلانے کے لئے تیل ہوتا تو اس کو ہم پی جاتے۔ غزوات میں بے سروسامانی کا عالم یہ تھا کہ حضرت ابوموسیٰ فرماتے ہیں، ہم لوگ آپ کے ہمراہ غزوہ کے لئے نکلے۔ ہمارے پاس چھ آدمیوں کے درمیان صرف ایک اونٹ تھا جس پر ہم باری باری سوار ہوتے۔ مسلسل پیدل چلنے کی وجہ سے ہمارے قدم چھلنی ہو گئے اور ہم نے اپنے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لئے، اسی لئے اس غزوہ کا نام ذات الرقاع (چیتھڑوں والا) رکھا گیا۔ غزوات کے سفر میں کھانے کا ذخیرہ اتنا کم ہوتا تھا کہ بعض اوقات لوگ کھجور کو کھانے کے بجائے چوستے تھے، اور بقیہ کمی کو ببول کے پتوں اور ٹڈیوں کے ذریعہ پوری کرتے تھے۔ اس پر مزید اضافہ وہ بیماری تھی جو غذائی عادت کی تبدیلی سے پیدا ہوئی۔ مکہ کے باشندے گوشت اور دودھ کے عادی تھے۔ مدینہ میں انھیں کھجور کھانے کو ملی۔ طبرانی نے روایت کیا ہے کہ ایک روز جب کہ آپ جمعہ کی نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں تشریف لائے، ایک مکی مسلمان نے چلا کر کہا:

یارسول اللہ! احرق بطوننا التمر (طبرانی) — اے خدا کے رسول! کھجور نے ہمارے پیٹوں کو جلا دیا

آپ کے مدینہ پہنچنے کے بعد اسلام عملی اور تاریخی طور پر دعوت کے مرحلہ سے نکل کر عملی مقابلہ کے مرحلہ میں داخل ہو گیا۔ دور دعوت میں آپ کا اصول یہ تھا کہ لوگوں کے معاشی، سیاسی، قبائلی اور اس طرح کے دوسرے نزاعی مسائل کو نہ چھیڑتے ہوئے اور اس سے بے تعلق رہ کر خالص "انذار وتبشیر" کے کام میں مشغول رہیں۔ بنی عامر بن صعصعہ کو آپ نے سوق عکاظ میں اسلام کی دعوت دی تو انھیں یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ میں صرف پُرامن طور پر اپنا دینی پیغام پہنچاؤں گا۔ اس کے علاوہ تمھارے درمیان کوئی سیاسی، اقتصادی یا قبائلی جھگڑا نہیں کھڑا کروں گا۔ آپ نے ان سے فرمایا:

انی رسول اللہ، فان اتیتکم تمنعونی حتی ابلغ رسالۃ ربی ولم اکرہ احدا منکم علی شیئ	میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں تمھارے یہاں آؤں تو کیا تم میری حفاظت کرو گے تاکہ میں اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا دوں اور میں تم میں سے کسی کو کسی چیز پر مجبور نہیں کروں گا۔
ابونعیم، دلائل النبوۃ، ۱۰۰	

بعثت کے اصل مقصد کی حیثیت سے یہ کام اب بھی بدستور جاری تھا۔ مگر اب اسلام کو ایک اور چیز سے نمٹنا تھا۔ اور وہ ماحول کے پیدا کردہ عملی مسائل تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنے سامنے بنیادی اصول یہ رکھا کہ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے لوگوں کے دل اسلام کے لئے نرم پڑ جائیں، اور لڑائی بھڑائی کے بغیر اسلامی مقاصد تک پہنچنا ممکن ہو سکے۔ یہی وہ بات ہے جس کو آپ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے:

نصرت بالرعب علی مسیرۃ شہر — ایک مہینہ تک کی مسافت کے رعب سے میری مدد کی گئی ہے۔

اس طریق عمل کے دو خاص پہلو تھے۔ ایک قوت مرہبہ کا حصول (انفال - ۶۰) دوسرے تالیف قلب (توبہ - ۶۰)

تالیف قلب کے تحت آپ نے لوگوں کو اس کثرت سے اموال دیئے کہ داد و دہش کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ صفوان بن امیہ مکہ کے بڑے سردار تھے۔ فتح مکہ کے بعد وہ بھاگ کر ایک گھاٹی میں چھپ گئے۔ آپ نے انھیں امان دے کر بلایا۔ ہوازن کی فتح کے بعد جب آپ جعرانہ کے مقام پر مال غنیمت کی دیکھ بھال کر رہے تھے، اس وقت صفوان بن امیہ آپ کے ساتھ تھے اور ابھی حالت کفر میں تھے۔ صفوان بن امیہ ایک گھاٹی پر پہنچے جو بکریوں اور اونٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ حیرت و استعجاب کے ساتھ مسلسل اس کو دیکھتے رہے۔ آپ نے ان کا یہ حال دیکھ کر پوچھا " اے ابو وہب! کیا یہ مال سے بھری ہوئی گھاٹی تم کو پسند ہے "، صفوان نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا ھولك وما فیہ (وہ اور اس میں جو کچھ ہے، سب تمھارا ہے) صفوان نے یہ سن کر کہا، نبی کے سوا کسی کا نفس اتنی بڑی سخاوت نہیں کر سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ (فاسلم مکانہ) کنز العمال جلد ۵، صفحہ ۲۹۴

آپ کا متعدد شادیاں کرنا بھی ایک اعتبار سے اسی ذیل کا ایک واقعہ ہے۔ قبائلی نظام میں رشتہ داری اولین اہمیت کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ ہجرت کے بعد آپ کا کئی شادیاں کرنے کا اہم پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعہ بے شمار لوگوں سے رشتہ داریاں قائم ہو گئیں اور ان کے قلوب آپ کے اور آپ کی دعوت کے حق میں نرم پڑ گئے۔ پہلی شادی کے علاوہ، جو آپ نے تقریباً دگنی عمر کی بیوہ سے نبوت سے پہلے کی تھی، دوسری شادیاں حقیقۃً ازدواجی تقاضے کے تحت وقوع میں نہیں آئیں، بلکہ ان کے ذریعہ اہم دعوتی اور سیاسی فائدے حاصل کرنا مقصود تھا۔

معاہدہ حدیبیہ کی رو سے اگلے سال (۶۲۸) آپ دو ہزار مسلمانوں کے ساتھ کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ گئے۔ اس موقع پر تین روزہ قیام کے دوران آپ نے میمونہ بنت الحارث سے نکاح کیا جو بیوہ ہو گئی تھیں۔ میمونہ کی آٹھ بہنیں تھیں جن کی شادی مکہ کے آٹھ ممتاز گھرانوں میں ہوئی تھی۔ آپ نے میمونہ سے نکاح کر کے آٹھ خاندانوں سے اپنی رشتہ داری قائم کر لی۔ نیز خالد بن ولید میمونہ کے بھتیجے تھے اور انھوں نے ان کو اپنے بچے کی طرح پالا تھا۔ نکاح کے بعد قریش کا سب سے بڑا فوجی سردار آپ کا بیٹا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد پھر خالد بن ولید مسلمانوں کے خلاف کسی معرکہ میں نہیں نکلے اور جلد ہی مسلمان ہو گئے۔ اس تقریب سے آپ نے مکہ والوں کی دعوت ولیمہ کا بھی انتظام کیا تھا۔ مگر مکہ والوں نے کہا کہ معاہدہ کے مطابق آپ صرف تین روز مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں اور یہ مدت پوری ہو چکی ہے، آپ کو فوراً واپس جانا چاہیے۔ اس لئے آپ مکہ والوں کو ولیمہ نہ کھلا سکے جو درحقیقت ان کی تالیف قلب کے لئے انتہائی اہمیت رکھتا تھا۔ خالد بن الولید اور عمرو بن العاص دونوں ایک ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو ان کو دیکھ کر ایک شخص چیخ پڑا: ان دو کے بعد مکہ نے اپنی نکیل دے دی (قد اعطت مکۃ المقادۃ بعد ھذین، اخرجہ البیہقی من طریق الواقدی)

ام حبیبہ بنت ابو سفیان اور ان کے شوہر عبید اللہ بن جحش نے اسلام قبول کر لیا تھا اور دونوں ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ وہاں ان کے شوہر نے نصرانیت اختیار کر لی، اس کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ام حبیبہ

سے نکاح کا منصوبہ بنایا۔ اس طرح آپ ابوسفیان کے داماد ہوجاتے تھے جو بدر میں ابوجہل کے قتل ہوجانے کے بعد مکہ کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ اس کے لئے آپ نے غائبانہ نکاح کا انتظام کیا۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ اگر ام حبیبہ حبش سے مکہ واپس آگئیں تو ان کا باپ آپ سے نکاح نہ ہونے دے گا۔ ام حبیبہ سے آپ کا نکاح غائبانہ طور پر نجاشی (بادشاہ حبش) نے پڑھایا۔ اس کے بعد وہ بدھی مدینہ بھیج دی گئیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد ابوسفیان کی مخالفت کمزور پڑ گئی۔ یہاں تک کہ فتح مکہ سے ایک دن پہلے انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس حکمت کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو قرآن کے الفاظ میں "ارہاب" کی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی طاقت کے استعمال کے بجائے طاقت کے مظاہرہ کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ احد (۳ھ) کی شکست مسلمانوں کے لئے مکمل شکست بن سکتی تھی اگر ابوسفیان اپنی فوج کو لے کر واپس نہ ہوجاتا اور اگلے روز دوبارہ حملہ کرتا۔ چنانچہ روحا کے مقام پر پہنچ کر ابوسفیان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور وہ اپنی فوج کو دوبارہ مدینہ کی طرف واپس لوٹانے کا ارادہ کرنے لگا۔ مگر اس سخت ترین انتشار کی حالت میں بھی پیغمبر اسلام کا جنگی اطلاعات کا نظام اتنا مکمل تھا کہ آپ کو فوراً ابوسفیان کے ارادہ کی خبر ہوگئی۔ آپ نے اقدام کا فیصلہ کیا۔ آپ نے اپنی زخمی فوج کو منظم کر کے فوراً مکہ کی طرف کوچ کر دیا اور حمراء الاسد تک پہنچ گئے جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ آپ کا یہ سفر پورے اعلان و اظہار کے ساتھ تھا جب کہ عام طور پر آپ نہایت خاموشی کے ساتھ کوچ کیا کرتے تھے۔ ابوسفیان کو خبر ہوئی تو اس نے سمجھا کہ آپ کو مزید کمک آگئی ہے۔ وہ واپسی کا ارادہ ترک کر کے مکہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب آپ کو اطمینان ہوگیا کہ ابوسفیان کی فوج واپس ہوچکی ہے تو آپ مدینہ لوٹ آئے۔

غزوۂ مُوتہ (جمادی الاول ۸ھ) کے اگلے سال قیصر روم نے سرحد شام پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار بھی فوج اکھٹا کرنے لگے۔ اس کے جواب میں آپ ۳۰ ہزار کا لشکر لے کر نکلے جس کو غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ) کہا جاتا ہے۔ تبوک کا غزوہ حقیقۃً ایک جنگی تدبیر تھی جس کا مقصد دشمن کے اقدام سے پہلے اقدام تھا، تاکہ دشمن مرعوب ہوکر اقدام کا حوصلہ کھو دے۔ چنانچہ تبوک کے مقام پر پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ قیصر نے مقابلہ کے لئے بڑھنے کے بجائے سرحد سے اپنی فوجیں ہٹانی شروع کر دی ہیں تو آپ نے بھی حربی ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ قیصر کے ہٹ جانے سے آپ کو جو اخلاقی فتح حاصل ہوئی تھی اس سے آپ نے سیاسی فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ آپ نے تبوک میں بیس دن ٹھہر کر سرحد کے ان قبائل سے ربط قائم کیا، جو اس وقت تک رومیوں کے زیر اثر تھے۔ اس سلسلے میں دومۃ الجندل کے عیسائی رئیس اُکیدر بن عبدالملک کندی، ایلہ کے عیسائی یوحنا بن رویہ، اور اسی طرح مقنا، جرباء اور اذرُح کے نصرانی رؤسا نے بھی جزیہ ادا کر کے مدینہ کی ماتحتی قبول کی۔

ابوبکر صدیق کی خلافت کے بعد جیش اسامہ کی روانگی بھی اسی قسم کا ایک واقعہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قبیلہ طے کے سوا مدینہ کے اطراف کے تمام عرب قبائل باغی ہوگئے۔ اپنی تعداد کی کمی اور دشمن کی کثرت کی وجہ سے مسلمانوں کا حال ایسا ہو رہا تھا جیسے "جاڑے کی بارش میں بھیگی ہوئی بکری"۔ اس وقت بظاہر

حالات کا تقاضا تھا کہ اندرونی دشمنوں کو زیر کرنے کے لئے اپنی طاقت کو محفوظ رکھا جائے۔ مگر پیغمبر کے فیصلہ پر قائم رہتے ہوئے خلیفہ اول نے طے کیا کہ اسامہ کے لشکر کو جو سات سو افراد پر مشتمل تھا رومیوں کے مقابلہ کے لئے شام روانہ کردیں۔ اس اقدام کا جو اثر پڑا وہ حضرت ابوہریرہ کے الفاظ میں یہ ہے :

فجعل لا یمر بقبیل یریدون الارتداد الا قالوا: لولا ان لھولاء قوۃ ماخرج مثل ھولاء من عندھم ولکن ندعھم حتی یلقوا الروم، فلقوا الروم فھزموھم وقتلوھم ورجعوا سالمین فثبتوا علی الاسلام

البدایہ والنہایہ جلد ۶ ۔ صفحہ ۳۰۵

اسامہ رض کا لشکر جب ان قبیلوں پر سے گزرتا جو مرتد ہونا چاہ رہے تھے۔ وہ کہتے اگر مسلمانوں کے پاس قوت نہ ہوتی تو اس قسم کی فوج ان کے پاس سے روانہ نہ ہوتی۔ ہم ابھی انھیں چھوڑ دیں اور روم سے لڑنے دیں، چنانچہ وہ رومیوں سے لڑے اور انھیں شکست دی اور انھیں قتل کیا اور سلامتی کے ساتھ واپس آئے۔ یہ دیکھ کر ارتداد کا ارادہ کرنے والے بھی اسلام پر جم گئے۔

آپ مدینہ پہنچے تو وہاں مشرکین کی ایک مختصر اقلیت کو چھوڑ کر دو بڑے گروہ آباد تھے۔ یہود اور مسلمان ۔ پھر یہ بھی مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے جن کے درمیان کوئی اتفاق نہ تھا۔ لوگ نفسیاتی طور پر ایک ایسے شخص کے منتظر تھے جو ان کے درمیان اتحاد اور نظم پیدا کردے۔ آپ نے اس صورت حال کا اندازہ کرکے اپنی طرف سے ایک صحیفہ (نہ کہ معاہدہ) جاری کردیا جس میں یہود اور مسلمانوں کو مستقل حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا (انھم امۃ واحدۃ من دون الناس، ان یھود امۃ مع المومنین۔ للیھود دینھم وللمسلمین دینھم) اس صحیفہ میں دونوں کے مروجہ حقوق اور ذمہ داریوں کو چھیڑے بغیر انھیں ایک قابل قبول شکل میں تسلیم کرلیا گیا۔ اور اس کے بعد ایک دفعہ ان لفظوں میں شامل کردی گئی :

وانکم مھما اختلفتم فیہ من شیٔ، فان مردّہ الی اللہ عزوجل والی محمد

اور جب بھی تم میں کسی معاملہ میں کوئی اختلاف ہو تو وہ معاملہ خدا اور رسول کی طرف لوٹے گا۔

تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ۱۲۹

اس طرح یہ صحیفہ گویا ایک قسم کا سیاسی اقدام تھا جس کے ذریعہ آپ نے انتہائی حکیمانہ طور پر مدینہ کے اوپر اسلام کی دستوری حکومت کا اعلان کردیا۔

آپ کے مدینہ پہنچنے کے بعد قریش کا غصہ کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ سارے مسلمانوں نے سمٹ کر ایک مقام پر اپنا مضبوط مرکز بنالیا ہے۔ ہجرت کے دوسرے ہی سال آپ کے سامنے یہ نازک صورت حال آئی کہ یا تو آگے بڑھ کر قریش کے لشکر کا مقابلہ کریں یا اس کو موقع دیں کہ وہ مدینہ میں گھس آئے اور اسلام کے بنتے ہوئے آشیانہ کو منتشر کردے۔ اگرچہ قریش کے لشکر کی تعداد ساڑھے نو سو اور مسلمانوں میں قابل جنگ افراد کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی۔ مگر آپ نے اپنے پیغمبرانہ تدبر سے یہ سمجھا کہ اہل شرک اپنی کثرت کے باوجود

صرف نفرت اور حسد کا منفی سرمایہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس ایمان ویقین کا مثبت خزانہ ہے جو اول الذکر سے بدرجہا زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کے علاوہ عرب اپنے جاہلی نخوت کے تحت اکیلے اکیلے لڑتے تھے تاکہ ہر شخص اپنا منفرد کمال دکھائے اور بہادر مشہور ہو۔ مسلمان اللہ پر ایمان لاکر اپنے اندر یہ کمزوری ختم کر چکے تھے۔ آپ نے انھیں عرب تاریخ میں پہلی بار مورچہ بندی کی تلقین کی۔ آپ نے انھیں سکھایا کہ ذاتی کمال دکھانے کا شوق نہ کرو، بلکہ دستہ بنا کر لڑو۔ قریش کی انفرادی طاقت کو اپنی اجتماعی طاقت سے شکست دو (صف ۴) ایمان اور مورچہ بندی کی طاقت سے وہ عظیم الشان واقعہ وجود میں آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں بدر کی فتح کہتے ہیں۔

فتح اسلام

بدر کی شکست نے دوبارہ قریش کو بھڑکایا اور مختصر سی مدت میں ان سے کئی معرکے پیش آئے، جن میں احد (۳ھ) اور احزاب (۵ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان غزوات میں مسلمانوں کو شدید ترین مصائب پیش آئے۔ غزوۂ خندق میں ۸۰۰ آدمی تھے۔ مگر سردی اور بھوک اور تکان کا عالم یہ تھا کہ جب آپ نے دشمن کی جاسوسی کے لئے ایک شخص کو بھیجنا چاہا تو تین بار آواز دینے کے بعد بھی کوئی نہ اٹھا، یہاں تک کہ آپ حضرت حذیفہ کے پاس آئے اور نام لے کر ان کو بلایا اور ان کو اس کام پر متعین کیا۔

دوسری طرف مدینہ کے یہود ایک مستقل اندرونی مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ قریش سے مل کر دونوں کے درمیان اسلام کے خلاف سازشیں جاری رہتی تھیں۔ خندق کے ۲۰ روزہ محاصرہ کے بعد جب ایک شدید آندھی سے مجبور ہو کر قریش کی فوج مکہ واپس ہوئی تو آپ نے اس موقع کو مدینہ کے اندرونی یہودیوں سے نمٹنے کے لئے موزوں ترین سمجھا جس میں ان یہودیوں کی سازش اور بغاوت برہنہ ہو کر سامنے آچکی تھی۔ آپ نے مدینہ کے قبائل (بنونضیر، بنو قینقاع۔ بنو قریظہ) کو خندق سے لوٹتے ہی فوراً گھیر لیا اور ان پر خود ان کی کتاب تورات کے قانون کو جاری کر کے ان کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

اب مسئلہ خیبر کا تھا۔ ہجرت کے چھٹے سال یہ صورت حال تھی کہ درمیان میں مدینہ کا دار الاسلام تھا اور جنوب میں چار سو کلومیٹر کے فاصلہ پر مکہ کے قریش تھے اور شمال میں دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر خیبر کے یہودی۔ قریش اور یہودی، اسلام دشمنی میں متفق الرائے ہونے کے باوجود، اکیلے اکیلے اتنے طاقت ور نہ تھے کہ تنہا اسلام کو ختم کرنے کا حوصلہ کر سکیں۔ اسی لئے ان کے درمیان مشترکہ جنگی اقدام کی سازشیں چل رہی تھیں۔ دوسری طرف مسلمان بھی اس پوزیشن میں نہ تھے کہ بیک وقت اپنے دونوں دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں۔

ان حالات میں آپ نے ربانی تدبیر کے تحت ذی قعدہ ۶ھ میں اپنے ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف کوچ کر دیا، اور اعلان فرمایا کہ ہم کسی کے خلاف جنگ کے لئے نہیں جارہے ہیں، بلکہ عمرہ کرنے کے لئے جارہے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کا قافلہ بھی آپ نے اپنے ساتھ لے لیا۔ حتی کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق

اونٹوں کو قربانی کا نشان (قلادہ) بھی پہنانے کا حکم دیا تاکہ مکہ والوں کو بخوبی معلوم ہوجائے کہ آپ زیارت کعبہ اور قربانی ہی کے لئے آئے ہیں۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قریش پر اس بات کا مظاہرہ ہو کہ آپ کا مقصد کعبہ کی مذہبی یا تجارتی حیثیت کو ختم کرنا نہیں ہے۔

مکہ سے تقریباً گیارہ کیلو میٹر کے قریب حدیبیہ کے مقام تک پہنچے تھے کہ حسب توقع قریش نے آگے بڑھ کر روکا۔ آپ نے جھگڑے سے بچتے ہوئے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور قریش کو پیغام بھیجا کہ ہمارے اور تمھارے درمیان صلح کا معاہدہ ہوجائے:

انا لم نجیٔ لقتال احد ولکن جئنا معتمرین وان قریشا قد نهکتهم الحرب واضرت بهم فان شاؤا ماددتهم مدة ویخلوا بینی وبین الناس، فان اظهر فان شاؤا ان یدخلوا فیما دخل فیه الناس فعلوا والا فقد جموا، و ان هم ابوا فوالذی نفسی بیده لاقاتلنهم علیٰ امری هذا حتی تنفرد سالفتی ولینفذن امر الله (صحیح بخاری)

ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں، بلکہ صرف عمرہ کے لئے آئے ہیں۔ جنگ نے قریش کا برا حال کر دیا ہے اور ان کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو میں ان کے لئے ایک مدت (جنگ نہ کرنے کی) مقرر کر دوں اور وہ میرے اور لوگوں کے درمیان سے ہٹ جائیں۔ اگر میں غالب رہوں تو وہ چاہیں تو اس دین میں داخل ہوجائیں گے جس میں لوگ داخل ہوئے اور مجھے غلبہ نہ ہوا تو ان کا مدعا حاصل ہے اور اگر قریش نے اس سے انکار کیا تو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں اس معاملہ میں ان سے لڑوں گا خواہ میری گردن الگ ہوجائے اور اللہ کا امر پورا ہو کر رہے گا۔

یہ پیغام درحقیقت خود قریش کے اندر موجود ایک فکر سے فائدہ اٹھانا تھا۔ مکہ کے ابتدائی دور میں جب عتبہ بن ربیعہ قریش کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے آپ سے ملا اور آپ سے گفتگو کے بعد قریش کی طرف لوٹا تو ایک روایت کے مطابق اس نے جو باتیں قریش سے کہیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی:

واترکوا الرجل واعتزلوه، فوالله ماهو بتارك ماهو علیه وخلوا بینه وبین سائر العرب فان یظهر علیهم یکن شرفه شرفکم وعزه عزکم وان یظهروا علیه قد کفیتموه بغیرکم البدایہ والنہایہ

اس آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ خدا کی قسم وہ اپنی بات سے باز آنے والا نہیں۔ تم ان کے اور تمام عرب کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ اگر وہ عرب پر غالب آگئے تو ان کی عزت تمھاری عزت ہوگی اور اگر وہ مغلوب ہوگئے تو تم دوسروں کے ہاتھوں ان سے نجات پالوگے۔

یہ فکر جو خود قریش کے اندر دبا ہوا موجود تھا۔ اسی کو آپ نے استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود دشمن کے اندر

آپ کو اپنے نقطۂ نظر کے حامی مل گئے۔

ایک طرف آپ نے یہ پیغام کہلایا۔ دوسری طرف قریش کو مختلف طریقوں سے متاثر کرنے کا عمل بھی شروع ہوگیا۔ بنی کنانہ کا ایک شخص مکہ سے روانہ ہوکر حدیبیہ پہنچا تاکہ یہ معلوم کرے کہ مسلمان کس لئے آئے ہیں۔ لوگوں نے آپ کو اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ اس شخص کے قبیلہ میں قربانی کے اونٹوں کی تعظیم کی جاتی ہے تم لوگ اپنے قربانی کے اونٹوں کو لے کر اس کا استقبال کرو۔ مسلمانوں نے اونٹوں کا قافلہ بنایا اور لبیک اللّٰھم لبیک پڑھتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرے۔ یہ شخص مکہ واپس ہوا تو بہت متاثر تھا۔ اس نے قریش سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ مسلمان صرف زیارت کعبہ کی غرض سے آرہے ہیں انھیں روکا نہ جائے۔

اسی طرح ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کے ایمان و اسلام کا مظاہرہ بھی انھیں شدید طور پر متاثر کرنا تھا۔ قریش کا ایک سفیر جب حدیبیہ پہنچا تو مسلمان صف بندی کرکے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز کے ضبط و نظم کا منظر دیکھ کر وہ اتنا مرعوب ہوا کہ واپس ہوکر قریش سے کہا کہ مسلمانوں کا اتحاد اتنا زبردست ہے کہ ساری کی ساری قوم محمد کے ایک اشارے پر حرکت کرتی ہے —— ایک سفیر نے دیکھا کہ پیغمبر اسلام جب وضو کرتے ہیں تو مسلمان دوڑتے ہیں کہ ان کے غسالہ کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ جب وہ بولتے ہیں تو سب کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ وہ ادب و تعظیم کی وجہ سے ان کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ سفیر نے واپس ہوکر قریش سے مسلمانوں کی اس وفاداری اور محبت کا ذکر کیا تو وہ سخت مرعوب ہوئے۔

بدیل بن ورقاء الخزاعی کے ذریعہ جب مذکورہ پیغام قریش کو پہنچا تو ان کے ایک شخص (عروہ بن مسعود) نے تقریر کی:

فقام عروۃ بن مسعود فقال: ای قوم: الستم بالوالد قالوا بلیٰ۔ قال الستم بالولد۔ قالوا بلیٰ۔ قال فهل تتهمونی قالوا لا، قال فان هذا قد عرض علیکم خطة رشد اقبلوها و دعونی آتیه (البدایہ والنہایہ)

اے میری قوم! کیا تم میں سے کچھ لوگ میرے والد کے برابر نہیں۔ لوگوں نے کہا کیوں نہیں، عروہ نے کہا، کیا تم میں سے کچھ میری اولاد کے برابر نہیں۔ لوگوں نے کہا کیوں نہیں۔ عروہ نے کہا کیا تمھیں میرے اوپر کوئی شک ہے۔ لوگوں نے کہا نہیں۔ عروہ نے کہا اس آدمی نے تمھارے سامنے ایک بہترین تجویز پیش کی ہے، تم اس کو مان لو اور مجھے جانے دو کہ میں ان سے بات کرلوں۔

آپ نے اعلان کردیا کہ قریش جس چیز کا بھی مطالبہ کریں گے، میں اس کو مان لوں گا (والذی نفسی بیده لا یسئلونی خطة یعظمون فیها حرمات الله الا اعطیتهم ایاها) تاہم ناجنگ معاہدہ لکھا جانے لگا تو انھوں نے طرح طرح سے حمیت جاہلیت کا مظاہرہ کیا، معاہدہ کے مسودہ سے "محمد رسول اللہ" کو مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے بسمک اللّٰھم لکھنے پر اصرار کیا۔ یہ دفعہ بڑھائی کہ قریش کا کوئی آدمی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تو وہ اس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ اس کے برعکس کوئی مسلمان قریش

کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کو واپس نہیں کریں گے۔ اس کی اجازت نہ دی کہ مسلمان اس سال مکہ جاکر عمرہ کریں۔ سارے صحابہ کے لئے یہ شرطیں انتہائی گراں ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر جب عروہ بن مسعود نے کہا اے محمد! یہ جو ادھر ادھر کے لوگ آپ نے اپنے گرد جمع کر رکھے ہیں، یہ سب آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے (انی لاری اشوابا من الناس خلیقا ان یفر وا ویدعوک) اس کو سن کر ابوبکرؓ جیسا سنجیدہ آدمی بھی غصہ میں آگیا۔ ان کی زبان سے نکلا:

امصص بظر اللات، انحن نفر عنه وندعه — تو لات کی شرم گاہ چوس، کیا ہم آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ (البدایہ والنہایہ)

مگر خدا کا رسول ہر قسم کی اشتعال انگیز باتوں کو برداشت کرتا رہا اور قریش کے ہر مطالبہ کو مان کر ان سے دس سال کے لئے ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ اب قریش پابند ہو گئے کہ وہ دس برس تک بالواسطہ یا براہ راست کسی ایسی جنگ میں حصہ نہ لیں جو مسلمانوں کے خلاف ہو۔

یہ معاہدہ جو مسلمانوں پر اتنا سخت تھا کہ اس کی تکمیل کے بعد جب آپ نے لوگوں سے قربانی کرنے کو کہا تو تین بار اعلان کرنے کے باوجود کوئی ایک شخص قربانی کے لئے نہ اٹھا۔ اس کے بعد اٹھے بھی تو غم کا یہ حال تھا کہ قربانی کے بعد سر مونڈنے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو کاٹ ڈالیں گے (وجعل بعضهم یحلق بعضا حتی کاد بعضهم یقتل بعضا غما) مگر دب کر کئے جانے والے اس معاہدہ کے اتنے عظیم الشان فائدے ہوئے جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

صلح حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کے دو طاقت ور حریف تھے، ایک خیبر کے یہودی۔ دوسرے مکہ کے قریش۔ مسلمان ابھی اتنے طاقت ور نہ ہوئے تھے کہ بیک وقت دونوں سے نمٹ سکیں۔ ایک پر حملہ کرنا گویا دوسرے کو موقع دینا تھا کہ وہ پیچھے سے آکر مدینہ میں گھس جائے اور مسلمانوں کے مرکز کو برباد کر دے۔ آپ نے یہ کیا کہ قریش مکہ کے سارے مطالبات منظور کر کے ان کو دس سال تک کے "ناجنگ معاہدہ" پر راضی کر لیا۔ اور اس طرح انھیں "بطن مکہ" میں روک دیا۔ (فتح - ۲۴) اس کے بعد مدینہ واپس آکر پہلی فرصت میں خیبر پر حملہ کر کے یہودی مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ پہلا واقعہ ذی قعدہ ۶ھ میں ہوا اور دوسرا محرم ۷ھ میں۔

خیبر میں یہودیوں کے آٹھ پتھر کے قلعے تھے جن میں ۲۰ ہزار جنگ جو ایسے ہتھیاروں کے ساتھ جمے ہوئے تھے جن سے اسلامی فوج بالکل خالی تھی۔ ان قلعوں کے استحکام کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا جس کو ۱۶۷۰ء میں فرانس کے فوجی انجینئر مارشل دابان (۱۷۰۷ - ۱۶۳۳) نے اختیار کر کے شہرت پائی۔ اس مضبوط اور مسلح شہر کو کس طرح فتح کیا گیا۔ یہ بذات خود ایک طویل داستان ہے۔ اس موقع پر جو حیرت انگیز جنگی حکمت عملی اختیار کی گئی، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ قلعوں کا پھاٹک توڑنے کے لئے یہ کیا گیا کہ بھاری درخت کا تنہ لے کر پچاس آدمی دوڑتے تھے اور اس کو تیزی سے قلعہ کے پھاٹک پر مارتے تھے، چند بار ایسا کرنے سے قلعہ کا دروازہ

ٹوٹ جاتا تھا اور اس کے بعد تیروں اور منجنیقوں کے طوفان میں مسلمان قلعہ کے اندر گھس جاتے۔ اس طرح چار قلعے مسخر ہوئے تھے کہ بقیہ نے مرعوب ہو کر خود سے اپنے دروازے کھول دیئے اور اپنے کو اسلامی فوج کے سپرد کر دیا۔

خیبر کی تسخیر کے بعد اب قریش مکہ کا مسئلہ تھا۔ آپ کی فراست ربانی نے بتایا کہ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ دشمن کو موقع دیا جائے کہ وہ کوئی غلطی کرے تاکہ آپ کے لئے مداخلت جائز ہو جائے۔ آپ جانتے تھے کہ قریش کو جس چیز نے اسلام کے خلاف برانگیختہ کر رکھا ہے، وہ بغض، حسد، اقتدار پرستی اور گھمنڈ کے سوا کچھ نہیں ہے اور جو لوگ اس قسم کی نفسیات کے تحت کسی چیز کی مخالفت کریں وہ اپنے آپ کو غیر منطقی اور غیر اخلاقی کارروائیوں سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اندازہ نہایت صحیح نکلا — قبیلہ خزاعہ اور قبیلہ بنی بکر کی جنگ (شعبان ۸ھ) میں قریش نے درپردہ اپنے حلیف قبیلہ (بنو بکر) کی حمایت میں آپ کے حلیف قبیلہ (بنو خزاعہ) کے خلاف چڑھائی کر کے یہی غلطی کی۔ یہ معاہدۂ صلح کی صریح خلاف ورزی تھی۔ یہ صلح حدیبیہ کے دو برس بعد کا واقعہ ہے۔ اس صلح کے نتیجہ میں اس مدت میں اسلام اتنا بڑھ چکا تھا کہ صلح حدیبیہ کے وقت اگر آپ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار مرد تھے تو اب ان کی تعداد دس ہزار ہو چکی تھی۔ آپ نے خاموشی کے ساتھ مکہ کی طرف مارچ کر دیا۔ یہ سب کچھ اتنی حکمت اور تدبر کے ساتھ ہوا کہ تقریباً خون بہائے بغیر مکہ فتح ہو گیا:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ فتح — ۲۰	وعدہ کیا ہے تم کو اللہ نے بہت غنیمتوں کا تم ان کو لوگے۔ پس شتاب دے دی تم کو یہ، اور روک دیئے لوگوں کے ہاتھ تم سے۔

معاہدہ کے وقت صورت حال یہ تھی کہ تقریباً ۲۰ برس کی مسلسل تبلیغی جد و جہد کے ذریعہ اسلام کی آواز سارے عرب میں پھیل چکی تھی۔ ہر قبیلہ میں بے شمار ایسے لوگ وجود میں آچکے تھے جن کے دلوں میں اسلام کی صداقت نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ مگر اس وقت کے عرب میں قریش کو قیادت کا مقام حاصل تھا۔ لوگ قریش کے ڈر سے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا اعلان کرنا قریش سے جنگ چھیڑنے کے ہم معنی ہے۔ معاہدہ حدیبیہ کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ ہو گیا ہے تو یہ خطرہ دور ہو گیا اور لوگ اس طرح اسلام قبول کرنے لگے جیسے ٹریفک پوسٹ پر بند سڑک کھلنے کے بعد اچانک سواریاں ٹوٹ پڑتی ہیں

قال الفقیہ ابن شہاب الزہری وغیرہ ان اللہ فتح علی المسلمین بصلح الحدیبیۃ اکثر مما فتح اللہ علیہم بہ من ای غزو آخر بدلیل ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجع الی مکۃ عام الفتح بعشرۃ آلاف ولم تکن عدتہ من قبل لتزید علی ثلاثۃ	ابن شہاب زہری اور دوسروں نے کہا ہے کہ اللہ نے صلح حدیبیہ کے ذریعہ مسلمانوں کو جو فتوحات دیں وہ کسی بھی دوسرے غزوہ سے زیادہ تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح کے سال مکہ میں دس ہزار افراد کے ساتھ داخل ہوئے جب کہ اس سے پہلے ان کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں

آلاف بحال، وعلله بانه لما هادن قريشا لم يجد العرب حرجا ان يدخلوا الاسلام فان ذلك لا يغيظ قريشا ولا يعتبر تحديا لها
محمد صلی اللہ علیہ وسلم و بنو اسرائیل: ۱۰۲-۱۰۱

تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قریش نے جنگ بندی بند کر دی تو عربوں کو اسلام میں داخل ہونے کے لئے کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ کیونکہ اب قریش کے غصہ اور مقابلہ کا خطرہ نہیں تھا۔

بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، انھوں نے بعد کے لوگوں سے کہا، تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو۔ مگر ہم لوگ صلح حدیبیہ کو فتح کہا کرتے تھے۔ (ماکنا نعد الفتح الا یوم الحدیبیة)

اس معاہدہ کے ذریعے مدینہ کا اقتصادی محاصرہ ختم ہوگیا اور مدینہ کے تجارتی قافلے آزادی کے ساتھ مکہ سے گزرنے لگے۔ ابو بصیر، ابو جندل وغیرہ جن کو از روئے معاہدہ قریش کی طرف واپس آنا ضروری تھا، وہ بھاگ کر ذوالمروہ پہنچے۔ وہاں اس قسم کے اور مسلمان جمع ہونے لگے حتیٰ کہ وہ ایک نیا مرکز بن گیا اور اس نے قریش کے تجارتی قافلوں کو اتنا پریشان کیا کہ انھوں نے از خود معاہدہ کی یہ دفعہ ختم کر دی۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری عجلت اور ظاہر پرستی ہے۔ اگر آدمی ظواہر سے بلند ہو جائے تو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ایسے امکانات رکھے ہیں جو آدمی کو کامیابی تک پہنچانے کی یقینی ضمانت ہیں:

اخرج ابن عساکر عن الواقدی قال: کان ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ یقول: ما کان فتح اعظم فی الاسلام من فتح الحدیبیة ولکن الناس یومئذ قصر رأیهم عما کان بین محمد وربه والعباد یعجلون واللہ لا یعجل کعجلة العباد حتی یبلغ الامور ما اراد

حضرت ابوبکر فرماتے تھے اسلام میں فتح حدیبیہ سے زیادہ بڑی فتح کوئی نہیں ہوئی، مگر اس دن لوگوں کی نظریں وہاں تک نہ پہنچ سکیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رب کے درمیان تھا۔ بندے جلدی چاہتے ہیں۔ مگر اللہ بندوں کی طرح جلدی نہیں کرتا یہاں تک کہ معاملات وہاں پہنچ جائیں جہاں وہ انکو پہنچانا چاہتا ہے۔

حقیقت پسندی دنیا میں سب سے زیادہ کمیاب ہے، اگرچہ حقیقت پسندی ہی وہ چیز ہے جو کسی کامیابی تک پہنچنے کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔

خیبر سے فارغ ہونے کے بعد ہی آپ نے ایک اور مہم کی تیاری شروع کر دی تھی۔ مگر کسی ایک شخص سے بھی آپ نے نہیں بتایا کہ یہ تیاری کس کے خلاف ہے حتیٰ کہ حضرت ابوبکر تک کو معلوم نہ تھا کہ آپ کدھر کا قصد کرنے والے ہیں۔ رمضان ۸ھ کے آغاز میں جب اسلامی لشکر نے آپ کے حکم کے مطابق مکہ کا رخ کیا، اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ کی منزل کیا ہے۔ تاہم پورا سفر اتنی خاموشی سے طے ہوا کہ آپ مرالظہران تک پہنچ گئے اور مکہ والوں کو خبر نہ ہوئی (ولم تعلم به قریش) آپ نے روانگی سے پہلے دعا فرمائی:

اللّٰهم خذ العیون والاخبار عن قریش حتی نبغتها فی بلادها

خدایا قریش سے جاسوسوں اور خبروں کو روک لے یہاں تک کہ میں ان کے شہر میں داخل ہو جاؤں

اس مہم کی تیاری کے لئے آپ نے حیرت انگیز انتظامات کئے۔ آپ نے حکم دیا کہ شہر مدینہ کا تعلق باہر سے منقطع کر دیا جائے۔ نہ کوئی شخص باہر سے شہر کے اندر داخل ہو اور نہ کوئی شخص شہر سے باہر جانے پائے حضرت علی کی قیادت میں کچھ لوگ راستوں کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیئے گئے۔ انھیں لوگوں نے حاطب بن ابی بلتعہ کے قاصد کو پکڑ کر اس سے مشہور خط برآمد کیا تھا۔ سارا لشکر سامان اور ہتھیار سے لیس تھا۔ (دنی کل القبائل عدد وسلاح، طبرانی عن ابن عباس)

مسلمانوں کی ساری تعداد کو ساتھ لیا گیا (لم يتخلف منهم احد) روانگی کا انتظام آپ نے اس طرح کیا کہ دس ہزار فوج کو مختلف دستوں میں بانٹ دیا۔ ہر دستہ کا ایک سردار تھا جو جھنڈا لے کر آگے چلتا اور اس کے پیچھے چند سو کا دستہ قطار در قطار مارچ کرتا۔ اپنے چچا حضرت عباس سے آپ نے کہا کہ ابوسفیان کو فوجوں کے مارچ کا منظر دکھایئے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للعباس: اجلسه بمضيق الوادي عند خطم الجبل حتى تمر به جنود الله فيراها	آپ نے حضرت عباس سے فرمایا، ابوسفیان کو پہاڑ کے پاس گزرگاہ پر روکے رہئے تاکہ اللہ کا لشکر ان کے سامنے سے گزرے اور وہ اس کو دیکھیں۔

(تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۶۱)

اسلامی لشکر قطار در قطار گزر رہا تھا اور ابوسفیان حیرانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ ابوسفیان کی زبان سے نکلا من له بهؤلاء طاقة لم ار كاليوم جنودا قط ولا جماعة۔ ایک طرف آپ نے مکہ کے لیڈر (ابوسفیان) کو اس طرح متاثر کیا، دوسری طرف یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو امان ہے (من دخل دار ابي سفيان فهو آمن) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوسفیان نے خود ہی مکہ میں اعلان کر دیا کہ اے لوگو محمد کی اطاعت قبول کر لو۔ آج ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت کسی میں نہیں۔ فتح مکہ کے بعد کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اس مہم کے لئے اتنی زبردست تیاری مکہ میں خوں ریزی کے لئے نہ تھی بلکہ اہل مکہ کو مرعوب کرنے کے لئے تھی تاکہ خون بہائے بغیر مکہ پر اسلام کا قبضہ ہو جائے۔ لشکر اسلام کے سردار سعد بن عبادہ نے مکہ کے قریب پہنچ کر نعرہ لگایا اليوم يوم الملحمة (آج گھمسان کا دن ہے) آپ نے فرمایا نہیں، آج رحمت کا دن ہے اور ان کو سرداری سے معزول کر کے جھنڈا ان کے لڑکے قیس کو دے دیا۔

فتح مکہ کے بعد بھی اگرچہ کچھ لڑائیاں ہوئیں اور مجموعی طور پر آپ کے غزوات (چھوٹے بڑے) کی تعداد ۸۰ تک پہنچتی ہے۔ تاہم مکہ کا فتح ہونا ملک کے دارالسلطنت کا قبضہ میں آنا تھا۔ چنانچہ معمولی جھڑپوں کے بعد سارے عرب نے آپ کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

مشہور حدیث کے مطابق امت مسلمہ میں ہر دور میں ایسے لوگ اٹھیں گے جو "اس کے لئے اس کے دین کی تجدید کریں گے"۔ یہ پیشین گوئی امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں صحیح ثابت ہوئی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے دین کا تسلسل اس امت میں باقی رکھا ہے۔

مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ "تجدیدی کوششوں کے نتائج جو ماضی میں نکلتے رہے ہیں، موجودہ دور میں کیوں برآمد نہ ہوسکے"، ماضی میں جو مجددین اٹھے ان کو اپنی کوششوں میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ ایک ہزار برس سے بھی زیادہ مدت تک اسلام روئے زمین پر چھایا رہا۔ پوری مسلم دنیا میں، جو چین کی سرحدوں سے لے کر افریقہ کے مغربی ساحل تک پھیلی ہوئی تھی، اسلامی فکر کا غلبہ تھا، سوچنے کا ڈھنگ، زندگی کے طریقے، لین دین کے اصول، حق و ناحق کے معیار، غرض ہر معاملہ میں اسلام کا سکہ چلتا تھا۔ زندگی کی تمام سرگرمیوں پر اسلام کی چھاپ پڑی ہوئی تھی۔ محدث اور فقیہہ کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ بادشاہ وقت کے فرمان سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار مصلحین اٹھے اور انھوں نے اتنے بڑے پیمانہ پر تجدیدی کوششیں کیں کہ باعتبار مقدار ان کا کام پچھلے تمام مجددین کے مجموعی کام سے بھی زیادہ ہوگیا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کی مغلوبیت ختم نہ ہوئی۔ زندگی کے نقشوں پر جاہلی تہذیب کا غلبہ دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ دو سو برس پہلے، جب کہ دور جدید کے تجدیدی کام کا آغاز ہوا تھا، اس وقت اسلام جہاں تھا آج وہ اس سے بہت پیچھے چلا گیا ہے۔

اٹھارویں صدی میں عالم اسلام پر مغربی قوموں کا استیلا ساری تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے جن مخالف حملوں کا تجربہ ہوا، انھوں نے اسلامی دنیا کے لئے صرف دفاعی مسائل پیدا کئے تھے جو دفاعی تدبیروں کے ذریعے کامیابی کے ساتھ حل کر لئے گئے۔ جب موجودہ حادثہ پیش آیا تو اس وقت بھی ماضی پر قیاس کرتے ہوئے ساری طاقت دفاعی تدابیر پر صرف کر دی گئی۔ حالاں کہ یہ حملہ پچھلے تمام حملوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے مقابلہ کے لئے دفاعی اقدام سے پہلے مثبت تیاریوں کی ضرورت تھی۔ مگر بر وقت اس فرق کو سمجھا نہ جاسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دفاعی تدبیروں میں جو قوت صرف کی گئی وہ سب کی سب ضائع ہوگئی۔ مزید یہ کہ دفاعی جنگ کے ہنگاموں میں اسلام کی دعوتی مہم بھی فراموش ہو کر رہ گئی، جس کو اسلام کے اصل مثبت کام کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے اہل اسلام کا اولین فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

نبوت کے چھٹے سال جب عمر فاروق رضہ اسلام لائے تو انھوں نے مسجد حرام میں جاکر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ قریش کے لوگ ان سے لپٹ گئے۔ دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ بالآخر حضرت عمر نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

افعلوا ما بدالکم، فاحلف باللہ ان لو قد کنا ثلاث مائۃ رجل لقد ترکنا ھا لکم او ترکتموھا لنا (البدایہ والنہایہ جلد ۳ - صفحہ ۸۲)

جو تمھارے جی میں آئے کرو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم تین سو آدمی ہو جائیں تو پھر یا ہم اس سرزمین کو تمھارے لئے چھوڑ دیں گے یا تم اس کو ہمارے لئے چھوڑ دو گے۔

نبوت کے چودھویں سال بدر کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ ارشاد کس قدر صحیح تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں عمرو بن العاص رضؓ کو لکھا جو اس وقت مصر کے محاذ پر تھے اور فتح میں تاخیر ہو رہی تھی:

واعلم ان معلث اثنی عشر الف رجل ولا یغلب اثنا عشر الفامن قلۃ (کنز العمال، جلد ۳، صفحہ ۱۵۱)

تم کو جاننا چاہئے کہ تمھارے ساتھ بارہ ہزار آدمی ہیں اور بارہ ہزار کبھی قلت کی وجہ سے شکست نہیں کھاتے۔

فاروق اعظم رضؓ کے ان اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ تین سو آدمی انقلاب لانے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ اور اگر یہ تعداد بارہ ہزار تک پہنچ جائے تو پھر فریق ثانی کی کسی بھی تعداد کے مقابلہ میں محض عددی کمی کی بنا پر انھیں شکست نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ایک ایک اسلامی جماعت، بعض اوقات ایک ایک مسلم قائد کو لاکھوں کی تعداد میں ساتھی اور کارکن ملے مگر وہ اسلام کی تاریخ میں ناکامی کی مثالوں کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کر سکے۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان جماعتوں یا اشخاص کی تحریکوں میں یقیناً کوئی بنیادی خامی تھی جس نے ان کے اخلاص اور قربانی کے باوجود نتیجہ کو ان کے خلاف کر دیا۔

مقام آغاز

اس سلسلے کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس ابتدائی سرے کو دریافت کیا جائے جہاں سے احیائے دین کی جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہو۔ پیغمبر اسلام کو جب حکم ہوا کہ دعوت حق کا عام اعلان کر دیں۔ تو آپ صفا کے ٹیلے پر چڑھے اور مکہ کے لوگوں کو آواز دے کر بلایا۔ یہ طریقہ مکہ میں کسی خصوصی قومی اعلان کے لئے معروف تھا۔ لوگ جمع ہوئے تو آپ نے تقریر کی:

انکم لتموتن کما تنامون ولتحیون کما تستیقظون وانھا الجنۃ ابدا او لنار ابدا (جمہرۃ خطب العرب)

بلاشبہ تم مرو گے جس طرح تم سوتے ہو، اور یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے جیسے تم جاگتے ہو۔ اور یقیناً اس کے بعد یا تو دائمی جنت ہے یا دائمی جہنم۔

گویا آپ کے نزدیک دین خداوندی کے قیام کی جدوجہد کا آغاز یہاں سے ہوتا تھا کہ لوگوں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ مگر ابولہب کو یہ سرا نظر نہ آیا۔ اس نے کہا:

تباً لک سائر الیوم الھذا جمعتنا مشکوٰۃ - باب الانذار والتحذیر

تمھارا برا ہو، کیا اسی بات کو بتانے کے لئے ہمیں جمع کیا تھا۔

ابولہب کے نزدیک عرب کی ملت ابراہیمی جن مسائل سے دوچار تھی، ان کا اس تقریر سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ عرب کی پچھڑی ہوئی قوم کو دوسری متمدن قوموں کے مقابلہ میں اٹھانے کا خواب جو وہ دیکھ رہا ہے اس کا نقطۂ آغاز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے عقیدہ کی تبلیغ شروع کردی جائے۔ اس اعتبار سے مقام محمدی یہ ہے کہ "انذار و تبشیر" کا کام احیائے ملت کا اصل ابتدائی کام نظر آئے اور مقام بولہبی یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کو سن کر آدمی کہے کہ "یہ بھی کوئی پروگرام ہے"۔

اجتماعی جدوجہد کے سلسلے میں ہمیشہ بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ جدوجہد کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ یہی سوال احیاء اسلام سے متعلق بھی ہے۔ یہاں بھی پہلا کام یہ ہے کہ مختلف عوامل کے درمیان اس موافق سرے کو تلاش کیا جائے جس کو پکڑنے کے بعد بقیہ عوامل خودبخود ہاتھ آتے چلے جائیں۔ قرآن نے اہل اسلام کے لئے ہمیشہ کے طور پر طے کر دیا کہ تمھارے لئے مقام آغاز دعوت ہے۔ یہی قرآن سے ثابت ہے (یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ) اسی کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں عمل کیا (اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ، غاشیہ) اسلام کی تاریخ میں جہاں جہاں اس طریقہ کو اختیار کیا گیا، اہل اسلام کو دائمی کامیابی حاصل ہوئی، جہاں اس کی خلاف ورزی کی گئی، مسلمانوں کو بالآخر سخت ترین ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

بعد کی تاریخ میں اسلام کی پیش قدمی کی جو مثالیں ہیں ان کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

دعوت کی راہ سے (مثال کے طور پر مصر)

سیاست کی راہ سے (برصغیر ہند)

مادی ترقیات کی راہ سے (اسپین)

دعوت کی راہ سے اسلام جن علاقوں میں داخل ہوا، وہاں اسلام کا دائمی غلبہ قائم ہوگیا۔ ایسی قوموں کے نہ صرف عقائد و رسوم بدل گئے بلکہ ان کی زبان، ان کی تہذیب، ان کے سماجی ادارے سب اسلام کے رنگ میں رنگ گئے۔ سر آرتھر کیتھ (۱۸۶۶–۱۹۵۵) نے مصر کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "مصر کی بعد کی تاریخ میں بازنطینی سلطنت کا خاتمہ اور عرب سلطنت کا قیام (۶۳۹-۴۱ھ) عمل میں آیا۔ پندرہ ہزار سے بھی کم تعداد کی عرب فوج نے ایک ایسے وقت میں یہ کامیابی حاصل کی جب کہ مصریوں کی آبادی کئی ملین تھی۔ مصریوں پر عربوں کی فتح تلوار کے ذریعہ نہیں بلکہ قرآن کے ذریعہ تھی۔ جب مصریوں نے قرآن کو پڑھنا سیکھا تو انھوں نے ایک نئی زبان کو بولنا بھی سیکھ لیا۔ یعنی عربی زبان کو۔ قرآن نے مصریوں کو عربی بولنے والا بنا دیا۔
>
> Sir Arthur Keith, *A New Theory of Human Evolution*, London, Watts & Co. 1950, p. 303

موسیو لوبون نے یہی بات ان لفظوں میں لکھی ہے " وادی نیل پر ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں نے بھی حکومت کی۔ مگر وہ یہاں قدیم فرعونی تہذیب کے بجائے اپنا تمدن رائج نہ کرسکے۔ مگر عربوں نے مصر کو عرب اور مسلمان بنا دیا" دیگر قوموں کے پاس صرف تلوار کی طاقت تھی۔ اس لئے وہ فوجی غلبہ سے آگے کوئی اثر پیدا نہ کرسکیں۔ اس کے برعکس

عربوں کے پاس قرآن کی طاقت تھی۔ اس طاقت نے مصریوں کے ذہن کو فتح کر لیا۔ حتی کہ ان کا مذہب، انکی تہذیب، ان کی زبان، ہر چیز کو بدل ڈالا۔

محمد بن قاسم ۷۱۲ء میں موجودہ پاکستان میں داخل ہوا۔ تاہم مورخین کے نزدیک برصغیر ہند میں مسلم عہد کا بانی شہاب الدین محمد غوری ہے۔ اس نے ۱۱۷۵ میں ملتان کو فتح کیا اور ۱۱۹۲ء تک سارے شمالی ہند کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس کے بعد سے مغل سلطنت کے خاتمہ (۱۸۵۷) تک ایک طویل مدت ہے جب کہ مسلمان اس ملک میں سیاست وتلوار کی راہ سے غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر جب انقلاب آیا تو ان کی عظمت کا محل اس طرح مسمار ہو گیا گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

اسپین کی تاریخ اس سے بھی زیادہ دردناک ہے۔ یہاں مسلم حکمرانی کا عہد سات سو سال (۷۱۱-۱۴۹۲) تک پھیلا ہوا ہے۔ مسلمانوں نے یہاں مادی ترقی کا جو کارنامہ دکھایا، اس سے اس وقت تک کی پوری انسانی تاریخ خالی ہے۔ حتی کہ خود وہ مسیحی جنھوں نے مسلمانوں کو مغلوب کر کے اسپین سے نکالا، وہ مادی ترقی میں مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ پیچھے تھے۔ مسلمانوں نے اس زمانہ میں فلکیات کے مطالعہ کے لئے جگہ جگہ رصد گاہیں قائم کی تھیں۔ اشبیلیہ کی رصد گاہ کے بارے میں ڈریپر (۱۸۱۱-۱۸۸۲) نے لکھا ہے کہ اسپین سے مسلمانوں (Moors) کے نکلنے کے بعد یہ رصد گاہ کلیسا کے گھنٹہ گھر میں تبدیل کر دی گئی۔ کیونکہ اسپینی باشندے اس کے استعمال کا کوئی اور طریقہ جانتے ہی نہ تھے۔ اس مادی تفوق کے باوجود اسپین اس طرح مسلمانوں سے خالی ہوا کہ چند در و دیوار کے سوا وہاں ان کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

تاریخ کا یہ تجربہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام کا یہ اصول انتہائی حکمت پر مبنی ہے کہ اسلامی جدوجہد کا نقطۂ آغاز ہمیشہ دعوت کو بنایا جائے۔ دعوت و تبلیغ کو یہ مقام دے کر گویا بتا دیا گیا کہ زندگی کا وہ اصل سرا کون سا ہے جس کو پکڑ کر تم پوری زندگی کو پکڑنے میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ یہ وہ وار ہے جو دشمن تک کو مفتوح کر لیتا ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جس کا راستہ نہ سمندر اور پہاڑ روک سکتے اور نہ توپ و تفنگ۔

موجودہ دور میں اٹھنے والی تحریکوں کو جب ہم اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں تو ان میں سے کوئی بھی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ یہ تحریکیں اسلامی۔سیاسی تحریکیں تھیں نہ کہ اسلامی۔ دعوتی تحریکیں، تقریباً ہر تحریک نے سیاسی مسائل کو اپنی جدوجہد کی بنیاد بنایا۔ جب کہ دعوتی طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی پیغام رسانی کو جدوجہد کی بنیاد بنایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کسی تحریک نے اپنے عمل کا آغاز وہاں سے نہیں کیا جہاں سے حقیقۃً اسے آغاز کرنا چاہئے تھا۔ اور جس سفر کا آغاز ہی درست سمت میں نہ ہو، وہ منزل پر کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ اس انداز تحریک کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ان تحریکوں کے واسطے سے جو لوگ اسلام سے متاثر ہوئے ان میں عام دنیوی تحریکوں جیسا سیاسی مزاج پیدا ہو گیا۔ جب کہ صحیح اسلام یہ ہے کہ آدمی کے اندر آخرت پسندانہ مزاج پیدا ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ان تحریکوں کے ذریعہ نہ اجتماعی سطح پر اسلام کا حقیقی ظہور ہو سکا اور نہ انفرادی سطح پر۔

شاکلہ

دوسری چیز شاکلہ کا مسئلہ ہے۔ مخصوص اسباب کے تحت ہر شخص اور قوم کا اپنا ایک فکری سانچہ بن جاتا ہے۔ وہ اسی فکری سانچہ کے اندر سوچتا ہے اور اسی کے مطابق کسی چیز کو صحیح اور کسی چیز کو غلط سمجھتا ہے۔ وہ اکثر بھول جاتا ہے کہ اصل حقیقت وہ نہیں ہے جو اس کے اپنے ذہنی سانچہ میں دکھائی دے رہی ہے، جو محض اتفاق سے ایک خاص شکل میں بن گیا ہے۔ بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو خدا کے علم میں ہے اور جس کو اس نے اپنی کتاب میں واضح کیا ہے:

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا

اسراء ۔ ۸۴

کہہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر چل رہا ہے سو تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جس "شاکلہ" سے سابقہ پیش آیا، اس کی ایک مثال یہود ہیں۔ یہود دیکھتے آئے تھے کہ انبیاء جو پیدا ہوتے ہیں وہ اسرائیلی نسل کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے ان کے ذہن میں بیٹھ گیا کہ نبوت اسرائیل کے خاندان کا حصہ ہے۔ جب پیغمبر آخر الزماں خاندان ابراہیمی کی اسماعیلی شاخ میں پیدا ہوئے تو انھیں اپنے ذہنی سانچہ کے اعتبار سے یہ بات ناقابل قیاس نظر آئی۔ انھوں نے "اسماعیلی نبی" کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے کہ نبوت کسی خاندان کی اجارہ داری نہیں، یہ اللہ کی دین ہے جس کو چاہے دے دے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا

نساء ۔ ۵۵

کیا وہ حسد کرتے ہیں ان لوگوں (بنی اسمٰعیل) کا اس پر جو دیا ان کو اللہ نے اپنے فضل سے۔ سو ہم نے دے دی اولاد ابراہیم (بنی اسمٰعیل) کو کتاب (موعود) اور حکمت اور ان کو دے دی ہم نے ملک عظیم (آسمانی بادشاہت جس کی خبر اسرائیلی انبیاء نے دی تھی)

اسی طرح یہود جس مذہب سے آشنا تھے، وہ مذہب وہ تھا جو سوختنی قربانی کی تعلیم دیتا تھا۔ ذبیحہ والی قربانی جس کو آگ نہ کھائے بلکہ انسان کھائیں، ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کے مذہبی شاکلہ کے لئے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ ایسے مدعیٔ رسالت کو رسول مانا جائے جو سوختنی قربانی کی تعلیم نہ دیتا ہو۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ

(آل عمران ۔۔۔ ۱۸۳)

کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم نہ مانیں کسی پیغمبر کو یہاں تک کہ لادے ہمارے پاس قربانی کہ کھا جائے اس کو آگ۔

یہود کے اس شاکلہ کو توڑنے کے لئے جو کوششیں کی گئیں، وہ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

اسلام کی جدید تاریخ بھی "شاکلہ" کے اسی مسئلہ سے دوچار ہے۔ جس طرح افراد کا ایک شاکلہ ہوتا ہے، اسی طرح قوموں کا بھی شاکلہ ہوتا ہے۔ قومیں اپنے شاکلہ (ذہنی ساخت) کے مطابق چلتی ہیں اور اسی کے زیر اثر ترک واختیار کا فیصلہ کرتی ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب پیغمبر اسلام کی بعثت ہوئی، عرب کا شاکلہ شرک پر مبنی تھا۔ خاندانی ڈھانچہ سے لے کر سیاسی نقشوں تک ہر جگہ شرک کا شاکلہ فیصلہ کن بنا ہوا تھا۔ اس اجتماعی فضا میں مذہب توحید کی گنجائش اسی وقت نکل سکتی تھی جب کہ اس شاکلۂ شرک کو توڑ دیا جائے۔

پیغمبر اسلام نے زبردست جدوجہد کرکے اس شاکلہ کو توڑ دیا۔ ایک انتہائی طور پر جامع الصفات شخصیت نے ساری ممکن قوتیں تمام تر اسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دیں۔ محنت، اخلاص، قربانی، استدلال، غرض اس راہ میں آپ نے وہ سارے ثبوت کامل درجہ میں پیش کر دیئے جو انسانوں کو متاثر کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نتائج ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ پہلے انفرادی ذہن بدلے، پھر بعض قبائل نے مجموعی طور پر اثر قبول کیا۔ پھر فتح مکہ (۸ھ) کے دن جب مرکز عرب (کعبہ) میں رکھے ہوئے تمام قبائل اور مذاہب کے بت لوگوں کے سامنے توڑ دیئے گئے تو ان کا مشرکانہ شاکلہ آخری طور پر ٹوٹ گیا، وہ سمجھ رہے تھے کہ محمدؐ ان بتوں کی توہین کر رہے ہیں جو ان کے عقیدہ کے مطابق نظام اسباب پر حکمراں ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان پر ان بتوں کا عتاب نازل ہو۔ اس کے برعکس جب انھوں نے دیکھا کہ تقریباً چار سو بتوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور نہ آسمان پھٹا اور نہ کہیں زلزلہ آیا تو انھیں یقین ہو گیا کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ "فتح" نے ان کا مشرکانہ شاکلہ آخری طور پر توڑ دیا۔ اور وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ (نصر)

اس طرح انسانی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، سارے عالم کا طرز فکر جو اس سے پہلے شرک پر مبنی تھا، توحید کے زیر اثر آ گیا۔ دنیا کے تمام مذاہب، تمام فکری مدرسے، تمام تحریکیں اس سے مرعوب ہو کر رہ گئیں۔ مذہب کے دائرے میں ہر جگہ پاپائیت اور برہمنیت کی شکل میں پیشوایان دین کو رب بنا لیا گیا تھا۔ اب نظر آیا کہ سب انسان یکساں ہیں اور خدا کی نظر میں صرف بندے ہیں۔ اس طرح بندوں کی پرستش کا دور ختم ہو کر خدا کی پرستش کا دور شروع ہوا۔ کائنات کے مظاہر جن کو اس سے پہلے دیوتا سمجھا جانے لگا تھا، ایک خدا کی مخلوق قرار پائے۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار ان کی تسخیر کا ذہن پیدا ہوا۔ جس کی ابتدا بغداد اور قرطبہ اور صقلیہ میں ہوئی اور بالآخر یورپ پہنچ کر وہ موجودہ سائنسی انقلاب کی بنیاد بنا۔ سیاست کا یہ حال تھا کہ شاہی خاندان کے افراد الوہیت کا پیکر سمجھے جانے لگے تھے۔ اب لوگوں کو نظر آیا کہ وہ ہماری طرح خدا کے بندے ہیں۔ اس طرح وہ نیا سیاسی ذہن ابھرا جس نے شورائی خلافت کی بنیاد رکھی اور بعد کو یورپ پہنچ کر جمہوریت اور آزادی کے انقلاب کی صورت میں رونما ہوا۔

یہ دور آغاز اسلام سے لے کر یورپ کی نشاۃ ثانیہ تک پورے ایک ہزار سال تک باقی رہا۔ پچھلے مجددین عمر بن عبد العزیز (۲۰ - ۶۸۲) سے لے کر شیخ احمد سرہندی (۱۶۲۵-۱۵۶۴) تک جو امت

میں اٹھے وہ سب اسی دور میں اٹھے۔ ان کا سامنا ایک ایسی دنیا سے تھا جہاں غیر اسلامی شاکلہ شکست کھا چکا تھا۔ اس زمانہ میں لوگوں کی گمراہی غفلت یا بے عملی کی نوعیت کی ہوتی تھی، نہ کہ بغاوت کی نوعیت کی۔ اس لئے سابق مجددین کی کوششیں صرف عمومی تذکیر و نصیحت سے بارآور ہوتی رہیں۔ جب وہ لوگوں کو اسلام کی طرف "لوٹنے" کے لئے کہتے تو وقت کا شاکلہ پوری طرح ان کا ساتھ دینے کے لئے موجود ہوتا تھا۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لایزال الناس یتساءلون حتی یقال هذا "خلق اللّٰه الخلق فمن خلق اللّٰه"، فمن وجد فی نفسه شیئاً من ذلک فلیقل آمنت باللّٰه تعالیٰ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لوگ سوال کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ کہا جائے گا۔ "خدا نے مخلوقات کو بنایا تو خدا کو کس نے بنایا"، جو شخص اس قسم کی بات اپنے اندر پائے تو وہ کہے کہ میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر۔

یہ اس آنے والے دور کی پیشین گوئی تھی جب کہ "خالق" کا مسلمہ ٹوٹ جائے گا اور دنیا کی گمراہی خدا کو مان کر اس کا شریک ٹھہرانے کے بجائے یہ ہوگی کہ وہ خود خدا ہی کو ماننے سے انکار کر دے۔ اس وقت اہل ایمان کا کام یہ ہوگا کہ وہ خالق کے عقیدہ کو از سر نو علمی مسلّمہ بنانے کی کوشش کریں اور الحاد کی فکری بنیاد کو ڈھانے پر سارا زور صرف کریں جس طرح قرن اول میں شرک کی بنیاد کو منہدم کیا گیا تھا۔

جدید سائنسی انقلاب کے بعد تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جب کہ انسانی شاکلہ دوبارہ ٹوٹ گیا اور قدیم شاکلہ کی جگہ ایک نیا شاکلہ وجود میں آیا جو تمام تر الحاد کی بنیاد پر قائم تھا۔ اس نئے دور کا آغاز اگرچہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے ساتھ شروع ہوگیا تھا مگر نمایاں شکل میں وہ اٹھارویں صدی سے سامنے آیا ہے۔ اور اس طرح اب اس دور الحاد کو تقریباً دو سو برس گزر چکے ہیں۔

قدیم زمانہ میں بھی ایسے لوگ تھے جو خدا اور مذہب کو نہ مانتے ہوں۔ مگر ان کا نہ ماننا محض ایک انفرادی انکار کی حیثیت رکھتا تھا جب کہ موجودہ زمانہ میں انکار نے علم اور تحقیق کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ طبیعیات کی یہ دریافت کہ سارا عالم اسباب وعلل کے اصولوں پر قائم ہے اور یہ اصول اس قدر محکم ہیں کہ ان کو معلوم کر کے استعمال کیا جا سکتا ہے، اس نے علمی دنیا میں یہ ذہن پیدا کیا کہ کائنات کو متحرک کرنے کے لئے کسی خدا کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ اپنے قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ حیاتیاتی ارتقاء کی "دریافت" نے انسان کو بتایا کہ کائنات کے حسن اور معنویت کی توجیہہ کے لئے کسی خالق اور حکیم کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ معلوم اسباب ہی اس کے حسن اور معنویت کی توجیہہ کے لئے کافی ہیں۔ آلاتی ذرائع سے انسان کی قوت مشاہدہ کروڑوں گنا بڑھ جانے کے باوجود جب محسوس دنیا سے باہر کوئی "دوسرا عالم" نظر نہ آیا تو اس کے بعد یہ ذہن پرورش پانے لگا کہ موجودہ مادی دنیا کے ماسوا کوئی اور دنیا سرے سے اپنا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔ قدیم زمانہ میں "چاند" ایک آسمانی دیوتا تھا۔ آج چاند انسان

کے قدموں کے نیچے آچکا ہے۔ ان واقعات نے پورے انسانی فکر کو بدل دیا۔ ساری دنیا میں سوچنے کا ایک نیا سانچہ وجود میں آیا جس کو ہم نے "شاکلۂ الحاد" سے تعبیر کیا ہے۔

موجودہ دور میں تجدید و احیائے دین کی جو تحریکیں اٹھیں اور ناکام رہیں، ان کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ماضی کے مجددین پر قیاس کرتے ہوئے صرف روایتی طرز کی تذکیر و تشویق کو کافی سمجھا اور اس میں لگے رہے، حالاں کہ زمانہ دوبارہ لوٹ کر وہاں چلا گیا تھا جب کہ پہلا کام یہ تھا کہ وقت کے شاکلہ کو توڑنے پر ساری قوت صرف کر دی جائے۔ کیونکہ جب تک شاکلہ نہ ٹوٹے، زمانہ حال میں اسلام کو اس کی صحیح جگہ نہیں دلائی جا سکتی۔

وقت کے شاکلہ کو توڑنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے، اس کی ایک مثال سوشلزم ہے۔ جدید سوشلزم سے پہلے ساری دنیا کا یہ مسلمہ تھا کہ " ذاتی ملکیت ہر حال میں محترم ہے" یہ بالکل ناقابل تصور تھا کہ کسی کی ذاتی ملکیت کو اس سے چھین لیا جائے۔ ایسا کرنے والا لوگوں کی نظر میں غاصب اور ظالم شمار ہوتا تھا۔ مگر آج یہ اقتصادی شاکلہ ٹوٹ چکا ہے۔ آج ساری دنیا میں ذاتی ملکیت کی جگہ " سماجی مفاد" نے اہمیت حاصل کر لی ہے اور حکومت کا یہ حق عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ سماجی مفاد کے نام پر جس چیز کو چاہے اپنی ملکیت میں لے لے۔

یہ شاکلہ کیسے ٹوٹا۔ اس کی طویل تاریخ ہے جو تقریباً ایک صدی تک پھیلی ہوئی ہے۔ "سوشلزم" کی اصطلاح، موجودہ اقتصادی معنوں میں، پہلی بار ۱۸۲۶ء میں ایک برطانوی اخبار کوآپریٹو میگزین میں استعمال کی گئی۔ اس کے بعد سے بے شمار مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے اس نظریہ کی حمایت میں اعلیٰ ترین کتابیں لکھ کر دنیا کے ادب کو سوشلسٹ لٹریچر سے پاٹ دیا۔ صرف مارکس نے ۳۵ سال کے مطالعہ کے بعد اپنی کتاب لکھی۔ اس کے بعد اس فکری سیلاب کے نتیجہ میں درجنوں بڑی بڑی تحریکیں وجود میں آئیں —— سوشلزم، بالشوزم، فیبین ازم، کرسچین سوشلزم، کمیونزم، سنڈیکلزم، گلڈ سوشلزم وغیرہ۔ اس کے علاوہ ساری دنیا میں لیبر تحریکوں اور ٹریڈ یونینوں کا جال بچھ گیا۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے بعد سوشلسٹ خیالات کی اشاعت کا کام ایک منظم حکومت کی سطح پر ہونے لگا جس نے اس کی مقدار اور نوعیت میں ہزاروں گنا زیادہ اضافہ کر دیا۔ اس طرح یہ ممکن ہو سکا ہے کہ زمین کے ایک بڑے حصہ پر لوگوں کی نجی ملکیتیں منسوخ کر کے سوشلسٹ نظام قائم ہوا اور دنیا کا ذہن انھیں ایک جائز اقتصادی کارروائی کی حیثیت سے تسلیم کرے۔

موجودہ زمانہ میں الحاد کا شاکلہ توڑنے کے لئے بھی اسی قسم کی طویل اور عمیق جدوجہد درکار ہے۔ اس کے بغیر آج کی دنیا میں اسلام کو اس کی جگہ نہیں دلائی جا سکتی۔

خلافت تحریک یا اتحاد اسلامی (پان اسلام ازم) کی تحریک اپنی ساری وسعتوں کے باوجود ناکام ہو گئی۔ اس کی وجہ حقیقۃً کوئی " سازش" نہ تھی۔ بلکہ وقت کے عالمی حالات نے اس کو ختم کیا۔ جب افکار کا سیلاب

ساری دنیا کو جغرافی قومیتوں کی طرف لے جا رہا ہو تو آپ اس کے خلاف کوئی آفاقی جزیرہ نہیں بنا سکتے۔ الّا یہ کہ جوابی سیلاب کے ذریعے آپ عالمی افکار کو تبدیل کر چکے ہوں۔ مصر میں اخوان المسلمین کی ناکامی کا ذمہ دار کوئی "معاند اسلام" نہیں ہے۔ اس کی وجہ اسلام کے علم برداروں کا یہ معصومانہ اندازہ ہے کہ وہ اجتماعیات کے بارے میں عوامی طرزِ فکر کو بدلے بغیر اپنے ملک میں اسلام کا سیاسی مینار کھڑا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے اسلام پسندوں کو اسلامی حکومت کے قیام میں ناکامی ہوئی۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انھوں نے وقت کے تقاضوں کے علی الرغم یہ فرض کر لیا کہ وہ بیلٹ بکس کے ذریعہ اسلامی انقلاب کو برآمد کر سکتے ہیں۔

جدید مسئلہ

وہ چیز جس کو ہم "اسلام کا جدید مسئلہ" کہتے ہیں، اس کی ابتدا پانچ سو برس پہلے ہوئی جب کہ ایک طرف پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما (۱۵۲۴ - ۱۴۶۰) نے مشرق و مغرب کے درمیان سمندری راستہ معلوم کیا۔ اور دوسری طرف اطالوی جہاز راں کرسٹوفر کولمبس (۱۵۰۶ - ۱۴۴۶) نے اٹلانٹک کو پار کر کے پرانی دنیا اور نئی دنیا کو بحری طور پر مربوط کر دیا۔ ان دریافتوں کے بعد سمندری جہاز رانی بالکل نئے دور میں داخل ہوگئی۔

پندرھویں صدی تک یورپ سے ہندوستان آنے کے دو راستے تھے۔ ایک خشکی کا، دوسرا شام و مصر ہو کر بحری راستہ۔ یہ دونوں عربوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس وقت عرب تجار جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر چھائے ہوئے تھے اور ان کی تجارتی کامیابیوں کے جلو میں اسلام کی اشاعت اس علاقہ میں تیزی سے ہو رہی تھی۔ ملابار میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہوگئی تھی کہ وہاں کے ہندو راجہ کی طرف سے ان کے معاملات فیصل کرنے کے لئے ایک مسلمان قاضی مقرر کیا گیا جس کو ہنزمن (ہنرمند) کہتے تھے۔ عرب تجار خلیج فارس کی بندرگاہوں سے، جن میں مشہور سیراف اور بصرہ ہے، سندھ آتے اور یہاں سے سمندر کے کنارے کنارے کوکن اور گجرات کے سواحل سے گزر کر مدراس کے سواحل پر پہنچتے، پھر یہاں سے لنگر اٹھا کر مشرقی بنگال اور آسام کو عبور کر کے چین کی راہ لیتے۔ راستہ میں مالدیپ، سیلون، سنگاپور، جاوا، سوماترا اور دوسرے جزائر کی طرف بھی نکل جاتے۔ ان کی یہ تجارتی گزرگاہیں اشاعت اسلام کی کوششوں کا مرکز بن گئی تھیں۔

مگر پندرھویں صدی کا خاتمہ ان کوششوں کا بھی اختتام بن گیا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کیپ کے راستہ سے ہندوستان کے جنوبی ساحل (کالی کٹ) میں داخل ہوا۔ البوقرق نے ۱۵۱۱ء میں ملکا پر قبضہ کر کے بحر ہند میں پرتگالیوں کی بحری طاقت قائم کی۔ گویا پرتگالیوں کے قبضہ میں آگیا۔ اکبر (۱۶۰۵ - ۱۵۴۳) کے زمانہ تک پرتگالی بحر ہند میں اس حد تک دخیل ہو چکے تھے کہ ان حاجیوں کو جو ہندوستان سے مکہ جاتے تھے اور جن میں بعض اوقات شاہی خاندان کے لوگ اور امرا بھی ہوتے تھے، پرتگالی اکثر راستہ میں لوٹ لیتے تھے۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "خشکی پر مغل اعظم کا جھنڈا کیوں نہ ہو، سمندر کے مالک پرتگالی تھے۔

پرتگالیوں نے ہندستانی سمندر پر قبضہ کرکے عربوں سے جنوبی ہند کی تجارت چھین لی۔ عربوں کے لئے بحری راستہ سے ہندستان میں آنا ممکن نہ رہا جو نہ صرف سفر کے لئے بلکہ تجارتی سامان منتقل کرنے کے لئے بھی سب سے آسان ذریعہ تھا۔ جنوبی ہند سے عرب تجار کا تعلق منقطع ہونے کے بعد اس پورے علاقہ میں اسلام کی اشاعت کا کام رک گیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

واسکوڈی گاما کے انتقال کے ۴۰ سال بعد شیخ احمد سرہندی (۱۶۲۵ - ۱۵۶۴) پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا زمانہ ٹھیک وہی ہے جب کہ جنوبی ہند کے ساحل پر وہ واقعہ رونما ہوچکا ہے جو بالآخر اس ملک کی نئی تاریخ بنانے والا ہے۔ مگر انھیں اس واقعہ کی خبر تک نہیں ہوتی۔ ایک طرف عالم بالا میں ان کی روحانی پرواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ وحدت وجود کی پیچیدہ بحث پر مجتہدانہ فیصلہ دے سکیں۔ مگر وہ خود اپنے ملک کے اس واقعہ سے بے خبر رہتے ہیں کہ مغربی قومیں بحری طاقت کو ترقی دے کر ملک کے سواحل پر قبضہ کر رہی ہیں جو بالآخر یہاں تک پہنچنے والا ہے کہ مدراس سے لے کر بمبئی اور کلکتہ تک پورا ساحلی ہندستان ان کے قبضہ میں چلا جائے اور دہلی کی سلطنت ان کے مقابلہ میں بے بس ہو کر رہ جائے۔ وہ اکبری فتنوں کو دیکھتے ہیں اور ان کی اصلاح کی تدبیر کرتے ہیں مگر پرتگالی فتنے انھیں نظر نہیں آتے جو بعد کو پیدا ہونے والے نتائج کے اعتبار سے بدرجہا زیادہ شدید ہیں۔ سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی (۱۷۸۲ - ۱۷۲۲) پہلا شخص تھا جس نے بحری طاقت کی جدید اہمیت کو محسوس کیا۔ اس نے مالدیپ کے جزیرہ میں بحری جہازوں کا کارخانہ قائم کرنے کی بھی کوشش کی، مگر اب وقت گزر چکا تھا، وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔

دور جدید میں قوت اور غلبہ کا عنصر جس چیز نے پیدا کیا وہ مشین ہے۔ مشینی انقلاب کا آغاز اسٹیم کی دریافت سے ہوتا ہے۔ یعنی بھاپ کی طاقت کا صنعتی استعمال۔ اسٹیم انجن کی دریافت نے جدید صنعت کو ممکن بنایا اس سے پہلے آدمی اپنی عضلاتی طاقت یا حیوانات سے کام لیتا تھا یا بعض حالات میں پانی اور ہوا کو استعمال کرتا تھا۔ اب ایک انجن ہزاروں گھوڑوں کا کام کرنے لگا۔ وہ کارخانہ کو طاقت فراہم کرسکتا تھا، وہ خشکی اور سمندر میں انسان اور اس کے اسباب کو لے کر تیزی سے دوڑ سکتا تھا۔ یہی مشینی طاقت ہے جس نے اہل مغرب کو اس قابل بنایا کہ وہ قدیم روایتی دنیا کو شکست دے کر اس کے اوپر قابض ہو جائیں۔

پہلا اسٹیم انجن جس نے دریافت کیا، وہ انگلستان کا ٹامس سیوری (۱۷۱۵ - ۱۶۵۰) ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ ٹامس سیوری اور اورنگ زیب (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) دونوں ہم زمانہ ہیں۔ ٹامس سیوری نے اپنا پہلا اسٹیم انجن ۱۶۹۸ میں پیٹنٹ کرایا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب کہ ایک طرف ہندوستان کے تخت پر شہنشاہ عالم گیر حکمراں تھا جو دین اور سیاست دونوں کا جامع ترین نمونہ تھا۔ دوسری طرف ترکی کی عثمانی سلطنت پر سلطان احمد سوم (۱۷۳۶ - ۱۶۷۳) تخت نشین تھا۔ مگر مغل سلطنت یا عثمانی سلطنت دونوں میں سے کسی کو بھی طاقت کے معیار میں اس انقلابی تبدیلی کی اس وقت تک خبر نہ ہوسکی جب تک کہ اس نے وسعت حاصل کرکے خود ان کے وجود کو ختم نہ کر دیا۔

دور جدید کا ایک اور واقعہ جو اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے، وہ پریس کی ایجاد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا شخص جو لکڑی سے پرنٹنگ پریس بنانے میں کامیاب ہوا، وہ جرمنی کا گوٹن برگ (۱۴۶۸-۱۳۹۸) تھا۔ لندن کے ولیم نکلسن نے پہلی بار لوہے سے بنا ہوا اور مشین سے چلنے والا پرنٹنگ پریس پیٹنٹ کرایا۔ یہ ۱۷۹۰ کی بات ہے جب کہ محمد بن عبد الوہاب نجدی (۱۷۹۱-۱۷۰۳) زندہ تھے اور "بدعات" کے خلاف اپنی تحریک میں اس حد تک کامیاب ہو چکے تھے کہ نجد کے ایک حاکم (محمد ابن سعود) نے ان کے نظریہ کو قبول کر لیا تھا۔ لندن ٹائمس پہلا اخبار تھا جس نے اپنی اشاعت ۲۹ نومبر ۱۸۱۴ کو اسٹیم انجن سے چلنے والے پریس کے ذریعہ چھاپا۔ اس وقت بڑی بڑی مسلم شخصیتیں موجود تھیں، مگر سارے عالم اسلام میں کوئی شخص نہیں ملتا جس نے بروقت اس بات کو محسوس کر لیا ہو کہ دنیا میں ایک نئی طاقت وجود میں آگئی ہے جس کا نام پریس ہے اور جو عنقریب ساری ذہنی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ پہلا شخص جس نے مصر میں چھاپہ کو رواج دیا وہ نپولین (۱۸۲۱-۱۷۶۹) تھا۔ وہاں سے رفتہ رفتہ یہ فن دوسرے عرب ممالک میں پہنچا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے سب سے اہم اور دور رس واقعہ وہ ہے جس کو جدید سائنس کہتے ہیں۔ سائنس کے ظہور کے ابتدائی عناصر اگرچہ تاریخ میں بہت پہلے سے کام کر رہے تھے، تاہم وہ نمایاں وقت جب کہ انسانی تاریخ ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں داخل ہوئی، اس کا آغاز نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) سے ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲-۱۷۰۳) پیدا ہوئے تو نیوٹن ابھی زندہ تھا۔ اور اس کی مشہور کتاب پرنسپیا (۱۶۸۷) وجود میں آچکی تھی۔ مگر جب کہ اسلام کی حریف قومیں روایتی علم کے ڈھانچہ کو توڑ کر ایک نیا تسخیری علم وجود میں لا رہی تھیں، شاہ ولی اللہ روایتی ڈھانچہ سے باہر آکر مسئلہ کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے مروجہ تصوف کی نئی تشریح کو کافی سمجھا۔ ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس کو انھوں نے اسرار دین کو بے نقاب کرنے کے لئے لکھا تھا، اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود زیادہ تر اسرار فقہ کو بیان کرنے والی کتاب ہے اور وہ بھی قدیم روایتی انداز میں۔ عالم لاہوت میں ان کی پرواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ ان کو "الہام" ہونے لگتا ہے۔ وہ "قائم الزمان" مقرر کئے جاتے ہیں اور "فاتح کل نظام" کی خدمت ان کے سپرد ہوتی ہے۔ مگر ان کی کسی بھی تصنیف میں یہ سراغ نہیں ملتا کہ وہ اپنے وقت کے یورپ میں ہونے والے اس واقعہ سے باخبر تھے جو بالآخر ساری اسلامی دنیا کے لئے تاتاریوں کی غارت گری سے بھی زیادہ بڑا سانحہ بننے والا تھا۔

پھر اسی زمانہ میں اس فکری انقلاب کی صورت گری ہوئی جس کو جمہوریت کہتے ہیں۔ فرانس کا جمہوری انقلاب (۱۷۸۹) اور امریکہ کی نو آبادیوں کا انگلستان سے علیحدہ ہو کر قومی حکومت بنانا (۱۷۸۳) اگرچہ شاہ ولی اللہ کے بعد پیش آیا، مگر ان واقعات کے فکری عوامل ان کے زمانے میں مکمل طور پر وجود میں آچکے تھے۔ حتیٰ کہ روسو (۱۷۷۸-۱۷۱۲) اور شاہ ولی اللہ بالکل ہم عصر تھے۔ مگر وہ اس دور رس سیاسی طوفان کے سلسلے میں مسلمانوں کو کوئی رہنمائی نہ دے سکے۔ ان کے نامور فرزند شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۸۲۳-۱۷۶۲) کے زمانے میں یورپ

اور امریکہ کے جمہوری انقلابات وقوع میں آئے۔ اگرچہ ان کی سیاسی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ ان کو "سراج الہند" کے خطاب سے نوازا گیا۔ مگر ان کے لئے بھی یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مسلمانوں کو وہ روشنی دیں جس کے مطابق وہ دور جدید میں اپنی اجتماعی تحریک کی مؤثر منصوبہ بندی کر سکیں جب کہ ساری دنیا میں جمہوریت (دوسرے لفظوں میں اکثریتی طبقہ کی حکومت) کا اصول ایک سیاسی مسلمہ بن چکا تھا، ہندوستان میں علماء اور بزرگوں کی نسل درنسل وطنی قومیت کی بنیاد پر ایک ملکی حکومت کے قیام میں اپنا جان و مال قربان کر رہی تھی، جس سے حیرت انگیز طور پر وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ مسلم اقلیت دوبارہ ملک میں غلبہ کا مقام حاصل کرے گی۔ جدید سیاسی تبدیلی سے وہ اس وقت تک باخبر نہ ہو سکے جب تک ۱۹۴۷ کے انقلاب نے اپنا آخری فیصلہ دے کر انھیں مجبور نہ کر دیا کہ وہ حجرہ نشین ہو کر اپنی مقتول امنگوں کو حسرت کے ساتھ دیکھتے رہیں اور اسی حال میں اس دنیا سے چلے جائیں۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ احیائے ملت کے لئے اٹھے، انھیں کام کرنے کے بے پناہ مواقع ملے۔ انڈونیشیا کے عبدالقہار مذکر (۱۹۷۳-۱۹۰۲) صدر سوئیکارنو کے قریبی دوست تھے، وہ صدر کے تعاون سے اپنے ملک میں دین کی ترقی اور استحکام کے ایسے بہت سے کام شروع کر سکتے تھے جو ان کے اور سوئیکارنو کے چلے جانے کے بعد بھی انڈونیشیا کی سماجی تشکیل میں اپنے اثرات ظاہر کرتے رہتے۔ مگر انھوں نے دستور کو اسلامی بنانے کے مسئلہ پر حکومت وقت سے لڑائی چھیڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس حال میں اس دنیا سے چلے گئے کہ شکایت اور احتجاج کے سوا کچھ ان کے حصہ میں نہیں آیا تھا۔

یہی موجودہ زمانہ میں تمام مسلم ملکوں کا حال ہوا ہے۔ مصر و شام کا علاقہ مخصوص اسباب کی بنا پر سارے عالم اسلام کے درمیان فکری قائد کی حیثیت رکھتا ہے، قدرت نے بھی یہاں شخصیتوں کو پیدا کرنے میں نہایت فیاضی سے کام لیا۔ جمال الدین افغانی پہلی بار جب امیر شکیب ارسلان سے ملے تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا:

انا اھنأ ارض الاسلام التی انبتتک — میں اس سرزمین اسلام کو مبارک باد دیتا ہوں جس نے تمھارے جیسا شخص پیدا کیا

صرف اس علاقہ سے حالیہ دور میں جو بڑی بڑی شخصیتیں اٹھیں، اگر وہ عملی امکانات سے صحیح فائدہ اٹھاتیں اور ارباب اقتدار سے غیر ضروری تصادم کی غلطی نہ کرتیں تو آج عالم اسلام میں ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو چکا ہوتا۔ چند نام ملاحظہ ہوں:

حسن البنا مصری	(۱۹۴۸ — ۱۹۰۶)
مفتی محمد عبدہ مصری	(۱۹۰۵ — ۱۸۴۹)
رشید رضا شامی ثم مصری	(۱۹۳۵ — ۱۸۸۶)
امیر شکیب ارسلان شامی	(۱۹۴۶ — ۱۸۶۹)
سید محمد قطب مصری	(۱۹۶۶ — ۱۹۰۶)

اس قسم کی درجنوں شخصیتیں جنھیں اس علاقہ میں کام کرنے کا موقع ملا، ان کی مجموعی مدت کار ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ انھیں نہ صرف عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، بلکہ حکمراں طبقہ میں بھی ایسے با اثر لوگ موجود تھے جو انھیں دینی اصلاح کے کام میں اعلیٰ ترین مواقع دے رہے تھے۔ حکومت مصر کے وزیر تعلیم مصطفیٰ ریاض پاشا (۱۹۱۱ــ ۱۸۴۳) جمال الدین افغانی کو تعلیمی اور اصلاحی کام میں ہر قسم کا حکومتی تعاون دینے کے لئے تیار تھے۔ مصر کے وزیر اعظم سعد زغلول پاشا (۱۹۲۷ــ ۱۸۶۰) مفتی محمد عبدہ سے متاثر تھے۔ صدر جمال عبد الناصر (۱۹۷۰ــ ۱۹۱۸) نے مصر میں سید قطب کو وزارت تعلیم کے عہدہ کی پیش کش کی تھی، وغیرہ۔ مگر بلا استثنا ہر ایک نے یہ کیا کہ حاصل شدہ مواقع کو چھوڑ کر ان مواقع کے پیچھے دوڑ پڑا جو ابھی حاصل نہ ہوئے تھے۔ انھوں نے کام اس کو سمجھا کہ ارباب اقتدار سے سیاسی جنگ چھیڑ دی جائے۔ ان کے گرد و پیش ان کے لئے کرنے کے بہت سے اہم ترین کام موجود تھے —— مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح، جدید دور کے اعتبار سے اسلامی لٹریچر کی تیاری، مسلم قوموں کو جدید صنعتی اور سائنسی معنوں میں طاقت ور بنانا، عالم عرب میں اتحاد پیدا کرنا، تیل کی عظیم قدرتی طاقت سے روشناس کرانا اور اس کو کار آمد بنانا، افریقہ کے غیر مسلم قبائل میں اسلام کی تبلیغ جو ایک بے پناہ امکان کی حیثیت سے صدیوں سے اس بر اعظم میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ افریقہ کے مسلم ممالک میں مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی کو دور کرنا جس کی وجہ سے غیر مسلم عیسائی اقلیت ان کے اوپر چھائی ہوئی ہے۔ وغیرہ۔ مگر اپنے تمام تر اخلاص اور قربانی کے باوجود وہ ان میں سے کسی کام کے لئے سرگرم نہ ہو سکے۔

موجودہ دور کے مسلم مصلحین سے ایک بڑی اجتہادی غلطی یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے سمجھا کہ جن ملکوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور جہاں ان کا سیاسی اقتدار قائم ہے، وہاں وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ قانون اسلامی کے نفاذ کے مطالبہ سے اپنی مہم کا آغاز کر سکیں۔ یہ ایک اندوہناک قسم کا غلط اندازہ تھا جس سے عملاً اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا کہ وہ اپنے ملکوں میں حزب مخالف کا پارٹ ادا کر کے ختم ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم اقلیت کے ملکوں میں جو مسئلہ مقامی غیر مسلم اکثریت کی طرف سے ہے، وہی مسلم اکثریت کے ممالک میں عالمی حالات کی جانب سے ہے۔ مزید یہ کہ مسلم ملکوں کے تمام حکومتی شعبوں پر چونکہ وہی لوگ قابض ہیں جن کی تعلیم مغربی طرز کے اداروں میں ہوئی ہے کیونکہ وہی جدید دور کی ایک ریاست چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس لئے مسلم ملکوں کا برسر اقتدار طبقہ بھی، اسلام سے طبعی ہمدردی رکھنے کے باوجود، مزاجاً، اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے یہاں خالص مذہبی ریاست کے قیام کا اعلان کر دے۔ مصر، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ ان ملکوں میں موجودہ صدی کے وسط میں جو اسلامی تحریکیں اٹھیں، وہ اپنی ساری مقبولیت اور ترقی کے باوجود، اسلامی قانون کے نفاذ میں تو کامیاب نہیں ہوئیں، البتہ مسلم ملک ہونے کی وجہ سے وہاں ان کو اسلامی دعوت کے کام کو مؤثر طور پر چلانے کے لئے جو خصوصی مواقع حاصل تھے وہ بھی اختلافی اور احتجاجی سیاست کے نتیجہ میں برباد ہو گئے۔ رجاء بن حیوۃ نے اموی حکمراں سلیمان بن عبد الملک کی مصاحبت اختیار کر کے اس کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے بعد خلافت کے منصب کے لئے عمر بن عبد العزیز

(۶۸۲ء ـ ۷۲۰ء) کو نامزد کر دے۔ قاضی ابو یوسف (۷۳۱ ـ ۷۹۸ء) نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے تحت قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کر کے دکھایا کہ اسلام کس طرح بدلے ہوئے حالات میں بھی قانونی رہنمائی کر سکتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ ـ ۱۶۲۵) نے مغل شہنشاہ جہاں گیر سے مل کر اکبری بدعات کو ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ حکمرانوں کے ساتھ مصالحت کا یہ طریقہ جو جزدی اصلاحات کے لئے اس سے پہلے کچھ بزرگوں نے اختیار کیا، یہی اگر موجودہ زمانہ کے مصلحین نے احیاء اسلام کی تحریکوں کے لئے اختیار کیا ہوتا تو اب تک اظہار دین اور غلبۂ اسلام کا وہ کام انجام پا چکا ہوتا جس کے لئے ابھی ہم صرف غور و فکر کر رہے ہیں۔

ملت کی تعمیر

اسلامی دعوت اگر ایسے علاقہ میں شروع ہو جہاں داعی کے سوا بقیہ لوگ اسلام کو نہ ماننے والے ہوں تو وہاں اسلامی دعوت کی مہم تمام تر انذار و تبشیر پر مرکوز رہے گی۔ لیکن اگر وہاں اسلام کو ماننے والے لوگ بھی موجود ہوں تو بشرط ضرورت ان کی تعمیر و استحکام کا کام کرنا بھی داعی کے فرائض میں داخل ہوگا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ ؑ کی مثال میں نظر آتا ہے۔ آپ کو ایک طرف حکم ملا کہ فرعون اور مصر کی قبطی قوم کو آنے والے دن سے ہوشیار کریں (اِذْهَبَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ، طٰہٰ ۴۳) دوسری طرف آپ کو یہ کام بھی سونپا گیا کہ آپ اس وقت کے مسلمان (بنی اسرائیل) کو فرعونی عذاب سے نجات دلائیں (فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ، طٰہٰ۔ ۴۷) اس دوسرے کام کو بائبل میں "اپنی امت کو مصیبت سے چھڑانا" کہا گیا ہے (اعمال، ۷ : ۳۴)

وہ چیز جس کو دور جدید کہتے ہیں، اس کا اثر سب سے زیادہ مسلمانوں پر پڑا۔ کیوں کہ جدید قوتوں کے بل پر جب مغربی قومیں دنیا کے اوپر چھا گئیں، تو یہ وہی دنیا تھی جس کے بڑے حصہ پر مسلمان غلبہ حاصل کئے ہوئے تھے۔ فطری طور پر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر تعمیر نو کی تحریکیں بہت بڑے پیمانہ پر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان تحریکوں پر اب دو سو برس کی مدت گزر چکی ہے، مگر آج بھی یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مسلمان دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو حاصل کریں۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان مسئلہ کی اصل نوعیت کو سمجھ نہ سکے اور سطحی اور جذباتی تدبیروں میں اپنا مستقبل تلاش کرتے رہے۔

روس کا اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) اور ترکی کا قومی انقلاب (۱۹۲۲) دونوں تقریباً ہم زمانہ ہیں۔ مزید یہ کہ روسی انقلاب کے بانی ولادیمر لینن (۱۸۷۰-۱۹۲۴) کے مقابلہ میں ترک انقلاب کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک (۱۸۸۱-۱۹۳۸) کو چودہ سال زیادہ زندہ رہنے اور کام کرنے کا موقع ملا۔ مگر حال یہ ہے کہ روس آج خلا میں اپنے راکٹ پھینک رہا ہے اور ترکی ابھی تک زمین پر بھی اپنے کو مستحکم نہ کر سکا۔

اس فرق کی وجہ محض اتفاقی نہیں۔ اس کے پیچھے گہرے تاریخی اسباب ہیں۔ کمال اتاترک کو جب ترکی میں اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے تعمیر و ترقی کا راز اس میں سمجھا کہ وہ مغربی تہذیب کی مکمل نقالی کریں۔ انھوں نے قدیم "مذہبی ریاست" کے بجائے ترکی کو سیکولر اسٹیٹ بنایا۔ شرعی قانون کو ختم کرکے سوئزر لینڈ کا قانون دیوانی، اٹلی کا قانون فوجداری اور جرمنی کا قانون بین اقوامی تجارت اپنے ملک میں رائج کیا۔ دینی تعلیم ممنوع قرار پائی۔ پردہ خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ مخلوط تعلیم کا نفاذ کیا گیا۔ ترکی زبان میں عربی حروف تہجی کی جگہ انتہائی بے رحمانہ طور پر لاطینی حروف جاری کئے گئے۔ عربی میں اذان دینا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ حج کے لئے مکہ جانے کی اجازت ختم کردی گئی۔ قوم کا لباس تبدیل کر دیا گیا ہیٹ کو استعمال کرنا قانوناً لازمی قرار دے دیا گیا۔ حتیٰ کہ ترکوں کو ہیٹ پہنانے کی مہم نے ایک باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کرلی۔ بے شمار لوگ صرف اس لئے پھانسی پر چڑھا دیئے گئے کہ وہ اپنی قومی ٹوپی (طربوش) کو چھوڑ کر ہیٹ پہننے کے لئے

تیار نہ تھے ۔ لوگ گرفتار کئے جاتے اور محض اس جرم میں انھیں گولی ماردی جاتی کہ انھوں نے ہیٹ کا مذاق اڑایا ہے یا اس کو سر پر رکھنے سے انکار کیا ہے ۔ بالآخر شدید جنگ کے بعد جب ہیٹ پہنانے کی مہم کامیاب ہوئی تو مصطفےٰ کمال نے اپنی اس فتح کا اظہار اس طرح کیا کہ مکہ کی موتمر اسلامی (۱۹۲۷) میں شرکت کے لئے پارلیمنٹ کے ایک ممبر ادیب ثروت کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ ادیب ثروت واحد نمائندہ تھے جو اس موتمر میں ہیٹ پہنے ہوئے شریک ہوئے اور دوسرے مسلمان نمائندوں نے انقباض کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

Irfan Orga Margarete,
Ataturk,
Michael Joseph Ltd. London, 1967, p. 265

دوسری طرف لینن نے روس میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد کیا کیا۔ اس نے ۱۹۲۲ میں بیرونی زبانوں سے ترجمہ کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس کا نام کمینولٹ (Cominolit) تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ بیرونی زبانوں کی سائنسی اور ٹیکنکل کتابوں کو جمع کرے اور ان کو روسی زبان میں منتقل کرے۔ لینن اس کام کو اتنا اہم سمجھتا تھا کہ بے شمار دیگر مشغولیتوں کے باوجود وہ اس کی ذاتی نگرانی کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویت یونین میں سائنسی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ یہ کام مسلسل جاری رہا، یہاں تک کہ آج یہ حال ہے کہ ایک سوویت جرنل جس کا نام Referativyi Zhurnal ہے وہ اپنی ہر اشاعت میں ۱۱۷ ملکوں کی ۷۰ زبانوں سے ایک ملین سائنسی اور ٹیکنکل مضامین کا خلاصہ پیش کرتا ہے ۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے اس جرنل میں ایک لاکھ ماہر مترجمین مقرر ہیں ۔ آل یونین انسٹی ٹیوٹ فار سائنٹفک اینڈ ٹکنکل انفارمیشن تنہا ۲۵۰۰ مترجموں کا مستقل اسٹاف رکھتی ہے ۔ اس کے علاوہ ۲۲ ہزار ترجمہ کے ماہرین اور ہیں جو اس میں جز وقتی کام کرتے ہیں ۔ آج مملکت روس میں پانچ ہزار سے زیادہ سائنسی ادارے ہیں جن میں تقریباً دس لاکھ سائنسی کارکن کام کر رہے ہیں ۔ روس کا تعلیمی نظام ایسا رکھا گیا ہے کہ آج وہاں بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بیک وقت دو زبانوں میں لکھنے اور ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ اس طرح کے مسلسل عمل ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ روس انسانی تاریخ کا پہلا ملک بنا جس نے ۱۹۵۷ میں پہلا اسپٹنک خلا میں اڑایا ۔ آج روسی سائنس کی اتنی اہمیت ہے کہ روس کے ۲۵۰ سائنسی جرنل امریکہ میں منگائے جاتے ہیں اور وہاں از اول تا آخر لفظ بہ لفظ ان کا انگریزی ترجمہ کرکے انھیں شائع کیا جاتا ہے ۔

ملت کی تعمیر و استحکام کا کام کن خطوط پر ہوگا۔ قرآن میں اس کے تین خاص اصول ملتے ہیں :

قیام کا حصول

اتحاد

قوت مُرہبہ

۱۔ قرآن میں مال کو قیام کہا گیا ہے (اَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا ، نساء ۔ ۴) قیام کے معنی سہارا (Support) کے آتے ہیں ۔ قام علیٰ عیالہ یا ھو قیام اھلہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کہ یہ بتانا ہو کہ فلاں شخص

اپنے اہل وعیال کے لئے سہارا ہے۔ مال یا اقتصادیات کو اللہ تعالےٰ نے اس دنیا میں انسان کے لئے معاشی سہارا بنایا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کے وہ تقاضے پورے کرتا ہے جو جسم کی نسبت سے وجود میں آتے ہیں۔ اسی سے وہ ان وسائل کا مالک بنتا ہے جو موجودہ مادی دنیا میں کسی جدوجہد کو کامیابی تک پہنچانے کے لئے ضروری ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار دعا فرما رہے تھے، اس دوران آپ کی زبان سے جو الفاظ نکلے، ان میں یہ کلمہ بھی تھا: اَللّٰھُمَّ اِنّیٓ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الفقر (خدایا میں افلاس سے پناہ مانگتا ہوں) حضرت عائشہ نے متعجب ہوکر سوال کیا تو آپ نے فرمایا، ہاں اے عائشہ۔ کیوں کہ افلاس آدمی کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ (کاد الفقر ان یکون کفرا)

پانچ سو سال پہلے مسلمان دنیا کی اقتصادیات پر چھائے ہوئے تھے۔ مگر آج وہ اقتصادی قیام سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دورجدید کی اقتصادیات کو نہیں سمجھا، اس لئے وہ اس کے اندر اپنی جگہ بنانے میں بھی ناکام رہے۔ قدیم زمانہ میں معاشیات کا انحصار زمینی پیداوار (زراعت اور باغبانی) پر تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں معاشیات کے معنی یکسر بدل گئے ہیں۔ آج معاشیات کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ صنعت وتجارت ہے۔ حتیٰ کہ خود زراعت بھی موجودہ زمانہ میں ایک صنعت ہوکر رہ گئی ہے۔ آج تمام چیزوں میں جدید ٹکنالوجی اتنا دخیل ہو گئی ہے کہ دولت کا بہاؤ بالکل فطری طور پر اسی گروہ کی طرف ہوجاتا ہے جو جدید ٹکنالوجی کا مالک ہو۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل ملی مسئلہ یہ ہے کہ وہ روایتی زراعت اور روایتی تجارت کے دور سے آگے نہ بڑھ سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ساری دنیا میں مسلمان معاشی اعتبار سے دوسرے درجہ کی قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ ممالک ہیں جو بعض قدرتی خزانوں کی بنا پر بغیر کسی ذاتی محنت کے مال دار ہو گئے ہیں۔ مثلاً خلیج فارس کے ممالک تیل کی وجہ سے۔

مسلمانوں کو اگر دورجدید میں زندہ رہنا ہے تو ناگزیر طور پر انھیں جدید اقتصادی تبدیلیوں کو سمجھ کر آج کی اقتصادیات میں اپنی جگہ بنانی پڑے گی۔ ورنہ وہ دوسری قوموں کے استحصال کا شکار ہوتے رہیں گے اور بالآخر آج کی دنیا میں اقتصادی اچھوت بن کر رہ جائیں گے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی جو بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں، وہ تقریباً بلا استثناء اس غلطی کا شکار ہوگئیں کہ ہر ایک نے سیاسی انقلاب کو سب سے زیادہ اپنی توجہ کا مستحق سمجھا۔ حالاں کہ موجودہ زمانہ میں اقتصادیات نے جو وسعت اختیار کی ہے، اس کے بعد سیاست دوسرے درجہ پر چلی گئی ہے۔ آج سیاست بھی اسی کی ہے جس کے ہاتھ میں اقتصادیات ہو۔ جس کے ہاتھ میں اقتصادی قوتیں نہ ہوں، اس کی کوئی سیاست بھی نہیں۔

قریبی زمانہ میں ہم نے سیاست کے اعتبار سے ہمالیائی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں وہ مقام حاصل نہیں جو ان عالی شان شخصیتوں کی نسبت سے ہمیں ملنا چاہئے تھا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہماری یہ شخصیتیں زمانہ کے فرق کو نہ سمجھ سکیں۔ ماضی پر قیاس کرتے ہوئے انھوں نے موجودہ زمانہ میں بھی سارا زور سیاست پر صرف کر ڈالا۔ مسلمانوں کی اقتصادی ترقی اور استحکام کے لئے انھوں نے کوئی حقیقی جدوجہد نہ کی۔

پھر موجودہ زمانہ میں اقتصادیات کا بہت گہرا تعلق جدید علوم سے ہوگیا ہے۔ کھیتی باڑی سے کر مشین چلانے

تک ہر کام میں جدید علم درکار ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں نے حیرت انگیز غفلت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے تعلیم اور اقتصادیات کے جدید رشتہ کو نہیں سمجھا اور نہایت انہماک کے ساتھ پوری ایک صدی تک روایتی علم پر قناعت کرتے رہے۔ اس اندوہناک غفلت کا نتیجہ بالآخر ظاہر ہوا۔ نسل کی نسل ایسی تیار ہوگئی جو "عالم" ہوتے ہوئے اُس زمانہ کے اعتبار سے جاہل تھی جس میں اسے زندگی گزارنا تھا۔

۲۔ دوسری چیز جو ملی تعمیر واستحکام کے اعتبار سے مطلوب ہے، وہ اتحاد ہے:

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ
انفال — ۴۶

آپس میں نہ جھگڑو ورنہ کم ہمت ہو جاؤگے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

معلوم ہوا کہ اختلاف سے بزدلی پیدا ہوتی ہے اور قومی رعب ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ملت کے اندر باہمی اتحاد ہو تو ایک شخص اپنے کو کروروں انسانوں کے برابر سمجھے گا۔ اس سے لوگوں میں حوصلہ اور اعتماد پیدا ہوگا اور دیگر اقوام پر اہل اسلام کی دھاک قائم ہوگی۔

اتحاد کی اہمیت دین میں اتنی زیادہ ہے کہ مسجد کے اندر دینی باتوں کی دو مجلسیں بھی بیک وقت پسندیدہ نہیں:

رائی ابن مسعود حلقتین فی مسجد الکوفة فقام بینهما فقال: ایتکما کانت قبل صاحبتها، قالت احداهما نحن، فقال للاخری: قوموا الیها، فجعلهم واحدة
رواه الطبرانی فی الکبیر

حضرت عبداللہ بن مسعود نے دو حلقے کوفہ کی مسجد میں دیکھے تو ان دونوں کے درمیان کھڑے ہوگئے اور دریافت کیا، دونوں میں سے کون پہلے جمع ہوا ہے۔ ایک نے کہا، ہم لوگ، ابن مسعودؓ نے دوسری جماعت سے کہا اٹھو اور اس سے مل جاؤ، پس دونوں کو ایک کر دیا۔

اتحاد کی اسی اہمیت کی بنا پر صحابہ نے پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد آپ کی تجہیز وتکفین پر خلافت کے انعقاد کو مقدم رکھا تھا

ایک روایت میں آیا ہے:

عن عبادة بن الصامت قال خرج النبی صلی اللہ علیه وسلم لیخبرنا بلیلة القدر فتلاحی رجلان من المسلمین فقال خرجت لاخبرکم بلیلة القدر فتلاحی فلان وفلان فرفعت
مختصر تفسیر ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۶۶۲

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نکلے کہ ہم کو شب قدر کے بارے میں بتا دیں کہ وہ کس روز ہے۔ اس وقت دو مسلمان (ایک قرض کے بارے میں) آپس میں لڑ پڑے۔ آپ نے فرمایا، میں اس لئے نکلا تھا کہ تم کو شب قدر کی خبر دے دوں۔ مگر فلاں اور فلاں آپس میں لڑ پڑے۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا۔

ابن کثیر اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام باہمی جھگڑوں کو کس قدر برا سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی وجہ سے بڑی بڑی برکتیں اٹھالی جاتی ہیں"

امت محمدی "کتاب محفوظ" کی حامل ہے۔ اس لئے کوئی اس کو مٹا نہیں سکتا۔ اسے اس وقت تک اس زمین

پر باقی رہنا ہے جب تک قرآن اس زمین پر باقی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بیرونی طاقت اسے کبھی کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس کو جب بھی نقصان پہنچے گا، اپنی اندرونی غفلت سے پہنچے گا۔ اور اس غفلت میں باہمی اختلاف بلاشبہ سرفہرست ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے خطبہ میں فرمایا تھا:

الا لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض الا ان الشیطان قد یئس ان یعبدہ المصلون ولکنہ فی التحریش بینکم	خبردار میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تمہارا بعض بعض کی گردنیں مارے۔ سن لو شیطان اس بات سے نا امید ہو گیا ہے کہ نماز پڑھنے والے اس کی عبادت کریں، لیکن وہ تمہارے درمیان ایک دوسرے کو برانگیختہ کرے گا۔
مسند احمد عن ابی حرۃ الرقاشی	

تاریخ نے حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق کی ہے۔ تیرھویں صدی میں تاتاریوں کا سیلاب جس نے سارے عالم اسلام کو قتل و غارت گری کا قبرستان بنا ڈالا، کیوں کر پیش آیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ سلطان صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۳ — ۱۱۳۷) نے مسیحی قوموں کو عبرتناک شکست دی تھی۔ اس واقعہ نے اہل اسلام کی فوجی اہلیت کی اتنی دھاک بٹھا دی تھی کہ کوئی سیاسی حوصلہ مند مشکل ہی سے اسلامی سلطنت کی طرف رخ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ مگر صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بیس سال سے بھی کم عرصہ میں تاتاری اسلامی سلطنت پر حملہ کر دیتے ہیں۔

اس کی وجہ مکمل طور پر باہمی اختلاف تھا۔ اس حملہ کے وقت بغداد کی خلافت پر سلطان ناصر لدین اللہ (۱۲۲۵ — ۱۱۵۸) متمکن تھا اور خراسان و ماوراء النہر کے علاقہ میں سلطان علاء الدین محمد بن خوارزم شاہ (۱۲۲۵ — ۱۱۲۰) کی حکومت تھی۔ خوارزم شاہ نے اپنے یہاں خلیفہ کا خطبہ موقوف کر دیا اور یہ منصوبہ بنایا کہ عراق پر حملہ کر کے اس کے ایک حصہ کو اپنی سلطنت میں ملا لے۔ خلیفہ ناصر لدین اللہ کو اس کی خبر ہوئی تو اس کے توڑ کے لئے اس نے یہ کیا کہ تاتاریوں کو خفیہ خط بھیج دیا کہ وہ خوارزم شاہ پر حملہ کر دیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح خوارزم شاہ خود اپنے دفاع میں مصروف ہو جائے گا اور عراق کی طرف رخ نہیں کرے گا۔ اس اختلاف سے فائدہ اٹھا کر تاتاریوں نے خوارزم شاہ پر حملہ کر کے اس کی سلطنت کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد چنگیز خاں (۱۲۲۷ — ۱۱۶۲) کی قیادت میں تاتاریوں کا ٹڈی دل ناصر لدین اللہ کی سلطنت کی طرف بڑھا اور اس کو اس سرے سے اس سرے تک روند ڈالا۔ اگر یہ باہمی اختلاف نہ ہوتا تو غیر متمدن تاتاری کبھی جرأت نہیں کر سکتے تھے کہ وقت کی سب سے بڑی سلطنت پر حملہ آور ہو جائیں۔

اسپین کی مسلم حکومت (۱۴۹۲ — ۷۱۱) کے ختم ہونے کی وجہ بھی باہمی اختلاف تھا۔ اسپینی مسلمانوں نے جس وقت مسیحی قوموں سے شکست کھائی، اس وقت وہ علم اور سائنس میں اپنے حریف سے بدرجہا بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود ان کی شکست کی وجہ یہ تھی کہ عیسائی باہم متحد تھے۔ جب کہ مسلمان باہم ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ عمال نے مرکزِ خلافت سے بغاوت کر کے اپنی چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ حتیٰ کہ ان میں کا ایک شخص اس سے بھی نہ شرماتا تھا

کہ مسلمانوں کے خلاف لڑنے والی عیسائی فوجوں سے جا ملے۔ اسپین میں مسلمانوں کی سیاسی شکست پندرھویں صدی کے آخر میں ہوئی جب کہ غرناطہ کے قلعہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا۔ پھر بھی ملک کو مسلمانوں سے خالی کرانے میں سو برس لگ گئے۔ ایک صدی کے اندر تین بار قتل عام کے باوجود مسلمانوں کا آخری قافلہ اسپین سے ۱۶۰۵ میں نکلا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان وہاں کی اقتصادیات اور فنون پر چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے باوجود مسلمانوں کو ملک بدر کرنا فوری طور پر ممکن نہ تھا۔ تاہم جب وہ اختلاف میں پڑ گئے تو کوئی چیز ان کے کام نہ آسکی۔

محمد بن قاسم ۱۲ ھ میں ملتان کے راستہ سے موجودہ پاکستان میں داخل ہوا تو یہ محمود غزنوی اور بابر کی طرح کشورکشائی کا داخلہ نہ تھا، بلکہ دین رحمت کا داخلہ تھا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں وہ "نوشیرواں سے بھی زیادہ عادل اور رعایا پرور تھا"، چنانچہ صرف چند سال میں بحر عرب کے ساحل سے لے کر کشمیر تک اسلام پھیل گیا۔ مقامی باشندے اس کو اپنے لئے دیوتا سمجھنے لگے اور اس کے واپس جانے کے بعد اس کا ماتم کیا اور اس کا بت بنایا (فبکی اھل الھند علی محمد و صوروہ بالکیرج ، بلاذری) مگر سلیمان بن عبدالملک (م ۹۹ ھ) نے محض ایک ذاتی پرخاش کی بنا پر محمد بن قاسم کو معزول کر کے دمشق واپس بلالیا اور اسے جیل میں بند کر دیا۔ جیل میں اس حال میں اس کا انتقال ہوگیا کہ اس کی زبان پر یہ شعر جاری تھا:

اضاعونی وای فتی اضاعوا　　　　لیوم کریھۃ وسداد ثغر

لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے جوان کو ضائع کیا، وہ جو مصیبت کے دن کام آئے اور سرحدوں کو محفوظ رکھے۔

محمد بن قاسم کے بعد اسلام کی پیش قدمی اس برصغیر میں تین سو برس کے لئے رک گئی اور دوبارہ شروع ہوئی تو وہ بھی سیاسی حوصلہ مندیوں کی پیش قدمی تھی۔ بعد کے آنے والوں میں اسلام کی اشاعت کا وہ جذبہ ختم ہو چکا تھا جو محمد بن قاسم کے دل میں موجزن تھا۔ جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

> "عربوں کی سلطنت جو اتنی وسیع تھی اور جس کو عرب سے باہر پھیلنے میں بہ ظاہر کوئی دشواری پیش نہ آئی، ہندستان میں سندھ سے آگے نہ بڑھ سکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سندھ کی فتح کے صدیوں بعد مسلمانوں نے شمالی ہند پر حملہ کیا ـــــ ممکن ہے اس وقفہ کا ایک سبب عربوں کی اندرونی دشواریاں ہوں۔ کیوں کہ سندھ (محمد بن قاسم کے بعد) بغداد کی مرکزی طاقت سے الگ ہو کر ایک چھوٹی سی آزاد مسلم ریاست (Small independent Moslim state) بن چکا تھا"

Discovery of India, p. 240

بعد کی تاریخ میں مسلمانوں کی تمام ناکامیوں کے پیچھے اسی قسم کے اختلافی واقعات ملتے ہیں۔

قرآن میں ہے کہ اہل ایمان باہم ایک دوسرے کے اولیاء (دوست) ہیں۔ اسی طرح اہل کفر ایک دوسرے کے اولیاء ہیں۔ (انفال ۷۲ ـ ۷۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی طبائع میں فطری اختلاف کے باوجود، اگر کوئی شخص اپنے ارادہ میں سنجیدہ ہے تو وہ اپنے ابنائے جنس کے درمیان اشتراک کے اسباب تلاش کر لیتا ہے۔ کیونکہ اشتراک کے بغیر،

اس دنیا میں، کسی قسم کی کوئی کامیابی ممکن نہیں۔ مقصد کے ساتھ اخلاص اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اختلاف کے پہلو کو نظرانداز کرکے اپنے ہم جنسوں سے مل جائے۔ اہل کفر، خواہ ان کے درمیان کتنا ہی فرق واختلاف ہو، اپنے درمیان کہیں نہ کہیں نقطۂ اشتراک ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اسی طرح اہل ایمان، فطری اختلاف کے باوجود اجتماعی زندگی میں بہرحال وہ مقام پالیتے ہیں جہاں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ متحد ہوسکیں۔ اس کے خلاف صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ دلوں سے خیر بالکل نکل گیا ہو۔ (انفال ــ ۷۰)

۳۔ اس سلسلہ کی تیسری چیز وہ ہے جو مندرجہ ذیل آیت سے اخذ ہوتی ہے:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃٍ وَّمِنْ رباط الخیل ترھبون بہٖ عدو اللہِ وَعَدُوَّکم (انفال ــ ۶۰)	اور مہیا رکھو ان کے لئے جتنا ہوسکے قوت اور گھوڑے کہ اس سے دھاک پڑے گی اللہ کے اور تمھارے دشمنوں پر۔

ہماری دنیا میں اس "قوت مرہبہ" کی اہمیت کیا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔

مصر کے سلطان صلاح الدین (۱۱۹۳ ــ ۱۱۳۷) اور ہندستان کے سلطان ٹیپو (۱۷۹۹ ــ ۱۷۵۱) دونوں جوشِ ایمان اور شجاعت اور جنگی اہلیت کے اعتبار سے یکساں حیثیت کے مالک تھے۔ دونوں کو "مغربی قوت" سے مقابلہ پیش آیا۔ مگر اول الذکر فلسطین کا فاتح بنا جب کہ دوسرے کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ حریف سے شکست کھاکر شہید ہوجائے۔ اس فرق کے پیچھے کوئی طلسماتی راز نہیں، ایک سادہ سی حقیقت ہے: سلطان ٹیپو کو اٹھارویں صدی کا زمانہ ملا جب کہ جنگی صنعت میں مغرب نے اجارہ داری حاصل کرلی تھی۔ اس نے روایتی دستی ہتھیاروں کی جگہ بہتر قسم کے دور مار ہتھیار دریافت کرلئے تھے اور سمندری طاقت پر مکمل طور پر اپنا قبضہ قائم کرلیا تھا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین کو بارھویں صدی عیسوی میں کام کرنے کا موقع ملا جب کہ مسلمان جنگی صنعت میں دنیا کی امامت کررہے تھے۔ اس زمانے میں شام ومصر اور عراق میں کثرت سے ایسی کارگاہیں تھیں جہاں اس وقت کی دنیا کے سب سے بہتر آلات حرب تیار ہوتے تھے۔ عباسی دور میں رومی حملوں کی مدافعت اور صلیبی جنگوں کے دور میں یورپی قوموں کی یورشیں رد کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ خاص طور پر صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس علاقے میں جنگی صنعت کو بڑا فروغ ہوا۔ حتی کہ صلیبی لڑائیوں کے دور میں جب کوئی صلح کا وقفہ ہوتا تو اہل یورپ خاص طور پر ہتھیار خریدنے کے لئے شام ومصر کے بازاروں میں آتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں مسلم علماء کو فتویٰ دینا پڑا کہ مسیحیوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا حرام ہے، کیونکہ ہم سے خریدے ہوئے ہتھیاروں کو وہ دوبارہ ہمارے ہی خلاف استعمال کریں گے۔ (دکتور مصطفی السباعی من روائع حضارتنا)

یہی وہ قوت ہے جس کو قرآن میں قوت مرہبہ (انفال ــ ۶۰) کہا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اس کو اس حد تک حاصل کرو کہ دوسروں کے اوپر تمھارا رعب قائم ہوجائے۔

قوت مرہبہ کے دو درجے ہیں۔ ایک وہ جو تمام مسلمانوں سے متعلق ہے اور ہر مسلم گروہ اپنی بساط کے مطابق

اس کے حصول کی جدوجہد کرسکتا ہے۔ دوسرے وہ جس کا تعلق صرف اس مسلم معاشرہ سے ہے جو بااقتدار ہو۔ موجودہ زمانے میں ان دونوں قوتوں کے معنی کیا ہیں اور ان کو کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے، اس کی وضاحت کے لئے ہم جاپان اور روس کی مثال دیں گے۔

دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹) میں جب جاپان کو شکست ہوئی اور اس کو غیر مسلح کرکے امریکی فوجوں نے جاپان پر قبضہ کر لیا۔ تو جاپان کے لئے عسکری اور سیاسی عزائم کے دروازے بند ہوگئے۔ اس موقع پر شہنشاہ جاپان ہیروہٹو (-۱۹۰۱) نے تقریر کی اور کہا کہ "ہمیں ایک ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے، تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کرسکیں"۔ اب پورا جاپان غیر سیاسی میدانوں میں ترقی کی راہ پر لگ گیا۔ انھوں نے اپنے ماسٹروں کو منسٹروں کی تنخواہ اور مجسٹریٹوں کے اختیارات دے دیئے تاکہ تعلیم کے معیار کو انتہائی حد تک بلند کرسکیں۔ صحافت کو اتنی ترقی دی کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار جاپانی اخبار ہے۔ سائنس اور صنعت میں اتنا زیادہ کمال پیدا کیا کہ لوہا نہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کی سب سے بڑی مشین (سپر ٹینکر) بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مصنوعات کو کوالٹی کے اعتبار سے اتنا بلند کیا کہ اس کو نقص بدرجہ صفر Zero Defects کے مقام تک پہنچا دیا۔ قومی احساس اور نظم و ضبط میں اتنی ترقی کی کہ آج دنیا کی کوئی قوم اس معاملہ میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ ترقیاں اگرچہ بظاہر غیر عسکری اور غیر سیاسی تھیں۔ مگر وہ اتنی طاقت ور ثابت ہوئیں کہ اس کے بعد کسی مقابلہ کے بغیر امریکہ نے جاپان کی سرزمین سے اپنی فوجوں کو واپس بلا لیا۔

تعمیر و ترقی کا یہ میدان، اپنی بساط کے مطابق، ہر مسلمان گروہ کے لئے کھلا ہوا ہے خواہ وہ اقلیت میں ہو یا اکثریت میں۔ بے اقتدار ہو یا بااقتدار۔ اسی ترقی کی بدولت افریقہ کے متعدد ملکوں میں یہ حال ہے کہ ملک کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر عملاً سیاست اور دوسرے اجتماعی شعبوں پر عیسائی قبضہ کئے ہوئے ہیں کیونکہ وہ علم و سائنس، صنعت و حرفت اور نظم و ضبط میں مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر نیجیریا کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۶۵ فی صد ہے اور عیسائیوں کی صرف ۲۰ فی صد۔ مگر ۷۴ ۱۹ میں وہاں کی پندرہ رکنی کابینہ میں ۵ مسلم وزیر تھے اور ۱۰ عیسائی وزیر۔ اس فرق کی وجہ تعلیم میں عیسائیوں کی برتری اور مسلمانوں کی پس ماندگی ہے۔ سرکاری مدارس میں مسلم طلبہ کی تعداد ۲۵ فی صد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اعلیٰ مراحل کی تعلیم میں یہ تناسب اور بھی کم ہو جاتا ہے جب کہ عیسائی طلبہ ملک میں بیس فی صد ہونے کے باوجود تعلیمی اداروں میں بھرے ہوتے ہیں۔

دوسری نوعیت کی ایک مثال روس ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے اپنے حریف سوویت روس کے خلاف یہ اسکیم بنائی کہ وہ اس کے سرحدی ملکوں سے معاہدے کرکے وہاں اپنے فوجی اڈے قائم کرے اور اس کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ ناٹو (Nato) سیٹو (Eato) اور سنٹو (Cento) اسی قسم کے معاہدے تھے جن کے ذریعے امریکہ نے اپنی جنگی مشین کو اٹلانٹک پار کرکے یورپ، شمالی افریقہ اور ایشیا تک پہنچا دیا۔ اس طرح اپنے دور رس فوجی اڈوں کے ذریعے وہ اس پوزیشن میں ہوگیا کہ کمیونسٹ دنیا کو عین اس کی سرحدوں کے پاس نشانہ بنا سکے۔ اس کا

مطلب یہ تھا کہ روس کو تو اپنے دشمن پر وار کرنے کے لئے زمین کے گولے کی ایک چوتھائی مسافت طے کرنی ہوگی۔ جب کہ امریکی اڈے اس کی سرحد کے اتنے قریب ہیں کہ وہ پانچ سے دس منٹ کے اندر سوویت روس کے تمام اہم ترین نشانوں پر پہنچ سکتے ہیں۔

اب روس نے یہ کیا کہ سائنس دانوں کی ایک فوج اس کام پر مامور کر دی کہ وہ ایسا تیز رفتار ہتھیار دریافت کریں جس کے ذریعہ ماسکو کے حکمراں اپنے ملک میں بیٹھے بیٹھے امریکہ کے ٹھکانوں کو نشانہ بنا سکتے ہوں۔ ستمبر ۱۹۵۹ میں روسی راکٹ لیونک نمبر ۲ کا ٹھیک اندازہ کے مطابق چاند پر پہنچنا اس بات کا خاموش اعلان تھا کہ یہ تحقیق کامیاب ہو گئی ہے۔ زمین سے چاند کا فاصلہ روس سے امریکہ کے فاصلہ کے مقابلہ میں پچاس گنا زیادہ ہے۔ اب جو تیز رفتار راکٹ مشینوں کا بکس چاند پر پہنچا سکتا ہے، وہ بم کے گولے بھی دور دراز ملکوں میں گرا سکتا ہے۔ ریڈیائی کنٹرول کی جس اہلیت کا مظاہرہ خلائی پرواز میں ہوا، وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بعید ترین زمینی نشانوں پر نہایت صحت کے ساتھ گرائے جا سکتے ہیں۔ اس دریافت کا سامنے آنا تھا کہ امریکہ کی فوجی حکمت عملی اچانک بے بنیاد عمارت کی طرح زمین پر آگئی۔

روس کو زمینی چیلنج دیا گیا تھا۔ اس نے اس کا آسمانی حل دریافت کر لیا۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں ترقی کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالٰے نے طاقت و قوت کے بے پناہ امکانات رکھ دیئے ہیں اور حوصلہ اور ہمت ہو تو ہر مشکل کا ایسا بالاتر حل دریافت کیا جا سکتا ہے کہ دشمن کی ساری کارروائیاں بطل ما کانوا یعملون (اعراف ـــ ۱۱۸) کا مصداق ہو کر رہ جائیں۔

اگرچہ اس دنیا میں اہل ایمان کا اصل مشن دعوت و تبلیغ ہے۔ مگر یہ واقعہ کہ یہ دنیا ایک مادی دنیا ہے اور یہ واقعہ کہ یہاں ہمیشہ حق کی مخالفت کرنے والے گروہ موجود رہتے ہیں، اہل ایمان کے لئے ضروری کر دیتا ہے کہ وہ مادی اسباب کی فراہمی میں بقدر وسع پوری جدوجہد کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے ۱۳ ویں سال مکہ سے انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ ہجرت کی۔ مگر اس کے دس برس بعد جب آپ نے فتح مکہ کے لئے مارچ کیا تو ایک طرف تبلیغی کام اس حد تک پھیل چکا تھا کہ دس ہزار مردان کار آپ کے ہمرکاب تھے۔ دوسری طرف تیاری کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے دو ہزار آدمی اس طرح زرہ پوش تھے کہ ان کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں (لا یری منهم سوی الحدق، طبرانی)

موجودہ زمانے میں اس سنت پر عمل کرنے کی اہمیت پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ آج کی جنگوں میں عضلاتی طاقت کے بجائے مشین کی اہمیت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ فوجی نسلوں (Martial Races) کا قدیم تصور زمانہ ماضی کا افسانہ بن گیا ہے۔ اسی طرح اقتصادی ذرائع نے موجودہ زمانہ میں اس قدر وسعت اختیار کی ہے کہ پوری انسانی زندگی اس کے تابع ہو گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں دعوت و تبلیغ کا کوئی براہ راست تعلق اقتصادیات سے نہ تھا مگر آج اگر آپ "قلم" کو دعوت و تبلیغ کے لئے استعمال کرنا چاہیں تو عظیم اقتصادی وسائل کے بغیر اس کو مؤثر طور پر استعمال ہی نہیں

کر سکتے۔ پھر جب اس واقعہ کو دیکھا جائے کہ دوسرے مذاہب ہوائی جہازوں اور ریڈیو اسٹیشنوں کے ذریعے اپنے دین کی تبلیغ کر رہے ہیں تو یہ اقتصادی ضرورت سیکڑوں گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شخصی ضرورت کے لئے بھی آج اقتصادی وسائل کی اہمیت پچھلے تمام ادوار سے زیادہ ہے۔ آج انسان کی حقیقی ضروریات اتنی بڑھ چکی ہیں کہ قدیم طرز کی افسانوی سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں۔

مسلمان کی اصل ذمہ داری اگرچہ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ مگر مندرجہ بالا وجوہ تقاضا کرتے ہیں کہ اسی کے ساتھ یہ جدوجہد بھی بھرپور طور پر کی جائے کہ مسلمان جدید اقتصادیات میں اپنا جائز حصہ پاسکیں۔ انفرادی حیثیت سے بھی اور قومی حیثیت سے بھی۔

دعوت الی اللہ

دعوتی کام کی اہمیت

تاریخ کا کوئی بھی حادثہ، چاہے وہ کتنا ہی سنگین ہو، ملت اسلامیہ کے وجود کو مٹا نہیں سکتا۔ کیوں کہ دنیا میں ملت اسلامیہ کا وجود حفاظتِ قرآن کے وعدۂ الٰہی (حجر۔ ۹) کا ایک جزء ہے۔ جس طرح خدا کی آخری کتاب کو قیامت تک باقی رہنا ہے، اسی طرح خدا کی آخری کتاب کے حاملین بھی یقینی طور پر اس وقت تک باقی رہینگے جب تک زمین و آسمان کی بساط لپیٹ نہ دی جائے اور خدا کے انصاف کا ترازو کھڑا نہ ہو جائے۔

مگر مالک کائنات کے اس وعدے کا تعلق دنیا میں امتِ محمدی کے وجود سے ہے۔ آخرت میں اس کی نجات سے نہیں ہے۔ آخرت کی نجات کا انحصار تمام تر صرف آدمی کے اپنے عمل کے اوپر ہے۔ اس معاملہ میں خدا کا قانون اتنا بے لچک ہے کہ پیغمبر کی امت تو درکنار، پیغمبر کی بیوی اور پیغمبر کی اولاد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

"عمل" سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنی ان دو حیثیتوں کے تقاضے پورے کریں جو اس دنیا میں ہمیں حاصل ہیں۔ ہماری ایک حیثیت یہ ہے کہ ہم خدا کے بندے ہیں۔ ہماری دوسری حیثیت یہ ہے کہ ہم آخری رسول کے امتی ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے ہر مسلمان سے فرداً فرداً یہ مطلوب ہے کہ وہ ذاتی طور پر "عبدِ صالح" بن جائے۔ وہ اپنی ذات سے خدا کی بندگی کا ثبوت دے۔ مگر آخری رسول کا امتی ہونا اسی کے ساتھ ہمارے اوپر ایک اور لازمی فریضہ عائد کرتا ہے ——— یہ کہ ہم دنیا والوں کو پیغام رسالت پہنچانے کے لئے رسول خدا کی قائم مقامی کریں:

فرضتُ علیهم الفرائض التی افترضتُ علی الانبیاء والرسل (وہب بن منبہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: امت محمدی پر میں نے وہ فرائض عائد کئے ہیں جو میں نے نبیوں اور رسولوں پر عائد کئے تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالم کی طرف مبعوث ہیں اور آپ کے ماننے والے آپ کی تبعیت میں ان قوموں کی طرف مبعوث ہیں جن کے درمیان وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ آپ کی بعثتِ عامہ تمام اہلِ دنیا کی طرف، آپ کی وفات کے بعد، آپ کی امت ہی کے واسطہ سے ہے۔ حضرت مسعود بن مخرمہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے پاس آئے اور فرمایا:

ان اللہ بعثنی رحمۃ للناس کافۃ فادوا عنی
تہذیب سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۱۴۱

بے شک اللہ نے مجھ کو سارے لوگوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، پس تم میری طرف سے لوگوں تک پہنچا دو۔

رستم نے ربعی بن عامرؓ سے پوچھا کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو۔ انھوں نے جواب دیا:

اللہ ابتعثنا واللہ جاء بنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ ومن ضیق الدنیا الیٰ سعتہا ومن جور الادیان الیٰ عدل الاسلام (تاریخ طبری، جلد ۳، صفحہ ۳۳)	اللہ نے ہمیں مبعوث کیا ہے اور وہ ہم کو لایا ہے تاکہ وہ جسے چاہے اس کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لائیں اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف ۔

اس پیغام رسانی کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے لئے ہر دوسرا مفاد قربان کیا جا سکتا ہے۔ ہجرت کے چھٹے سال (۶۲۸) آپ نے مکہ والوں سے حدیبیہ کا جو معاہدہ کیا، اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ کے لوگوں میں سے جو شخص تجارت کے لئے مصر، شام، عراق جاتے ہوئے مدینہ سے گزرے گا اس کی جان و مال محفوظ رہے گی (بخاری و مسلم) گویا آپ نے اسلام کے دشمنوں کو خود اسلامی حدود کے اندر تجارتی سرگرمیوں کی کھلی اجازت دے دی۔ یہ اور اس طرح کی دوسری دفعات اس لئے تھیں کہ ان کو اقتصادی اور سیاسی رعایت دے کر اپنے لئے دعوتی کام کا میدان ہموار کیا جائے۔

اگر ہم اپنے گرد و پیش بسنے والوں کو آنے والے دن سے آگاہ نہ کریں تو ہمارے لئے بحیثیت امت ٹھیک اسی گرفت کا اندیشہ ہے جو کسی نبی کے لئے اس وقت تھا جب کہ وہ اس قوم کو خدا کا پیغام نہ پہنچائے جس کی طرف وہ بھیجا گیا ہے۔ اپنی قوم کو شرک و کفر میں چھوڑ کر نبی کا "نماز روزہ" بھی خدا کے یہاں قبول نہ تھا۔ پھر ہمارے لئے صرف ذاتی عمل کس طرح کافی ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے گرد و پیش کروروں آدمی اس حال میں پڑے ہوں کہ انہیں یہ بتایا ہی نہ گیا ہو کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے اور انھیں اپنی حقیقی کامیابی کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

پیغمبر دنیا میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہ کرے تو اس کے لئے خدا کی طرف سے دہری گرفت کا خطرہ تھا (اذا لا ذقناك ضعف الحیاۃ وضعف المماۃ، بنی اسرائیل۔ ۷۵) اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر پر بیک وقت دو چیزوں کی ذمہ داری تھی ایک خود مومن و مسلم بننا (یونس۔ ۷۲) دوسرے اہل عالم کو خدا کا پیغام پہنچانا (مائدہ۔ ۶۷) ختم نبوت کے بعد امت محمدی مقام نبوت پر ہے۔ اس لئے اس کے اوپر بھی اللہ کی طرف سے بیک وقت دو ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں۔ ایک باعتبار ایمان، دوسری باعتبار اجتباء (حج۔ آخر) اجتبار کے معنی ہیں چن لینا۔ اللہ تعالیٰ نے امت محمدی کو اس کام کے لئے چن لیا ہے کہ وہ دنیا والوں تک ان کے رب کا پیغام پہنچا دے۔ اب اس کی ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایمانی زندگی کو پورے طور پر اختیار کرے۔ اسی کے ساتھ دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حق کی گواہ بن کر کھڑی ہو۔ دعوت الی اللہ جس طرح نبی کی ذمہ داری ہے اسی طرح نبی کے متبعین کی بھی ذمہ داری ہے (ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی، یوسف ۱۰۸) حدیث میں ارشاد ہوا ہے :

انتم شهداء اللہ فی الارض	تم لوگ دنیا میں خدا کے گواہ ہو

جیسا کہ معلوم ہے، انسان مرنے کے بعد ختم نہیں ہوتا، بلکہ دوسری طویل تر زندگی میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں یا تو دائمی جنت ہے یا دائمی جہنم۔ یہ ایک انتہائی سنگین صورت حال ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی شخص موجودہ زندگی

میں خدا کی مرضی سے بے خبر رہ جائے اور اس حال میں مرجائے کہ وہ خدا کی مرضی پر نہ چلا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد اچانک ایک لامحدود عذاب میں پھنس جائے گا جس سے دوبارہ نکلنے کی کوئی سبیل نہ ہوگی۔ عام اہلِ دنیا کے نقطۂ نظر سے خواہ جس چیز کی بھی اہمیت ہو مگر خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اہم بات یہی ہے جس سے انسان کو باخبر ہونا چاہئے۔

انسان کو اس ہیبت ناک خطرے سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ پیغمبروں کا سلسلہ بھی شروع فرما دیا۔ ہر "قریہ" اور ہر "قوم" میں خدا کی طرف سے آگاہ کرنے والے آئے اور اتنی کثرت سے آئے کہ ان کا تانتا بندھ گیا (مومنون — ۴۴)

چوں کہ رسولوں کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ خدا کے اوپر بندوں کی حجت باقی نہ رہے (نساء — ۱۶۵) اس لئے خدا کے یہاں رسولوں کی سرخروئی کے لئے صرف یہ کافی نہ تھا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں احکام الٰہی کی اطاعت کریں، بلکہ ان کے لئے لازمی طور پر یہ بھی ضروری تھا کہ وہ خدا کے پیغام سے خدا کے بندوں کو آخر حد تک باخبر کر دیں۔ سیدنا یونس علیہ السلام نے نینوا (عراق) کی ایک سو ہزار آبادی تک خدا کا پیغام پہنچایا۔ مگر ان سے صرف اتنی لغزش ہوگئی کہ پیغام پہنچانے کے کام کو آخری حد تک مکمل کرنے سے پہلے قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ بات خدا کی نظر میں اتنی سنگین تھی کہ آپ کو مچھلی نے نگل لیا اور اس سے صرف اس وقت رہائی ملی جب کہ آپ کو احساس ہو گیا کہ مجھے قوم کی طرف دوبارہ واپس جانا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی رسالت کا تحقق اس کے بغیر نہیں ہوتا کہ وہ پیغام پہنچانے کے فرض کو پوری طرح انجام دے (مائدہ — ۶۷)۔ اسی طرح رسول کی امت کا رسول کی امت ہونا بھی اسی وقت متحقق ہوگا جب کہ وہ اس ذمہ داری میں آپ کی قائم مقام بن کر اہل عالم کو وہ خداوندی پیغام پہنچا دے جو آپ خدا کی طرف سے لے کر آئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کی جو ذمے داری ہے، وہی نبی کی امت کی ذمہ داری بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نبیؐ بحیثیت فرد کے ذمہ دار ہوتا ہے اور امت بحیثیت جماعت کے۔ نبی کو ذاتی طور پر دعوت کی ذمہ داریوں کو اٹھانا ہوتا ہے۔ جب کہ امت کے ہر فرد کے لئے یہ ضروری نہیں۔ اگر اس کے اندر سے ایک جماعت اٹھ کر دعوت حق کے فریضہ کو ادا کر دے تو بقیہ لوگوں سے، فرض کی حد تک، یہ ذمہ داری ساقط ہو جائے گی:

وما کان المومنون لینفروا کافۃ، فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم (توبہ — ۱۲۲)	یہ ممکن نہیں کہ مسلمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں، پھر کیوں نہ ہر فرقے سے ایک جماعت نکلی، تاکہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائیں۔

نبی کی تبعیت میں اقوام عالم کے سامنے حق کی گواہی دینے کی یہ ذمہ داری صریح نص سے ثابت ہے:

وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (بقرہ ۱۴۳، حج ۷۸)	اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تمھارے اوپر گواہ ہو۔

قیامت میں جب تمام انسان خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے تو ان کے اوپر وہ لوگ خدائی گواہ کی حیثیت سے کھڑے کئے جائیں گے جنھوں نے دنیا میں ان کو خدا کا پیغام پہنچایا تھا۔ بائبل میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے:

"تمام قومیں فراہم کی جائیں اور سب امتیں جمع ہوں۔ ان کے درمیان کون ہے جو اسے بیان کرے یا ہم کو پچھلی باتیں بتائے۔ وہ اپنے گواہوں کو لائیں تاکہ وہ سچے ثابت ہوں اور لوگ سنیں اور کہیں کہ یہ سچ ہے۔ خداوند فرماتا ہے کہ تم میرے گواہ ہو اور میرے خادم بھی، جسے میں نے برگزیدہ کیا تاکہ تم جانو اور مجھ پر ایمان لاؤ اور سمجھو کہ میں وہی ہوں اور میں ہی یہوواہ ہوں اور میرے سوا کوئی بچانے والا نہیں۔ سو تم میرے گواہ ہو" یسعیاہ ب ۴۳، آیت ۱—۱۲

شہادت کی اس ذمہ داری کی ادائگی میں رسول کے انہماک کا عالم یہ تھا کہ خود اللہ تعالے کو کہنا پڑا:

لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مومنین شعراء-۳ شاید تم اپنے کو ہلاک کرڈالوگے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

اسی طرح اگر مسلمانوں کو یہ احساس ہو کہ ختم رسالت کے بعد ان کو ٹھیک اسی مقام رسالت پر کھڑا کیا گیا ہے جہاں نبی کو اپنی زندگی میں کھڑا ہونا پڑا تھا، تو ان کی راتوں کی نیند اڑ جائے اور دن کا چین ان کے لئے حرام ہو جائے۔ کیوں کہ اس تقرر کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان یا تو اقوام عالم کے سامنے حق کی گواہی دے کر بری الذمہ ہوں یا خدا کے یہاں اس جرم میں پکڑے جائیں کہ انھوں نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ان کا خدا ان کے ساتھ آئندہ زندگی میں کیا کرنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر اس حق کا اعلان نہ کریں جو خلق خدا کی بھلائی کے لئے ان کے پاس بھیجا گیا ہے تو اندیشہ ہے کہ ان پر قرآن کا وہ حکم صادق نہ آجائے جو سابق اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوا ہے:

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللعنون۔ الا الذین تابوا واصلحوا وبینوا فاولئک اتوب علیھم وانا التواب الرحیم بقرہ ۱۵۹—۱۶۰

جو لوگ چھپاتے ہیں اس کو جو ہم نے اتارا صاف حکم اور راہ کے نشان، بعد اس کے کہ ہم اس کو کھول چکے کتاب میں، ان پر لعنت ہے اللہ کی اور دوسروں کی۔ سوا ان لوگوں کے جو اپنی اس روش سے باز آئیں، اپنی اصلاح کریں اور امر حق کو بیان کریں تو میں ان کو معاف کرتا ہوں اور میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔

اگر خدا کی مرضی اس کے سوا کسی چیز کا نام نہیں ہے جو اس نے اپنی کتاب میں ظاہر کی ہے، تو پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان جب تک ذاتی طور پر توبہ اور اصلاح کے ساتھ "تبئین" کا فریضہ انجام نہیں دیتے، یعنی خدا کے دین کو غیر مسلموں تک پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے، ملکی سطح پر اپنے ہم وطنوں تک اور عالمی سطح پر سارے باشندگان ارض تک، وہ کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے، خواہ وہ چلے پر چلے دے رہے ہوں اور خواہ ان کی اشراق اور چاشت کی نمازیں کبھی ناغہ نہ ہوتی ہوں۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ جنت کا راستہ بندگان خدا سے بے

کسی خلا میں روحانی سیر سے گزرتا ہے تو وہ سخت ترین غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے لئے جنت کا دروازہ اس وقت تک کھل نہیں سکتا جب تک ہم نے اپنے گرد وپیش بسنے والے کروروں غیر مسلموں کے لئے جہنم کا دروازہ بند کرنے کی کوشش نہ کی ہو، خواہ اس کوشش میں ہمارے ساتھ وہ کچھ گزر جائے جو ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اوپر گزرے:

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولمّا یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم البأساء والضرّاء وزلزلوا حتیٰ یقول الرسول والذین اٰمنوا معہ متیٰ نصر اللہ الا ان نصر اللہ قریب

بقرہ — ۲۱۴

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی تم پر وہ حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے کے لوگوں پر گزری تھی۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور ان کے ساتھی پکار اٹھے، اللہ کی مدد کب آئے گی۔ یاد رکھو اللہ کی مدد بہت قریب ہے۔

قرآن میں پیغمبر کی زبان سے کہا گیا ہے کہ "مجھ پر یہ کتاب اتاری گئی ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے اہل عرب کو آگاہ کر دوں اور میرے بعد جن قوموں تک یہ کتاب پہنچے (لانذرکم بہ ومن بلغ، انعام — ۱۹) دنیا کی زندگی میں جو لوگ قوموں کو آنے والے دن سے آگاہ کریں گے وہ قیامت کے دن ان کے مقابلہ میں خدا کے گواہ بنا کر کھڑے کئے جائیں گے۔ (یوم یقوم الاشھاد، غافر — ۵۱)

اب سوال یہ ہے کہ آج کون ہے جو دنیا کی قوموں کے سامنے گواہ بن کر کھڑا ہے اور آخرت میں وہ پیغمبر آخر الزماں کی تبعیت میں خدا کی عدالت میں گواہی دے کہ ان قوموں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا تھا کیا سارے عالم اسلام میں کسی بھی گروہ کا نام لیا جا سکتا ہے جو دنیا کی قوموں کو یہ چیناونی دے رہا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو کیا نعوذ باللہ پیغمبر آخر الزماں کی پیغمبری کا دور ختم ہو گیا۔ کیا اب قیامت آنے والی نہیں ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے بعد کی قوموں کے لئے اس سنت کو منسوخ کر دیا ہے کہ وہ ان پر اپنے گواہ کھڑے کرے اور ان کی گواہی کی بنیاد پر قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کرے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مسجدوں کے میناروں سے اذان کی گونج بھی اتمام حجت کے لئے کافی ہے۔ یہ نہ صرف بدترین قسم کی غلط فہمی ہے بلکہ اس قسم کے جوابات پر مطمئن ہونا اپنے بوجھ میں اضافہ کے ہم معنی ہے۔ خدا کا ارشاد تو یہ ہے کہ کسی قوم کے پاس جو آگاہ کرنے والا آتا ہے، وہ اس کی اپنی زبان میں آتا ہے (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم، ابراہیم — ۴) وہ اپنے پیغام کو اتنا کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ لوگ پکار اٹھتے ہیں کہ تم نے پڑھ کر سنا دیا (ولیقولوا درست، انعام — ۱۰۵) اور ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ قوم کی زبان خواہ کچھ ہو، اذان کے چند الفاظ فضا میں بکھیر کر ہم خدا کے سامنے ان کے حق میں بری الذمہ ہو جائیں گے۔

مضمون دعوت

وہ کون سا پیغام ہے جس کو ہمیں لوگوں تک پہنچانا ہے۔ ایک لفظ میں اس کا جواب ہے : توحید — یعنی ایک خدا کو ماننا اور اس کو اس طرح دل میں بٹھانا کہ وہی آدمی کی زندگی کا مرکز و محور بن جائے۔ روایات میں آتا ہے کہ مکہ فتح ہوگیا تو آپ نے لوگوں سے بیعت لینا شروع کیا۔ بڑے اور چھوٹے، مرد اور عورتیں آپ کے پاس آتی تھیں اور آپ ان سے دو چیزوں کی بیعت لیتے تھے : اسلام اور شہادت (فجاءہ الناس الکبار والصغار والرجال والنساء فبایعهم علی الاسلام والشهادة، بیہقی)

واخرج احمد عن عبد اللہ بن عثمان بن خیثم ان محمد بن الاسود بن خلف اخبرہ ان اباہ الاسود رضی اللہ عنہ رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یبایع الناس یوم الفتح۔ قال: جلس عند قرن مستقبلہ فبایع الناس علی الاسلام والشهادة۔ قلت وما الشهادة، قال: اخبرنی محمد بن الاسود بن خلف انہ بایعهم علی الایمان باللہ وشهادة ان لا الہ الا اللہ وان محمدا عبدہ ورسولہ

حضرت اسود بتاتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ فتح مکہ کے دن لوگوں سے بیعت لے رہے تھے۔ آپ قرن پہاڑی کی طرف رخ کرکے بیٹھ گئے اور لوگوں سے اسلام اور شہادت پر بیعت لینے لگے۔ میں نے پوچھا شہادت کا مطلب کیا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ انھوں نے بتایا کہ آپ نے لوگوں سے ایمان باللہ کی بیعت لی اور وہ یہ کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

توحید کا عقیدہ محض ایک فلسفیانہ مسئلہ نہیں، انسان کے امتحان کا پرچہ ہے۔ اس لحاظ سے آخرت بھی دعوت توحید کا لازمی جزء بن جاتی ہے۔ داعی جب لوگوں کو توحید کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ انھیں اس واقعہ سے بھی ہوشیار کرتا ہے کہ خدا آج جس طرح غیب میں ہے، ہمیشہ غیب میں نہیں رہے گا۔ موت کے بعد ہمیں اس کے سامنے حاضر ہوکر اپنے کارنامۂ حیات کا حساب دینا ہے۔ وہ ان کو اس آنے والے مسئلہ سے آگاہ کرتا ہے کہ موت کے بعد آدمی کے لئے یا جنت ہے یا جہنم۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی وہ لوگ بالکل بے جگہ ہو جائیں گے جو خدا کے سوا کسی اور سہارے پر کھڑے ہوئے تھے۔ اور اس دنیا میں صرف انھیں لوگوں کو مقام حاصل ہوگا جنھوں نے خدا کا سہارا پکڑ رکھا تھا۔

پھر ان باتوں کی حیثیت عقلی قیاس آرائی کی نہیں بلکہ وہ وحی کے پختہ علم کے ذریعے انسان کو بتائی گئی ہیں۔ اس لئے داعی کے پیغام میں لازمی طور پر رسالت کا عقیدہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اپنے رب کی معرفت حاصل کرنے کے لئے اور اس بات کے لئے کہ وہ اپنی زندگی کی کامیابی کے یقینی راستہ کو جانیں، انھیں رسالت کو اپنا رہنما بنانا پڑے گا۔ ورنہ وہ اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے اور کبھی صراط مستقیم کو نہ پاسکیں گے۔

دعوت حق کا بنیادی نکتہ بس یہی ہے۔ مگر انسان پتھر کے ٹکڑے کی طرح کوئی جامد اور منفرد چیز نہیں، وہ ایک نفسیاتی اور سماجی وجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کے لئے کسی بات کو ماننے کا مطلب ایسا نہیں ہے جیسے پتھر کے

اوپر کسی خاص رنگ کا برش پھیر دیا۔ انسان کے تمام اعمال اس کی اندرونی فکر کے تحت صادر ہوتے ہیں۔ یہ اندرونی فکر اولاً اس کے شخصی وجود کو ایک خاص نہج پر ڈھالتا ہے۔ پھر جب اس قسم کے بہت سے انسان مل کر وہ مجموعہ بناتے ہیں جس کو سماج کہا جاتا ہے، تو ان کا اندرونی عقیدہ پورے معاشرہ کی سطح پر ایک ڈھانچہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح انسان کے لئے کسی عقیدہ کو قبول کرنا ایسا ہی ایک واقعہ بن جاتا ہے جیسے پانی کے اندر پتھر پھینکنا۔ پتھر گرنے سے پانی میں ابتداءً ایک مقامی دائرہ بنتا ہے، اس کے بعد وہ پھیلنا شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے تالاب کو گھیر لیتا ہے۔ اسی طرح توحید کا عقیدہ ابتداءً قلب انسانی میں جگہ پاتا ہے۔ پھر وہ اس کی نفسیاتی تشکیل میں ہل چل برپا کرتا ہے۔ اس کے بعد انسان کی خارجی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگتا ہے۔ پھر وہ اور آگے بڑھتا ہے اور خاندان، بازار، پارلیمنٹ، بین اقوامی تعلقات غرض پوری معاشرتی زندگی اور سارے انسانی معاملات کو ایک خاص شکل میں متشکل کر دیتا ہے۔ داعی کا پیغام اگرچہ ابتدائی اور اساسی طور پر توحید سے شروع ہوتا ہے مگر وہ انتہائی معنوں میں بالآخر "اقوام متحدہ" کے مسائل تک پہنچ جاتا ہے۔

اسلام کی اس ہمہ گیری کو دیکھ کر بعض لوگ اسلام کو "جامع نظام" کے الفاظ میں تعبیر کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ تعبیر بظاہر صحیح ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک نقص رکھتی ہے۔ اس میں اصل حقیقت اور اس کے تقاضوں یا متعلقات کو ہم پلہ قرار دے کر ایک ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جسم کے اجزاء کو وہی درجہ دے دیا گیا ہے جو کسی شخصیت میں صرف روح کا ہوتا ہے۔ اس کو مثال کے ذریعہ یوں سمجھئے جیسے کسی کتاب میں محبت کی کہانی بیان کی گئی ہو۔ اس کا ایک فقرہ ہو "زید کو بکر سے محبت ہے۔" پھر لکھا ہو "ایک بار جب دونوں اسٹیشن پر ملے تو زید نے بکر کو گلے سے لگا لیا۔" پھر یہ ہو کہ "بکر ایک مرتبہ زید کی بستی میں آیا تو زید نے اس کو اپنے گھر بلا کر اس کی دعوت کی"، ان تینوں کو نمبروار مرتب کر کے ایک شخص کہے: "محبت نام ہے تین چیزوں کے ایک جامع عمل کا ـــ گلے ملنا، دعوت کرنا، دل سے چاہنا"۔ ممکن ہے کسی کو محبت کی اس تعریف میں جامعیت کی جھلک دکھائی دے۔ مگر حقیقۃً اس میں ایک شدید غلطی کی گئی ہے۔ اس میں محبت کی اصل حقیقت اور اس کے متعلقات کو بالکل برابر کی حیثیت دے کر بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ تینوں باتیں جب ایک شخص کے اندر اکٹھا ہو جائیں، اس وقت اس کی محبت کامل محبت قرار پائے گی۔ حالاں کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی مثال میں صرف ایک جزء (دل سے چاہنا) پایا جائے اور بقیہ دو اجزاء موجود نہ ہوں۔ حتیٰ کہ ان کو حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش بھی نہ کی گئی ہو، اس کے باوجود وہ مکمل معنوں میں محبت ہو۔

دعوتِ دین کے سلسلے میں اس کے اجزاء کے باہمی تعلق کی اس نزاکت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ ہم دعوت کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔

براہ راست اسلام کی طرف بلانا عام حالات میں حکمت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے جو لوگ اس میدان میں کچھ کرنا چاہتے ہیں، ان کا ذہن اس سوال پر مختلف سمتوں میں مڑ جاتا ہے کہ دعوت کا طرز خطاب کیا ہو۔ کچھ لوگوں کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ اسلام کو "سماج سدھار" کی ایک اسکیم یا بہتر نظام کے عنوان سے لوگوں کے سامنے لایا جائے۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کو اس حیثیت سے پیش کیا جائے کہ وہ عالم گیر سچائیوں کا علم بردار ہے جو تمام مذاہب میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس کو فلسفیانہ روپ دینے کی کوشش کی اور یہ کہا کہ انسان کے اخلاقی شعور کو بنیاد بنا کر خدائی شریعت کی ضرورت ثابت کی جائے وغیرہ۔ مگر ان سارے طریقوں میں مشترک نقص یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ہم کو شہادت حق کے اصل کام سے بری الذمہ نہیں کرتا۔ کیوں کہ شہادت کے کام کا اصل پہلو یہ ہے کہ لوگوں کو آنے والے دن سے ہوشیار کیا جائے۔

طرزِ خطاب کا یہ سوال، جس کی وجہ سے ذہن مختلف سمتوں میں مڑ جاتے ہیں، صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس سوال کا جواب تاریخ سے لے رہے ہیں، پیغمبر اسلام کی زندگی میں اسے تلاش نہیں کرتے۔ نفسیاتی طور پر ہم اسلام کی بعد کی تاریخ کے وارث ہیں اور بعد کی تاریخ میں جو طرزِ خطاب رائج ہوا، وہ "اے لوگو اسلام لاؤ" تھا۔ اس لئے دعوت کا نام لیتے ہی وہی ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ مگر آپ کی دعوتی زندگی میں اس معاملہ میں ایک مخصوص تدریج ملتی ہے۔ "اسلام" کے نام پر دعوت آپ کے یہاں مدنی دور میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے مکی دور میں آپ کی دعوت کے الفاظ اس قسم کے ہوتے تھے:

ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا، انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید، وغیرہ

آپ کی مکی دور کی تقریریں جو ملتی ہیں، وہ سب اسی زبان میں ہیں۔ "اَسلِم تَسلَم" کی زبان بعد کو مدنی دور میں اختیار کی گئی۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ میں جب آپؐ نے ابوبکر صدیق رضؓ کے سامنے دعوت پیش کی تو آپ کے الفاظ یہ تھے: انی رسول اللہ ادعوک الی اللہ۔ مگر فتح مکہ کے بعد حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ کو آپ نے دعوت پیش کی تو یہ الفاظ فرمائے: یا ابا قحافۃ اَسلِم تَسلَم۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک منظم مذہب میں داخلہ کی دعوت مدنی دور میں شروع ہوئی جب کہ حق کا عمومی تعارف ہو چکا تھا اور اسلام کا غلبہ بالفعل مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے منظم مذہب کے بجائے حقیقتِ مذہب آپ کی دعوت کا بنیادی نکتہ ہوا کرتا تھا۔

طرزِ خطاب کے بارے میں اس بنیادی نکتہ کو سامنے رکھا جائے تو سارے اشکالات ختم ہو جاتے ہیں۔ مدعو کی طرف سے کسی نفسیاتی پیچیدگی کا اندیشہ کئے بغیر اصولی طور پر اس مسئلہ سے انذار کو دعوت حق کا بنیادی نکتہ بنا جا سکتا ہے جس کو قرآن میں یوم الجمع (شوریٰ۔ ۷) اور یوم التلاق (غافر۔ ۱۵) اور یوم الآزفۃ (غافر۔ ۱۸) کہا گیا۔ جب کہ انسان کے کھلے اور چھپے کا حساب ہوگا (بقرہ۔ ۲۸۴) جب شدت ہول سے کلیجے منھ کو آئیں گے (غافر۔ ۱۸) وہ مسئلہ ہے جو قرآن کی مکی سورتوں (بالفاظ دیگر دعوتی دور) میں چھایا ہوا ہے۔

ہم یہاں چند مثالیں نقل کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منظم مذہب میں داخلہ کی دعوت کے بجائے حقیقتِ مذہب کی طرف بلانے کا مطلب کیا ہے:

۱۔ قرآن کی ایک مکی سورہ حسب ذیل ہے:

الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر، کلا سوف تعلمون — بھلائے رکھا تم کو زیادہ کی حرص نے، یہاں تک کہ

ثم کلا سوف تعلمون، کلا لو تعلمون علم الیقین لترون الجحیم ثم لترونہا عین الیقین، ثم لتسئلن یومئذٍ عن النعیم	جا پہنچے قبروں میں۔ ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لوگے، یقیناً تم بہت جلد جان لوگے، ہرگز نہیں، اگر تم جانتے یقین کا جاننا، بے شک تم دیکھ لیتے دوزخ کو، پھر تم دیکھو گے اس کو یقین کی آنکھ سے۔ اس کے بعد ضرور اس دن تم سے پوچھا جائے گا نعمتوں کے بارے میں
تکاثر	

جرمن نومسلم محمد اسد (   ) کو ابتداءً اسلام سے متاثر کرنے کا سبب یہی سورہ ہوئی تھی۔

۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دعوت عام کا حکم ہوا تو آپ عرب کے رواج کے مطابق صفا کے ٹیلے پر چڑھے اور لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی۔ حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق یہ تقریر حسب ذیل تھی:

ارأیتم لو اخبرتکم ان خیلاً بسفح ھذا الجبل ترید ان تغیر علیکم صدقتمونی، قالوا نعم، قال فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید	بتاؤ، اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تمھارے اوپر غارت گری کرنے کے لئے جمع ہے تو کیا تم میری بات مانوگے۔ سب نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا، میں تم کو آنے والے ہولناک عذاب سے ڈراتا ہوں
(البدایہ والنہایہ، ج ۳، صفحہ ۳۸)	

ابوسفیان بن حرب اور ہند بنت عتبہ کے سامنے آپ نے ایک بار ان الفاظ میں اپنی دعوت پیش کی:

واللہ لتموتن ثم لتبعثن ثم لیدخلن المحسن الجنۃ والمسیئ النار وانا اقول لکم بحق وانکم لاول من انذرتم	خدا کی قسم تم کو ضرور مرنا ہے، اس کے بعد تم اٹھائے جاؤگے، پھر جو بھلا ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو برا ہوگا وہ جہنم میں جائے گا۔ یہ جو میں نے کہا بالکل صحیح ہے اور تم دونوں پہلے شخص ہو جن کو میں ڈرا رہا ہوں۔
(ابن عساکر عن معاویہ)	

۳۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار فرمایا:

ویل لدیان من فی الارض من دیان من فی السماء یوم یلقونہ الا من امر بالعدل، وقضی بالحق ولم یقض علیٰ ھوی ولا علیٰ قرابۃ ولا علی رغب ولا علی رھب وجعل کتاب اللہ مرآۃ بین عینیہ	خرابی ہے اس حاکم کے لئے جو زمین میں ہے اُس حاکم سے جو آسمان میں ہے اُس دن جب وہ اس سے ملے گا۔ سوا اس کے جو انصاف کا حکم دے، حق کے ساتھ فیصلہ کرے اور خواہش اور قرابت داری کی بنیاد پر فیصلہ نہ کرے اور نہ خوف اور طمع کی بنیاد پر اور اللہ کی کتاب کو اپنی دونوں آنکھوں کے سامنے آئینہ بنا کر رکھے۔

خوش قسمتی سے موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ نے ایک نئی اہمیت حاصل کرلی ہے آج علم الموت (Thanatalogy) کے نام سے ایک مستقل شعبۂ علم وجود میں آگیا ہے جو موت کے مسئلہ کا سائنسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ زیادہ دن نہیں گزرے، موت کے بارے میں بحث زیادہ تر بعض مخصوص قسم کی مذہبی کتابوں کا موضوع ہوتی تھی۔ اچانک طور پر موت

جدید دنیا کا بہت زیادہ مقبول موضوع بن گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب وہ علمی اختصاص کا ایک موضوع ہے۔ امریکہ کی مینی سوٹا یونیورسٹی کو فخر ہے کہ اس نے موت کے مطالعہ کا ایک مرکز قائم کیا ہے۔ یو۔ سی۔ ایل۔ اے نے اپنے یہاں ایک لیبورٹری قائم کی ہے جس کا مقصد زندگی کو نقصان پہنچانے والے حالات کا مطالعہ کرنا ہے۔ اجتماعی مجالس میں اب موت کا موضوع، جنس اور سیاست جیسے سدابہار موضوعات سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ امریکی ماہنامہ "اٹلانٹک" کے ایک جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ کتابوں کی ایک نئی قسم وجود میں آگئی ہے جس کو "علم موت سے متعلق کتابیں"، کہا جا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں دعوت کا اس سے بہتر انداز اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ موت اور آخرت کے پہلو سے انسان کو متنبہ کیا جائے۔

انذار آخرت کو دعوت کا مرکزی نقطہ قرار دینا اس لئے ہے کہ یہی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ واقعہ کہ مرنے کے بعد آدمی کو اپنے اعمال کا لامتناہی انجام بھگتنا پڑے گا، موت کو اور اس کے بعد آنے والی زندگی کو وہ اہم ترین مسئلہ بنا دیتا ہے جس پر آدمی کو سب سے زیادہ توجہ دینی چاہئے۔

ڈاکٹر بلی گراہم (- ۱۹۱۸) نے لکھا ہے کہ مجھے ایک شخص نے اپنے گھر پر بلایا۔ یہ دنیا کے چند انتہائی دولتمند آدمیوں میں سے ایک تھا۔ دعوت نامہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ مجھے پہلی فرصت میں اس کے یہاں پہنچنا چاہئے۔ شام کے کھانے کے فوراً بعد وہ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا اور کہا:

While I am now in good health, my age tells me that I haven't long to live. I've never thought much about death before — but now I find my mind preoccupied with it, and the idea frightens me. I need help.

اگرچہ میری صحت اس وقت اچھی ہے مگر میری عمر کہتی ہے کہ اب میں زیادہ دن تک زندہ نہیں رہوں گا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی موت کے بارے میں نہیں سوچا۔ مگر آج کل میں پاتا ہوں کہ میرا دماغ موت کے خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تصور مجھے لرزاتا ہے کہ میں جلد ہی مر جاؤں گا، مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۷۲ء)

یہ واحد مسئلہ ہے جو ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو مرنا ہے۔ ہزاروں برس کے تجربہ نے اس میں کوئی استثناء ثابت نہیں کیا۔ پھر یہ موت آدمی کا سب سے زیادہ فوری مسئلہ ہے۔ کیوں کہ موت کے آنے کا کوئی وقت نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی بڑی دنیوی کامیابی حاصل کرے، جب موت کا خیال آتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ نہ تو وہ موت کو ٹال سکتا ہے اور نہ اپنی موجودہ دولت سے وہ اگلی زندگی کی کامیابی کو خرید سکتا ہے —— انسانی فطرت کا یہ گوشہ وہ سب سے قیمتی مقام ہے جہاں سے آپ حق کی دعوت کو کسی کے دل میں اتار سکتے ہیں۔ یہ وہ دروازہ ہے جس پر کوئی پہرے دار نہیں۔ آپ جب بھی کسی دل کے اس دروازے پر دستک دیں، وہ آپ کو کھلا ہوا ملے گا۔ یہ واحد دروازہ ہے جو کبھی کسی کے یہاں بند نہیں ہوتا۔

اسلامی مرکز

آج ساری دنیا کے مسلمانوں کی سب سے بڑی اور پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اقوام عالم کے سامنے حق کے

گواہ بن کر کھڑے ہوں، کوئی بھی دوسرا عمل ان کو اس ذمہ داری سے بری نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کا وہ کام ہے جس کے لئے اس نے اہل ایمان کے جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے۔ (توبہ ـــ ۱۱۱)

اس کام کا آغاز کس طرح کیا جائے۔ اس کا جواب قرآن میں موجود ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ مسلمانوں کا ایسا مرکز ہو جہاں دعوت اور تربیت کا انتظام ہو، جہاں ایک طرف غیر مسلین کو اللہ کا کلام سنایا جائے (توبہ ـــ ۶) اور دوسری طرف وہاں اس کا انتظام ہو کہ مختلف علاقوں کے مسلمان اپنی آبادیوں سے نکل کر آئیں اور وہاں تبلیغ دین کی تربیت حاصل کریں اور پھر اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا کر اپنی قوموں کو آگاہ کریں (توبہ ۱۲۲)

اس قسم کے ایک مرکز کا قیام آج مسلمانوں کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ اس مرکز کو آج کی دنیا کے معیار کے مطابق ہونا چاہئے۔ عیسائی مبلغین نے اپنے دین کی تبلیغ کے لئے آج ایسے مراکز قائم کر رکھے ہیں جن میں سے ایک ایک مرکز میلوں کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کے پاس اپنے ریڈیو اسٹیشن، اپنے ہوائی جہازوں کے دستے اور اپنی یونیورسٹیاں ہیں۔ جب تک ہم اس معیار پر یا اس سے بہتر شکل میں اپنا مرکز قائم نہ کریں، ہم دعوت حق کی ادائگی کے لئے خدا کے یہاں معذور نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ ہمارے پاس ایک وسیع زمین پر ایک ایسا مکمل ادارہ ہونا چاہئے جو نشر و اشاعت کے تمام اعلیٰ ترین ذرائع سے لیس ہو۔ جس کی اپنی یونیورسٹی ہو، اپنی مکمل لائبریری ہو، تحقیق و تصنیف کے اعلیٰ ترین ادارے ہوں، تمام اہم زبانوں کا دارالاشاعت ہو۔ ریڈیو اسٹیشن اور ہوائی جہازوں کا دستہ ہو۔ غرض وہ سب کچھ ہو جو آج خدا کی زمین پر موجود ہے اور جس سے دین کی اشاعت میں کام لیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے مصنف کے لئے بلاشبہ یہ ایک خواب ہے۔ مگر مسلمانوں کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے جو خزانے کھولے ہیں۔ ان کے لحاظ سے اس قسم کے مرکز کا قیام اس قدر آسان ہے کہ موجودہ وسائل کا ادنیٰ استعمال بھی اس کو اعلیٰ ترین قیاسی شکل میں قائم کرنے کے لئے بالکل کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو ناگزیر طور پر یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندوں تک اس کا پیغام پوری طرح پہنچ جائے۔ یہی حکمت تھی جس کے لئے اللہ تعالےٰ نے دورِ تلوار میں مسلمانوں کے ہاتھ میں تلوار کی طاقت دی اور اس کے ذریعہ انھوں نے اس وقت کی تمام معلوم دنیا کو فتح کر ڈالا، اور ہر جگہ اسلام کی آواز پھیلا دی۔ اسی طرح مشین کے دور میں حیرت انگیز طور پر انھیں تیل کی طاقت دے دی گئی ہے۔ عالمی بنک کی رپورٹ نمبر ۷۷، ۴ (۱۹۷۴) میں کہا گیا ہے کہ آج پٹرولیم برآمد کرنے والے ممالک (Opec) کے ہاتھ میں تیل کی عالمی تجارت کا ۸۵ فی صد حصہ ہے اور اس طرح انھوں نے جدید دنیا میں کلیدی اقتصادی طاقت (Economic leverage) کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یہ مواقع انھیں اس کے سوا کسی اور غرض سے نہیں دیئے گئے ہیں کہ ان کو اس اصل کام پر صرف کیا جائے جو تمام مسلمانوں کا واحد مقررہ نصب العین ہے۔

زمین سے تیل نکالنے کا کام، جدید تاریخ میں ۱۸۵۹ میں شروع ہوا۔ جب کہ امریکہ کے ایڈون ایل۔ ڈریک نے پنسلوانیا میں ۷۰ فٹ کی گہرائی سے تیل نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ مشرق اوسط میں تیل کی دریافت پہلی بار ۱۹۰۸ میں مسجد سلیمان میں ہوئی۔ اس وقت عرب دنیا پر ترکوں کی حکومت تھی۔ مغربی کمپنیوں نے عثمانی سلطنت سے اس علاقہ میں تیل

نکالنے کے لئے خصوصی مراعات حاصل کرلیں۔

جدید صنعتی دنیا کی قوت اور ترقی کا راز یہی تیل ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے زراعت کے لئے پانی اور انسانی جسم کے لئے خون ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس قدرتی دولت کا بڑا حصہ اسی زمین کے نیچے دفن ہے جس کو شرق اوسط یا خلیج فارس کے ممالک کہا جاتا ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز سے لے کر اب تک یہ دولت تمام تر مغرب کی صنعتی قوموں خصوصاً امریکہ کے قبضہ میں رہی ہے۔ ان قوموں کی ترقی کا اصل راز وہ سستا ایندھن تھا جو انھیں نہایت آسانی سے مسلسل شرق اوسط سے مل رہا تھا۔ مسلم دنیا کے تیل سے طاقت ور ہوکر وہ مسلم دنیا کو مغلوب کرتے رہے۔ اس مدت میں ہمارے یہاں بے شمار تحریکیں اٹھیں اور بڑے بڑے لیڈر پیدا ہوئے مگر کوئی بھی اس راز سے باخبر نہ ہو سکا اور نہ کسی نے قوم کو اس رُخ پر اٹھانے کی کوئی جدوجہد کی۔ اکتوبر ۱۹۷۳ کی جنگ میں تیل کے حربہ کا استعمال، وہ بھی شعوری طور پر نہیں بلکہ زیادہ تر "گریۂ عاجز" کی نفسیات کے تحت، پہلا تجربہ تھا جب کہ لوگوں کو معلوم ہوا کہ تیل ایک طاقت ہے، اتنی بڑی طاقت کہ اس کا جزوی استعمال بھی پوری صنعتی دنیا کو ہلا سکتا ہے۔ آج شرق اوسط کی زمین سے جو تیل نکالا جا رہا ہے، اس کی قیمت ۱۹۷۴ کے وسط میں، ہر دن ۲۰۰ کروڑ ڈالر ہوتی ہے۔ دولت کے اس سیلاب نے خلیج فارس کے ممالک کو اچانک اس قدر مالا مال کر دیا ہے کہ تعیشات کی ہر قیاسی حد اس کے استعمال کے لئے ناکافی ہے۔ انھیں نہیں معلوم کہ وہ اپنی دولت کو کہاں صرف کریں۔ عالمی بنک کے اندازہ کے مطابق ۱۹۸۵ تک تیل کے ممالک کے پاس، تمام ممکن مدوں میں مسرفانہ حد تک خرچ کرنے کے بعد بھی، ایک ٹریلین ڈالر کے بقدر فاضل رقم موجود ہوگی۔

یہاں ہم صرف یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے دولت کے اس ظہور کی پیشین گوئی اس وقت کر دی تھی جبکہ عرب دنیا میں ریت اڑتی تھی اور ہر طرف خشک پہاڑ کھڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ پیشین گوئی حدیث کی کتابوں میں مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ بخاری و مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

یوشك ان یحسر الفرات عن کنز من ذهب فمن حضره فلا یاخذ منه شیئا (متفق علیہ)	قریب ہے کہ فرات سے سونے کا خزانہ نکلے۔ اس زمانہ میں جو موجود ہو وہ ان میں سے کچھ نہ لے۔

اس آبی خزانہ کی بابت آپ کا یہ ارشاد انتہائی اہمیت رکھتا ہے کہ "تم اس میں سے اپنے لئے نہ لینا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیال سونا Liquid gold کی یہ قدرتی دولت جو ظاہر ہوگی، وہ ذاتی عیش کے لئے نہ ہوگی۔ بلکہ یہ خدا داد دولت خدا کے کام کے لئے ہوگی۔ جن ملکوں میں تیل کی دولت برآمد ہوئی ہے وہ ان کے لئے بہت بڑا فتنہ ہے۔ ان کی نجات کی واحد شکل یہ ہے کہ وہ اس دولت کو ضروری اخراجات کے علاوہ اسلامی دعوت اور اسلام کے احیار کی جدوجہد میں لگا دیں اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو یہ خزانہ قیامت میں ان کے لئے اس سے بھی زیادہ سخت وبال ہوگا جس کی دھمکی قرآن کی نویں سورہ میں دی گئی ہے (توبہ ـــ ۳۴) حقیقت یہ ہے کہ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک کے لئے آج انفاق کی سب سے زیادہ ضروری مد یہ ہے کہ وہ اپنے مشترک عطیات سے ایک بڑا فنڈ قائم کریں، اور اس کے ذریعہ سے جدید ترین معیار پر ایک عظیم الشان اسلامی مرکز تعمیر کیا جائے۔ کوئی معمولی ادارہ آج کی دنیا میں شہادت حق کا کام انجام نہیں دے سکتا۔

یہ معیار بندی (Standardization) کا دور ہے اور آج کی دنیا میں کوئی چیز اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے جب کہ وہ اس معیار کے مطابق ہو جو اس قسم کی چیزوں کے بارے میں بن گیا ہے۔

رسولوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کا اظہار ہمیشہ اعجاز الٰہی کی سطح پر ہوا ہے۔ کسی زمانہ میں عام انسانی ذہنوں میں جس چیز کی اہمیت تھی اس کے اعتبار سے پیغمبروں کو معجزے دیئے گئے تاکہ انسان خود اپنے مقرر کردہ معیاروں کی روشنی میں دین خدا کی برتری کا مشاہدہ کر سکے۔ پیغمبر آخر الزماں کو اس قسم کا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ جب مخالفین اسلام کی طرف سے اس سلسلے میں شدید مطالبات کئے گئے تو کہا گیا کہ یہ قرآن جو اتارا گیا ہے، یہی تمھارے لئے معجزہ ہے (عنکبوت ۔ ۵۱)

یہ آنے والے دور کی رعایت تھی۔ پیغمبر آخر الزماں کے بعد انسانی تاریخ میں جو دور آرہا تھا، وہ علم اور سائنس کا دور تھا۔ اس آنے والے دور میں "معجزات" کی نہیں بلکہ عقلی اثبات اور منطقی استدلال کی اہمیت ہونے والی تھی، اس لئے اللہ تعالےٰ نے دور آخر میں اپنی مرضیات کے اظہار کے لئے قلم (علق ۔ ۴) کا ذریعہ اختیار فرمایا اور قرآن کی شکل میں ایک ایسی کتاب نازل کی جس کا جواب دینا جن وانس کے لئے ممکن نہ ہو (اسراء ۔ ۸۸)

موجودہ دور میں جو سب سے بڑی غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ دور حاضر کے فکری معیار کے مطابق قرآن کا اظہار نہ کیا جا سکا۔ موجودہ دور میں ہماری تمام ناکامیوں کی جڑ اسی ایک کوتاہی میں چھپی ہوئی ہے۔ اس لئے مجوزہ اسلامی مرکز کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ تمام اعلیٰ ترین تحقیقی ذرائع کو استعمال کر کے اسلام کی تعلیمات کو وقت کے علمی معیار پر مدلل کرے۔ اس کے تمام شعبوں کا اولین نشانہ اسی اہم ترین کام کو ہونا چاہئے۔

علمی کام کے دو خاص پہلو ہیں جو مندرجہ ذیل آیت سے اخذ ہوتے ہیں:

قل ارءیتم ما تدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرک فی السمٰوات، ائتونی بکتاب من قبل ھذا او اثرۃ من علم ان کنتم صٰدقین احقاف ۔ ۴	کہو، جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا، دکھلاؤ مجھ کو انھوں نے کیا بنایا زمین میں یا ان کا کچھ ساجھا ہے آسمانوں میں، لاؤ میرے پاس کوئی کتاب اس سے پہلے کی یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک کسی بات کو ثابت کرنے کی دو استدلالی بنیادیں ہیں۔ ایک مستند آسمانی کتاب۔ دوسرے، کوئی علم جو وقت کے ارباب عقل کے نزدیک مسلّم ہو۔ یہی دونوں چیزیں ہمیں دعوت حق کی پشت پر بھی فراہم کرنا ہیں۔ ایک طرف قرآنی تعلیمات کو، جیسی کچھ کہ وہ ہیں، کھول کر بیان کرنا ہے اور دوسری طرف مروجہ علمی معیار پر اسلام کو مدلل کرنا ہے، پہلے کام کا عنوان اثبات دین ہے اور دوسرے کا عنوان علم کلام۔ دینی تعلیمات کے مثبت اظہار کے لئے ہمارے یہاں بے شمار تحریری کام ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب زیادہ تر روایتی طرز پر ہوئے ہیں۔ جدید فکری تقاضوں کے مطابق ان کو انجام دینا ابھی باقی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز قرآن ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اسلام کی دعوت کے سلسلے میں سب سے

زیادہ مؤثر چیز خود قرآن ہے۔ کوئی بھی کتاب یا تقریر یا گفتگو اس خدائی کلام کا بدل نہیں بن سکتی۔ مگر قرآن اسی شخص کے لئے مؤثر ہو سکتا ہے جو قرآن کی زبان جانتا ہو۔ اسلام کے اولین داعی اس راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اسی لئے جب وہ عرب کے جغرافیہ سے باہر نکلے تو انھوں نے ساری کوشش اس پر صرف کر دی کہ دوسری قوموں کو عربی زبان سمجھنے والا بنا دیں۔ اس وقت جزیرہ نمائے عرب کے باہر جو قومیں آباد تھیں، ان میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ عراق و شام میں آرامی زبان، مصر میں قبطی زبان، بلاد مغرب (افریقہ) میں بربری زبان۔ عربوں کی کوشش سے صرف ایک صدی کے اندر یہ تمام زبانیں ختم ہو گئیں اور پورا علاقہ عربی بولنے والا علاقہ بن گیا۔ بعد کے زمانہ میں جب مسلم قوموں پر جمود طاری ہوا تو اصل مقصد فوت ہو گیا۔ البتہ اس قسم کے مسائل پر بے روح بحث شروع ہو گئی کہ قرآن کا ترجمہ دوسری زبانوں میں جائز ہے یا ناجائز۔ نماز عربی کے علاوہ دوسری زبان میں پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں — جمعہ کا خطبہ کیا کسی غیر عربی زبان میں دیا جا سکتا ہے۔ وغیرہ

خوش قسمتی سے موجودہ زمانہ میں مختلف وجوہ سے عربی زبان کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ تیل کی سیاست اس درجہ مؤثر ہوئی ہے کہ اقوام متحدہ میں عربی کو پانچویں زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ قدیم تاریخ کو اس کے اصل ماخذ سے سمجھنے کا رجحان اور مذاہب کا از سر نو جائزہ لینے کا ذہن بھی لوگوں کو عربی زبان کی طرف مائل کر رہا ہے عربی جس کو دس کروڑ عوام بولتے ہیں اور جو ۲۱ ملکوں کی سرکاری زبان ہے، تمام ملکوں کی سیاست خارجہ میں اپنی اہمیت منواتی جا رہی ہے۔ عرب دولت نے تمام قوموں کے لئے عربی زبان میں نئی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

ان نئے مواقع کو ہمیں عربی زبان کے فروغ کے لئے بھرپور طور پر استعمال کرنا ہے۔ یہاں جدید طریقے ہماری مزید مدد کے لئے موجود ہیں۔ آج کسی نئی زبان کو سکھانے کے لئے ایسے آسان طریقے وضع ہو گئے ہیں کہ صرف چند ہفتوں میں ایک شخص کو کسی غیر زبان سے ضروری حد تک واقف کرا دیا جاتا ہے۔ ہمیں ان طریقوں کو اختیار کر کے عربی دانی کو فروغ دینا چاہئے اور قدیم دقیانوسی طریقوں کو بالکل ترک کر دینا چاہئے۔

اس سلسلہ کی دوسری ضرورت یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات، سیرت رسول، حالات صحابہ اور اسلامی تاریخ پر مختلف زبانوں میں ایسی کتابیں تیار کی جائیں جو بالکل سادہ قسم کے واقعاتی انداز میں لکھی گئی ہوں۔ اس میں کسی قسم کا تعبیری یا کلامی اضافہ نہ کیا گیا ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نام نہاد ادبی اسلوب اور عقیدت مندانہ زبان سے انتہائی حد تک پرہیز کیا جائے۔ یہ کام صرف وہ لوگ کریں جنھوں نے وقت کے تحقیقی اسلوب میں تربیت حاصل کی ہو اور جدید طرز تحریر پر بخوبی قدرت رکھتے ہوں۔

۲۔ اس کے بعد جو چیز مطلوب ہے۔ وہ اسلام کا علمی اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچھ کتابیں کسی نہ کسی طرح لکھ کر چھاپ دی جائیں۔ اسلام کا علمی اظہار درحقیقت موجودہ زمانہ میں معجزۂ نبوت کا بدل ہے۔ اس لئے وہ اسی وقت کارآمد ہے جب کہ وہ "اعجاز" کی سطح پر کیا گیا ہو۔ اس سے کم تر سطح پر کیا ہوا کام حقیقۃً نہ علمی ہے اور نہ وہ کسی درجہ میں دین کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے ڈرانے والے بھیجے ، سب ان قوموں کی "لسان" میں بھیجے گئے جن کے درمیان وہ آئے تھے (ابراہیم - ۴) لسان قوم سے محدود طور پر صرف زبان مراد نہیں ہے بلکہ اس میں اسلوب بیان بھی شامل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں اور جس قوم میں اسلام کی دعوت پیش کی جا رہی ہو، وہ زبان و بیان کے اعتبار سے اس کی سطح پر ہو۔ وہ اس کے علمی ذوق ، اس کے طرز استدلال، اس کے طریق اظہار اور اس کے معیار فکر کے پوری طرح مطابق ہو۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانہ تجزیاتی استدلال کا زمانہ ہے۔ اب اگر آج کوئی شخص جذباتی تقریر، شاعرانہ استدلال اور تمثیلی پیرایہ بیان میں اپنی بات پیش کرے تو وہ ایک قسم کی خلاف زمانہ حرکت (Anachronism) ہوگی اور قرآن کے بیان کردہ معیار پر پوری نہیں اترے گی۔

دوسرا ضروری اصول اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے اخذ ہوتا ہے جو اس نے "معجزات" کے سلسلہ میں اختیار فرمایا ہے۔ معجزہ کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں باطل جس سہارے پر کھڑا ہو، اس کو اس سہارے سے محروم کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر مصر میں یوم الزینہ کے موقع پر جب جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں ڈالیں اور وہ سانپ کی طرح رینگتی ہوئی دکھائی دیں تو یہ درحقیقت حضرت موسیٰ کے بالمقابل گروہ کے حق میں کبریائی اعلان تھا۔ حضرت موسیٰ کا عصا ان کے "افک" کو نگل گیا۔ یعنی جب وہ اژدہا بن کر رسیوں اور لکڑیوں کے اوپر سے گزرا تو وہ صرف رسیاں اور لکڑیاں ہو کر رہ گئیں، ان کی حرکت اور سانپ کی سی شکل ختم ہو گئی۔

فاذا هي تلقف ما يافكون ۔ فوقع الحق وبطل ماكانوا يعملون	پس وہ ان کے افک کو نگلنے لگا۔ اور حق ظاہر ہو گیا۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا، وہ غلط ہو کر رہ گیا۔
اعراف ـــ ۱۱۸	

اسی طرح موجودہ زمانہ میں علم اور تحقیق کی بنیاد پر مذہب کے بالمقابل ایک دعویٰ کھڑا کیا گیا ہے۔ اب دین حق کے علم برداروں کا کام یہ ہے کہ وہ جوابی علم اور جوابی تحقیق کے ذریعہ دین حق کو اتنا مدلل کریں اور فریق ثانی کی استدلالی کمزوریوں کو اس طرح مبرہن کریں کہ ان کی علمی دیوار منہدم ہو جائے۔ خدا کے دین کی صداقت ثابت شدہ ہو کر سامنے آجائے۔

اسلامی مرکز کا دوسرا اہم مقصد دور جدید کی ضرورتوں کے لحاظ سے افراد تیار کرنا ہے۔ یہ کام معروف طرز کے تربیتی کیمپوں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے جدید ترین معیار کی ایک یونیورسٹی درکار ہے۔ وقت کا فکر، جس سے اسلام کو مقابلہ درپیش ہے ، وہ اعلیٰ ترین تحقیقات کے زیر سایہ وجود میں آرہا ہے۔ اس لئے اس کا سامنا کرنے والے افراد بھی اعلیٰ ترین تحقیقات ہی کے زیر سایہ پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھیں فرعون کے محل سے لے کر صحرائی زندگی تک مختلف مراحل اور تجربات سے گزارا گیا۔ یہاں تک کہ وہ پختگی کے اس مقررہ درجہ کو پہنچ گئے جب کہ سنت الٰہی کے مطابق انھیں نبوت کی ذمہ داری سونپی جائے اور وہ اس کو بخوبی انجام دیں (ثم جئت على قدر يا موسىٰ ، طہ - ۴۰) یہی طریقہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے سلسلہ میں اختیار فرمایا ہے۔

بعد کے زمانہ کے داعیوں اور مبلغوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اسی اصول کے مطابق اپنے آپ کو تیار کریں۔

انھیں ان قوموں کی زبانیں سیکھنی ہیں جن کے درمیان وہ دعوت کا کام کرنا چاہتے ہیں ۔ زید بن ثابت انصاریؓ چھ زبانیں جانتے تھے : عربی، فارسی، رومی، قبطی، حبشی، سریانی ۔ ان کو مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنا ہے ۔ تاکہ جب وہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی دعوت پیش کریں تو انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں انھیں اسلام کو کس طرح واضح کرنا ہے ۔ وہ ان علوم سے آشنا ہوں جو مثبت یا منفی طور پر مذہب سے تعلق رکھتے ہیں تاکہ اپنی گفتگو میں مخاطب کے ذہنی پس منظر کی پوری رعایت کر سکیں ۔ یہ ساری چیزیں اپنے آپ کو اس مقام "قدر" تک پہنچانے کے لئے ضروری ہیں جس کے بعد آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے دین کا داعی بن سکے ۔

عیسائی مشنریوں نے تربیتِ مبلغین کے سلسلے میں حیرت انگیز حد تک وسیع انتظامات کر رکھے ہیں ۔ مثال کے طور پر انھیں یہ معلوم کرنے کا خیال ہوا کہ سوویت روس میں عیسائیت کا کیا حال ہے ۔ اس کے لئے انھوں نے امریکہ کے ایک دور دراز علاقہ میں ایک شہر بسایا ۔ یہ شہر مکمل طور پر روسی شہر کے نمونہ پر تھا ۔ یہاں روسی زبان بولی جاتی تھی ۔ کھانا پینا، رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا سب روسی انداز میں ہوتا تھا ۔ اس طرح بہت سے پادریوں کو عملی تربیت کے ذریعہ ایسا بنا دیا گیا کہ وہ اپنی شکل وصورت سے لے کر زبان اور عادات واطوار تک ہر لحاظ سے بالکل روسی نظر آتے تھے ۔ اس کے بعد انھیں ہوائی جہاز اڑانے اور پیراشوٹ سے اترنے کی ماہرانہ تربیت دی گئی ۔ ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد انھیں ہوائی جہاز کے ذریعہ نہایت خاموشی سے روسی علاقہ میں اتار دیا گیا ۔ وہاں وہ ایک مقررہ مدت تک روسی شہری کی طرح رہے ۔ اور "آہنی پردہ" کے اندر عیسائیت کی صورت حال کا مطالعہ کرتے رہے ۔ اس جان جوکھم کام کے لئے انھیں دوسری چیزوں کے ساتھ روسی جغرافیہ کا بھی ماہر بنایا گیا تھا ۔ چنانچہ پروگرام کی تکمیل کے بعد کسی دور دراز علاقہ میں دوبارہ ہوائی جہاز اتارا گیا، جہاں وہ حسب قرارداد موجود تھے اور جہاز میں بیٹھ کر اپنے مرکز میں واپس چلے آئے ۔

پیرو کے وسیع جنگلوں میں ایسے قبائل ہیں جو اب بھی وحشی حالت میں زندگی گزارتے ہیں ۔ وہ کسی متمدن انسان کو دیکھتے ہی اسے مار ڈالتے ہیں ۔ عیسائیوں نے پروگرام بنایا کہ انھیں "یسوع مسیح" کا پیغام پہنچایا جائے ۔ اس کے لئے انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا اور لوگوں کو تربیت دینا شروع کیا ۔ یہ لوگ ہوائی جہازوں کے ذریعہ ان جنگلوں کے اوپر پہنچتے اور پیراشوٹ کے ذریعہ نیچے اتر جاتے ۔ ابتداءً بہت سے مبلغین کو وحشی قبائل کے لوگوں نے مار ڈالا، تاہم وہ کوشش کرتے رہے ۔ انھوں نے ان کی زبان سیکھی جو ابتداءً ان کے لئے بے معنی بک بک جھک جھک کے سوا اور کچھ نہ تھی ۔ انھوں نے ان کی زبان سیکھ کر اس کے قواعد بنائے اور اس میں بائبل کے ترجمے تیار کئے ۔ ہزاروں میل پھیلے ہوئے ان جنگلوں کے اندر انھوں نے ہوائی اڈے، ریڈیو اسٹیشن، اسپتال، کالج، پریس کھول کر ایک نئی دنیا بسا دی اور بالآخر وحشی قبائل کو متمدن انسان بنا ڈالا اور ان کو عیسائیت میں شامل کر لیا ۔

یہ ہے تربیت کا وہ معیار جو موجودہ زمانہ میں دیگر مذاہب کے مبلغین نے قائم کیا ہے ۔ جب تک ہم اس معیار پر یا اس سے بہتر شکل میں کارکنوں کی تربیت کا انتظام نہ کریں موجودہ زمانہ میں اسلام کی تبلیغی جدوجہد کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے کمتر درجہ کی کوششوں سے فی الواقع ہم اللہ کے حضور بری الذمہ ہو سکتے ہیں ۔

مندرجہ بالا تیاریوں کے ساتھ اسلامی مرکز کے تحت عوامی کام کرنا بھی ضروری ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کے کچھ پہلو حسب ذیل ہیں:

۱۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ عامۃ المسلمین کے اندر یہ احساس زندہ کیا جائے کہ وہ عام انسانوں کی طرح ایک انسان نہیں ہیں بلکہ امت محمدی کے ایک فرد ہیں۔ یہ نسبت انھیں بیک وقت دو چیزوں کا ذمہ دار قرار دیتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں ایمان و اسلام کے طریقے اختیار کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ اس احساس کے تحت زندگی گذاریں کہ وہ دنیا میں حق کے گواہ ہیں:

یاایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ	اے ایمان لانے والو، انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کی گواہی دینے والے بنو۔ نساء - ۱۳۵

ایک شخص اسلام قبول کرتے ہی اس بات کا ذمہ دار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں "قسط" کے اس راستہ پر چلے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے مقرر کیا ہے۔ مگر جب اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے پڑے جس نے اسلام کو اختیار نہیں کیا ہے تو اس ذمہ داری کے ساتھ ایک اور نزاکت شامل ہو جاتی ہے۔ اب وہ مسلم ہونے کے ساتھ شاہد بھی بن جاتا ہے۔ اس کی یہ مزید ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ وہ اس احساس کے تحت معاملہ کرے کہ وہ دنیا میں خدا کا نمائندہ ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ اس کی زبان وعمل سے لوگ یہ آگہی حاصل کریں کہ خدا کی مرضی کیا ہے اور وہ روش کون سی ہے جس پر چل کر انسان اپنے رب کے یہاں سرخرو ہوتا ہے۔ سڑک کے کنارے لگا ہوا رہنما کھمبا SIGN POST نہایت صحت کے ساتھ ان سمتوں کی طرف رہنمائی کر رہا ہوتا ہے جس کے لئے وہ نصب کیا گیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو سڑک کے محکمہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ اسی طرح مسلمان دنیا میں حق کی نمائندگی کے مقام پر کھڑے کئے گئے ہیں۔ عام حالات میں ایک مسلمان کی کوتاہی قابل معافی بھی ہو سکتی ہے، مگر جب وہ ایک غیر مسلم کے بالمقابل ہو تو اس کے لئے لازم یہ ہے کہ شدت احتیاط کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاملہ کرے تاکہ غیر مسلم کے اوپر خدا کے دین کی غلط نمائندگی نہ ہو سکے۔ ایک مسلمان کے لئے عام زندگی میں لمم (نجم - ۳۲) کی معافی ہے۔ مگر جب سابقہ غیر مسلمین سے ہو تو حق سے انحراف شہادت زور (فرقان - ۷۲) بن جاتا ہے اور شہادت زور اللہ کی نظر میں بدترین جرم ہے۔

۲۔ عرب میں یہ طریقہ تھا کہ سال میں مختلف مقامات پر قومی میلے لگتے جہاں مختلف قبائل کے لوگ جمع ہوتے اور تجارت اور تفریح کے مختلف پروگرام ہوتے، جیسا کہ آج بھی اس قسم کے میلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں عکاظ، ذوالمجاز، منیٰ، مجنہ وغیرہ میلوں کا ذکر آتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے اپنی تبلیغی مہم کے لئے جو طریقے اختیار فرمائے، ان میں یہ بھی تھا کہ آپ ان میلوں میں جاتے اور لوگوں کو دین حق کی طرف بلاتے۔ آپ کے ایک ساتھی اپنا ابتدائی زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پہلی بار آپ کو ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا۔ آپ سرخ چادر پہنے ہوئے بازار سے گزر رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے:

ایہا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا　　　　اے لوگو، کہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، تم فلاح پاؤ گے

اس طریقہ کو موجودہ زمانہ میں اس طرح اختیار کیا جا سکتا ہے کہ مختلف قسم کے اجتماعات، نمائشوں اور میلوں میں اسٹال لگائے جائیں۔ ان اسٹالوں میں مختلف زبانوں میں اسلامی کتابیں، چارٹ اور مفت تقسیم کے لئے چھوٹے چھوٹے کتابچے ہوں۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ عمدہ انداز میں لوگوں کو پیغامات سنائے جائیں۔ گشتی لائبریریاں قائم کی جائیں۔ ہر وہ جگہ جہاں کسی بہانے لوگ جمع ہوتے ہوں، اس کو جدید انداز سے اُسی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے جس کے لئے آپ نے قدیم عرب کے بازاروں اور میلوں کو استعمال کیا تھا۔

۳۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو بنی حارث کے غیر مسلم قبیلہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ انھیں اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ حضرت خالد اور ان کے ساتھی بنی حارث کے وطن نجران پہنچے، وہ سواریوں پر تھے۔ انھوں نے نجران کے گوشے گوشے میں تبلیغ اسلام کے لئے گشت کیا۔ وہ اونٹوں پر سوار تھے اور بآواز بلند کہتے جاتے تھے:

ایہا الناس، اسلموا تسلموا (البدایۃ النہایہ جلد ۵۔ صفحہ ۹۸)　　اے لوگو، اسلام لاؤ، نجات پاؤ گے

اس قسم کے وفد کو اصطلاح میں سریہ کہتے ہیں۔ ہجرت کے بعد یہ سرایا غیر مسلم آبادیوں میں مسلسل بھیجے گئے۔ یہ لوگ جماعت کی شکل میں وہاں جاتے اور سادہ انداز میں لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچاتے۔ اس طریقہ کو موجودہ حالات کے مطابق بنا کر اسلام کے تعارف کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی غیر مسلم بستی یا محلہ کا انتخاب کیا جائے۔ وہاں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے مطابق جماعت ترتیب دی جائے۔ یہ جماعت ایک امیر کے تحت ہو، اور یہی امیر یا اس کی اجازت سے کوئی شخص بولنے کا فرض انجام دے۔ باقی لوگ خاموش رہ کر اس کے لئے دعا کرتے رہیں۔ یہ قافلہ مقررہ بستی میں پہنچ کر سب سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے اور سب مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کے مشن میں ان کی مدد فرمائے۔ اس کے بعد وہ محلہ یا بستی میں گشت کے لئے نکلیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک خوبصورت چھپا ہوا کارڈ ہو جس میں بتایا گیا ہو کہ آج فلاں جگہ فلاں وقت اجتماع ہے۔ آپ مع پریوار اس میں شرکت فرمائیں۔ مردوں اور عورتوں دونوں کو آنے کی دعوت دی جائے۔ جو دعوتی کارڈ انھیں دیں، اس کے ایک طرف کسی مختصر سی برمحل آیت کا ترجمہ ہو۔ مثلاً وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (یونس۔ ۲۵) کا ترجمہ:

And God calls to the home of peace

جماعت کا امیر یہ کارڈ صاحب خاندان کو دے، اس سے مختصر گفتگو کرے اور اس کو مقررہ مقام پر میٹنگ میں شریک ہونے کی دعوت دے۔

اس طرح پورے محلہ کا گشت کر کے گھر گھر پیغام پہنچایا جائے۔ اس کے بعد وفد کے تمام لوگ مقررہ مقام پر جمع ہوں، وہاں نماز ادا کریں، ذکر کریں۔ دعا کریں، تلاوت کریں، ایسا ہرگز نہ ہو کہ عام رواج کے مطابق

لوگ بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں ۔ ذکر، عبادت، دعا، تلاوت وغیرہ سے اس مقام پر نورانیت اور تسخیر باطن کی فضا پیدا ہوگی اور خود بولنے والوں کے کلام میں وہ خصوصیت پیدا ہوگی جس کو قولا بلیغا فی انفسهم (نساء ۔ ۶۲) کہا گیا ہے ۔ مقرر اس موقع پر جو تقریر کرے، اس کا پہلے سے ریہرسل کرا لیا جائے ۔

۴ ۔ موجودہ زمانہ میں جس طرح اجتماعات کے لئے ہال اور پارک ہوتے ہیں، قدیم عرب میں اسی طرح صفا کی پہاڑی تھی ۔ یہ حقیقۃً ایک ٹیلہ تھا جس پر کھڑے ہو کر آدمی آواز لگاتا اور جب لوگ جمع ہو جاتے تو ان کے سامنے اپنی بات رکھتا :

اخرج احمد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال لما انزل اللہ وانذر عشیرتك الاقربین ، اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصفا فصعد علیہ ثم نادی "یا صباحاہ"، فاجتمع الناس الیہ بین رجل یجیئ الیہ وبین رجل یبعث رسولہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا بنی عبد المطلب! یا بنی فہر! یا بنی کعب! ارأیتم لو اخبرتکم ان خیلا بسفح ھذا الجبل ترید ان تغیر علیکم صدقتمونی قالوا نعم ۔ قال فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ جب اللہ نے آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ اتاری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی پہاڑی پر چڑھے اور آواز دی: اے لوگو صبح صبح ٹوٹ پڑنے کی خبر لو ۔ یہ آواز سنتے ہی لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے ۔ کچھ لوگ خود آئے، کچھ نے اپنے بدلے کسی کو بھیج دیا ۔ آپ نے فرمایا، اے لوگو بتاؤ اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر تمہیں لوٹنے کے لئے جمع ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے ۔ لوگوں نے کہا ہاں ۔ آپ نے فرمایا میں تم کو آخرت کے ہولناک عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے ۔

اسی طرح موجودہ زمانہ کے مقاماتِ "صفا" کو استعمال کر کے ہمیں خلق خدا کے سامنے حق کا پیغام پہنچانا چاہئے ۔ اس کی ایک شکل یہ ہے کہ ایسے اجتماعات منعقد کئے جائیں جن میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے مذہب کا تعارف کرائیں اور اس کے اصول بیان کریں ۔ آخر میں اسلام کا نمائندہ کھڑا ہو اور نہایت سنجیدہ اور علمی انداز میں بتائے کہ اسلام کیا ہے اور وہ انسان سے کیا تقاضا کرتا ہے ۔ اس طریقہ کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ اس کا خطاب چوں کہ غیر شخصی ہوتا ہے، اس لئے اس میں آدمی اسلام کے براہ راست پیغام کو پیش کر سکتا ہے، جب کہ شخصی گفتگو میں عام طور پر داعی کو براہ راست اسلام کا پیغام دینے میں کسی قدر تکلف محسوس ہوتا ہے ۔ جن ملکوں میں مسلمان اجتماعی وسائل پر قابض ہیں، وہاں اسلامی ریڈیو کی شکل میں اس طریقہ کو اور زیادہ بڑے پیمانہ پر زیر عمل لایا جا سکتا ہے، جیسا کہ عیسائی مشنریاں افریقہ میں "صوت الانجیل" کے نام سے اپنا ریڈیو اسٹیشن قائم کر کے انجام دے رہی ہیں ۔

۵ ۔ اسلامی مرکز میں ایک اسلامی میوزیم بھی قائم کیا جانا چاہئے، جہاں اسلام کے تاریخی آثار جمع کئے جائیں ۔ موجودہ زمانہ کا ذوق یہ ہے کہ ماضی کے واقعات کو خالص تاریخی انداز سے جانچا جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح

اور ان سے پہلے کے انبیاء کا ذکر معاصر تاریخی ریکارڈ میں نہیں ملتا۔ اس لئے ان انبیاء کو افسانوی شخصیتیں قرار دے دیا گیا ہے نہ کہ تاریخی شخصیتیں۔ یہ صرف پیغمبر اسلام کی خصوصیت ہے کہ آپ کی زندگی وقت کے پورے تاریخی ریکارڈ پر ثبت ہو گئی ہے۔ اس میوزیم میں آپ کے معاصر مورخوں کی وہ کتابیں جمع کی جائیں جو آرامی اور دیگر زبانوں میں لکھی گئیں اور جن میں "اسمٰعیلی پیغمبر" کا ذکر صراحۃً موجود ہے۔ اسی طرح آپ کے وہ خطوط محفوظ ہیں جو آپ نے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے نام روانہ کئے۔ ان خطوط کے عکس حاصل کرکے وہاں آویزاں کئے جائیں۔ قرآن کا وہ اولین نسخہ تاشقند کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جو حضرت عثمان کے زیر تلاوت تھا۔ اس کا فوٹو حاصل کرکے رکھا جائے۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھی جس جغرافیہ میں رہے وہ بدستور آج بھی موجود ہے۔ حتیٰ کہ آپ کے بال اور کپڑے اور استعمالی اشیاء آج تک موجود ہیں۔ اس طرح کے بے شمار تاریخی آثار ہیں۔ جو اصلی حالت میں یا ان کے فوٹو حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کا میوزیم اگر معیاری شکل میں قائم ہو جائے تو وہ اسلام کی تاریخی شہادت کا ایک مرکز ہوگا جس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آئیں گے۔ مذہبی تاریخ کے بارے میں یہ دستاویزات ان نوادر سے کہیں زیادہ قیمتی حیثیت کے حامل ہوں گے جو روم میں جمع ہیں اور جن کو دیکھنے کے لئے دنیا بھر کے سیاح آتے رہتے ہیں۔

۶۔ اگر ایک ایسا اسلامی مرکز قائم ہو جائے جہاں مندرجہ بالا شعبے ہوں اور جہاں ذکر و نماز سے لے کر اسلامی لائبریری اور اسلامی میوزیم تک ہر قسم کی اسلامی سرگرمیاں اکٹھا نظر آتی ہوں تو پھر اسی سے وہ اہم فائدہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے:

وان احد من المشرکین استجارك فاجره حتیٰ یسمع کلام اللّٰہ ثم ابلغه مامنه ذلك بانهم قوم لا یعلمون (توبہ ــ ٦)	اور اگر مشرکین میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔ پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ "مامن شرک" کے مقابلہ میں ایک "مامن اسلام" ہو جہاں لوگ آکر اسلام کو چلتا پھرتا دیکھیں اور خدا کے پیغام کو سنیں۔ اسلامی مرکز اپنے تمام شعبوں کے ساتھ اس خدمت کو انجام دے گا۔ حتیٰ کہ اگر وسائل ہوں تو اس کے پاس اپنی سواریاں ہونی چاہئیں جن پر لوگوں کو بٹھا کر مرکز اسلام میں لایا جائے اور یہاں کے پروگرام میں شریک کرنے کے بعد انھیں ان کے "مامن" میں واپس پہنچا دیا جائے۔

۷۔ قرن اول میں عرب کی حالت فطری نے اسلام کے لئے زرخیز زمین فراہم کی تھی، موجودہ زمانہ میں اس کا بدل سائنٹفک معاشرہ ہے۔ امریکہ کا مشہور واٹر گیٹ اسکینڈل (۱۹۷۲) اور اس کے بعد دنیا کے سب سے طاقت ور حکمراں (رچرڈ نکسن) کا صدارت کی کرسی پر رہتے ہوئے سخت ترین محاسبہ اور بالآخر اگست ۱۹۷۴ میں استعفاء، ایک ایسا واقعہ ہے جس کی مثال یا اسلامی معاشرہ میں مل سکتی ہے یا سائنٹفک معاشرہ میں۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنٹفک معاشرہ اسی صلاحیت کا شعوری درجہ ہے جس کو ہم غیر شعوری معنوں میں فطرت کہتے ہیں۔ جن ملکوں میں سائنسی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں یہ معاشرہ بن چکا ہے وہاں دین حق کی دعوت ان کے

مزاج کی مکمل رعایت کرتے ہوئے دی جائے تو یقین ہے کہ اکثر لوگوں کے لئے یہ دین ان کے اپنے دل کی آواز ثابت ہوگا۔

سائنس میں صحت و واقعیت (Precision) کی نہایت درجہ اہمیت ہے۔ اس لئے جو لوگ سائنس کے شعبوں میں کام کرتے ہیں ان کے اندر اس کے اثر سے خود بخود واقعیت فکر (Precised thinking) کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو "علوم کی ملکہ" کہا جاتا تھا۔ مگر موجودہ دور میں اس نے اپنی یہ اہمیت کھو دی ہے۔ کیوں کہ یہ فنی صحت (Technical Perfection) کا دور ہے اور فلسفہ کا انداز بحث فنی صحت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اسی سائنسی طرز فکر کا اثر تھا کہ قدیم زمانہ کا استشراق مغرب میں ختم ہو گیا۔ واقعیت فکر کا یہ مزاج دین حق کی تبلیغ کے لئے انتہائی موزوں ہے۔

تاہم سائنسی معاشرہ جہاں اسلام کے لئے ایک نہایت موافق دعوتی زمین فراہم کرتا ہے، وہیں وہ ہمارے لئے ایک مسئلہ بھی ہے۔ سائنس کا عمل چونکہ خارجی تجربوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ اس لئے عام طور پر صرف فکری اور نظریاتی استدلال انھیں متاثر کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ وہ روحانی درس سننے کے ساتھ کوئی روحانی تجربہ بھی ضرور کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ عملی طور پر سمجھ سکیں کہ روحانیت کیا ہے اور اس کو کس طرح بڑھایا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کا حل تصوف کے اعمال و اشغال ہیں۔ مگر یہ تمام غیر مسنون طریقے ہیں اور بدعت کے ذریعے سنت کو زندہ نہیں کیا جا سکتا۔

زیر نظر کتاب کی ترتیب کے دوران یہ سوال میرے ذہن میں تھا۔ ۱۳ اور ۱۴ جولائی ۷۴ ۱۹ کی درمیانی شب کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا کہ میں کچھ غیر مسلموں کے ساتھ ہوں اور ان کو اسلام کی باتیں بتا رہا ہوں۔ یہ جدید تعلیم یافتہ لوگ تھے اور اپنے سائنٹفک ذہن کی وجہ سے چاہتے تھے کہ اسلام کی صداقت کو تجرباتی طور پر جان سکیں۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ انھیں جواب دیا: "یہ ممکن ہے اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ نماز کا تجربہ کریں جو اسلام کے عملی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے" گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میں خواب سے بیدار ہوا تو اپنا ایک فقرہ مجھے لفظ بلفظ یاد تھا:

Without being a Muslim You can experience Namaz

اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ انھیں وضو کراؤ، میں نماز پڑھاؤں گا اور یہ لوگ میرے ساتھ کھڑے ہو کر اس کو دہرائیں گے۔

اس خواب کے بعد میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ نہ صرف نظری طور پر بلکہ عملاً بھی نماز کے یہ فائدے تاریخ میں بار بار حاصل ہوئے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ ہند جگر خوار کے اسلام سے متاثر ہونے کا ابتدائی سبب نماز ہی تھی۔ افریقی تاریخ کا ایک مبصر لکھتا ہے:

> " وسط افریقہ میں اسلام کی اشاعت بڑی حد تک سیاحوں اور عرب تاجروں کے ذریعہ ہوئی۔ ان کا سب سے بڑا معجزہ جس سے افریقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی،

نماز تھا۔ جہاں یہ لوگ ایک امام کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوئے اور ان کے چہروں سے خدا کا خوف ظاہر ہوا، دیکھنے والے پگھل کر رہ گئے۔ لوگ ایک طرف اپنی ذلیل بت پرستی پر نادم ہوئے، دوسری طرف اسلامی عبادت نے ان کو اپنی طرف کھینچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف نماز نے وسط افریقہ کی اکثر آبادی کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔"

Winwood Reade, *Martyredom of Man*, p. 32

محمد حسنین ہیکل (سابق ایڈیٹر الاہرام) نے لکھا ہے کہ جمال عبدالناصر جب پہلی بار روس گئے تو ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ء کی ملاقات میں اس وقت کے روسی وزیر اعظم نکیتا خرشچوف نے نماز سے بڑی دلچسپی ظاہر کی:

"خرشچوف کو مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا منظر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب خرشچوف کے گھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ناصر ظہر کی نماز کے لئے ماسکو کی مسجد جانے لگے تو خرشچوف نے سوالوں کی بھرمار کر دی۔ ناصر جتنی دیر وضو کرتے رہے خرشچوف بذات خود تولیہ لئے کھڑا رہا۔ اس نے بڑی عقیدت و احترام کا مظاہرہ کیا۔" The Cairo Documents

ایک عرب ملک نے امریکہ کے ساحل پر ایک جزیرہ خرید کر اس کو تفریح گاہ بنایا ہے۔ کاش کسی مسلم ملک کی توجہ اس طرف ہو اور وہ مغربی دنیا میں کوئی بڑا قطعہ زمین حاصل کر کے وہاں جدید ترین معیار کا ایک اسلامی مرکز قائم کرے جس میں دیگر اسلامی شعبوں کے علاوہ ایک بڑی مسجد بھی ہو۔ یہاں اسلام کے تعارف کے لئے جو چیزیں مہیا کی جائیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہو کہ مخصوص اہتمام کے ذریعہ غیر مسلموں کو موقع دیا جائے کہ وہ کسی درد و سوز رکھنے والے مسلمان کے ساتھ تجربہ کے طور پر نماز کی چند رکعتیں ادا کریں۔ قوی امید ہے کہ یہ تجربہ انتہائی مفید ثابت ہوگا اور لوگ جوق در جوق اسلام لائیں گے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ مغرب کو فتح کرنے کا راز، جس کو ہمارے قائدین ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے سیاست کی دنیا میں تلاش کر رہے ہیں، زیادہ بہتر طور پر "نماز" کے اندر چھپا ہوا ہے۔

جدید امکانات

بریڈلے (۱۹۲۴-۱۸۴۶) نے کہا تھا "دنیا کو ایک نئے مذہب (New Religion) کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسا عقیدہ چاہئے جو تمام انسانی مفادات کا تعین کرے اور ضروری تناسب کے ساتھ اس کے جواز کی بنیاد ہو۔ اور اسی کے ساتھ وہ شعور عطا کرے جس سے انسان اس پر اعتماد کے ساتھ قائم ہو سکے۔"

Essays on Truth and Reality, p. 446

انگریز فلسفی نے موجودہ صدی کے ربع اول میں جس نئے مذہب کی ضرورت کا اظہار کیا تھا، اس کے بعد فرانسیسی سائنس داں ڈونوائے (۱۹۴۷-۱۸۸۳) نے جب الحاد سے توبہ کرکے مذہب کی طرف واپسی کا اعلان کیا اور اپنی مشہور کتاب "ہیومن ڈسٹنی" شائع کی تو یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ مذہب کی طرف انسان کی واپسی کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ اب بیسویں صدی کے خاتمہ پر یہ صورت حال اور نمایاں ہو چکی ہے۔ مادی نظریات اور مادہ پرستانہ زندگی کے تجربات کے بعد یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ وضعی قوانین اور دنیوی تدبیروں سے سماجی اصلاح کی کوششوں کی ناکامی نے مذہب کے خلاف جارحانہ ذہن کو نرم ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ آج ساری دنیا میں ایک قسم کا مذہبی ردِعمل شروع ہو گیا ہے۔ امریکہ کے نوجوان جن کے والدین نے ڈارون اور فرائڈ کے نظریات میں اپنا عقیدہ پایا تھا، ان کی نئی نسل یسوعی انقلاب (Jesus Revolution) اور شعور کرشن (Krishna Consciousness) میں اپنی تسکین ڈھونڈھ رہی ہے۔ جاپان کے نوجوان مادی ترقی کی چوٹی پر پہنچ کر روحانی قدروں کا خلا محسوس کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہمارا کلچر تو مرچنٹ کلچر ہے جو ہمیں سوداگرانہ اقدار (Merchant Values) کے سوا اور کچھ نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ روس کی نئی نسل میں بھی مذہب سر اٹھا رہا ہے۔ حالاں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مکمل طور پر ایک الحادی معاشرہ میں تربیت پاکر نکلے ہیں۔ ماسکو میں سودیت روس کے مخالف مذہب محکمہ کے افسروں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ ایک افسر نے مذہب کے خلاف مہم کی سست رفتاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "مذہب کے خلاف ہماری مہم اسٹیم انجن کی رفتار سے چل رہی ہے۔" یہ سن کر دوسرا افسر بولا: "اسٹیم انجن! ابھی تو پہیہ بھی دریافت نہیں ہوا۔"

وہ سارے نظریات جو ۱۹ویں صدی میں مذہب کے بالمقابل کھڑے کئے گئے تھے، بعد کے دریافت شدہ حقائق نے حیرت انگیز طور پر ان کی صحت مشتبہ کر دی ہے۔ نظریۂ ارتقاء جو کسی وقت خالق کا بدل سمجھ لیا گیا تھا، آج بے دلیل ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایسے طریقے دریافت کر لئے گئے ہیں جن سے زمین کی عمر نہایت صحت کے ساتھ معلوم کی جاسکتی ہے۔ ان طریقوں نے زمین کی جو عمر بتائی ہے، وہ اس عمل ارتقار کے لئے ناقابل قیاس حد تک کم ہے جو یہ نظریہ زندگی کے موجودہ نمونوں کے ارتقائی طور پر وجود میں آنے کے لئے فرض

کرتا ہے۔ دو ممتاز مالیکیولر بیالوجسٹوں نے اس سلسلے میں ایک چونکا دینے والا نظریہ پیش کیا ہے۔ نوبل انعام یافتہ فرانسس کریک (Francis Crick) اور لزلی اورگل (Leslie Orgel) نے اپنی ایک مشترکہ تحقیق میں ایسے وجوہ کی نشان دہی کی ہے جن کی بنا پر زندگی کو زمینی مادہ کی ارتقا یافتہ شئے قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان میں سے ایک چیز مولب ڈینم (Molybdenum) کا وہ رول ہے جو حیاتیاتی نظام میں پایا جاتا ہے۔ اکثر انزائم سسٹم (Enzyme System) پنی کارکردگی کے لئے اس دھات کے لازمی طور پر محتاج ہوتے ہیں۔ مولب ڈینم اتنا غیر معمولی طور پر اہم ہونے کے باوجود زمین میں پائی جانے والی کل دھاتوں کا صرف 0.02 فی صد (دس ہزار میں دو) ہے۔ دوسری طرف زیادہ پائی جانے والی بعض دھاتیں مثلاً کرومیم اور نکل، جو کہ اپنی خاصیت میں مولب ڈینم سے بہت مشابہ ہوتی ہیں اور زمینی دھاتوں کا 0.02 فی صد ہیں، حیاتیاتی نظام میں بالکل کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ کریک اور آرگل کہتے ہیں کہ زمین کی جو کیمیائی ترکیب ہے، زمین پر وجود میں آنے والی زندگیوں کی بناوٹ میں ان کا انعکاس (Reflection) ہونا چاہئے تھا۔ اور چوں کہ ایسا مطلق نہیں ہے، اس لئے وہ فرض کرتے ہیں کہ زندگی بالائی خلا میں بسنے والی کسی زیادہ ترقی یافتہ تہذیب کی طرف سے زمین پر بھیجی گئی تھی۔ اس مطالعہ نے سویڈش کیمسٹ ارے نیس (Arrhenius) کے نظریہ (Panspermia) کو ایک نئی سائنسی بنیاد عطا کردی ہے۔

اس قسم کی بے شمار چیزیں موجودہ زمانہ میں وجود میں آئی ہیں جنھوں نے سائنس یا فکر جدید کو مذہب کے انتہائی قریب کر دیا ہے۔ جسم کی تمام سوئیاں نکالی جاچکی ہیں بس اتنی کسر باقی ہے کہ کوئی آگے بڑھ کر آنکھ کی سوئی نکال دے۔

موجودہ زمانہ میں علم کے تمام شعبوں میں ایسی باتیں دریافت ہوئی ہیں جو حیرت انگیز طور پر اسلامی معتقدات کی صداقت ثابت کررہی ہیں اور انھوں نے انسانی ذہن کو ہلاکر رکھ دیا ہے۔ عرب کے قدیم مخالفین توحید کا کلمہ کہنے والوں کو اتنی تکلیف پہنچاتے کہ سیدھا بیٹھنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا۔ انھیں مجبور کر کے ان سے کہلاتے: اللات و العزیٰ الٰہان من دون اللّٰہ ۔ آج خود علم کے ارتقا نے ان باتوں کو بے بنیاد ثابت کردیا ہے۔ جدید سائنس کے لئے کائنات میں کئی خدا ماننا بالکل بے معنی ہے۔ سائنسی کائنات میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر غیر مرعوبانہ ذہن اور وقت کا گہرا علم ہو تو آج دین کا اثبات اتنی بلند سطح سے کیا جاسکتا ہے کہ وقت کے تمام فکری نظام اس کے مقابلے میں بونے نظر آنے لگیں۔

۱۔ موجودہ زمانہ کی علمی دریافتوں میں، اسلامی نقطۂ نظر سے، سب سے اہم چیز جدید طریق استدلال (Methodology) ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ کسی استدلال کے حقیقی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دعویٰ اور وہ چیز جس کے بارے میں دعویٰ کیا جارہا ہے، دونوں کے درمیان ویسا ہی رشتہ موجود ہو جیسے بجلی کے بٹن اور اس سے ملحق بلب کے درمیان ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کسی نظریہ کے ثابت شدہ واقعہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قابل مظاہرہ (Demonstratable) ہو۔ مگر اب یہ تصور ختم ہوچکا ہے۔ اس معاملہ

میں تازہ علمی موقف یہ ہے کہ اگر ایسے حقائق موجود ہوں جن سے سائنس داں ایک نظریہ مستنبط کرنے کی پوزیشن میں ہو تو اس مستنبط نظریہ کو بھی سائنسی طور پر تسلیم شدہ واقعہ سمجھا جائے گا۔ استدلال کے اسی جدید معیار کے تحت ارتقاء کے ثابت شدہ واقعہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ کیوں کہ خواہ اس کا مظاہرہ نہ ہوسکے، تاہم، علمائے حیاتیات کے نزدیک ایسے حقائق دریافت ہوچکے ہیں جن سے ارتقار بطور سائنسی استنباط کے ثابت ہوجاتا ہے۔

یہ معیار استدلال، جہاں جدید سائنسی دریافتوں نے انسان کو پہنچایا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی اہم ہے۔ پچاس سال قبل تک ہمارے لئے ممکن نہ تھا کہ مذہبی معتقدات کو "سائنسی استدلال" کی سطح پر ثابت کرسکیں۔ کیوں کہ اس وقت کی سائنس صرف مشاہداتی حقائق کو تسلیم کرتی تھی۔ استنباطی حقائق کے لئے اس کے علمی خانہ میں کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر اب قرآن کا وہ استدلال جس میں وہ محسوس دنیا کے واقعات سے غیر محسوس دنیا کے حقائق پر دلیل قائم کرتاہے، کم ازکم اصولی طور پر خالص سائنسی استدلال قرار پاتا ہے، جب کہ نصف صدی قبل کوئی اس کو سائنسی استدلال ماننے کے لئے تیار نہ ہوسکتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا میدان ہے اور اس کو استعمال کرکے اسلام کی حمایت میں نہایت طاقت ور علم کلام وجود میں لایا جاسکتا ہے۔

۲۔ ابن رشد (۱۱۹۸ - ۱۱۲۰) کے زمانہ کی جو "عقلیات" تھیں، اس کا ڈھانچہ ارسطو کی قیاسی منطق پر قائم تھا۔ اس قیاسی عقلیات کے ڈھانچہ میں ابن رشد نے کائنات کو دیکھا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مادہ کی قدامت کا انکار کس طرح کرے۔ اس نے مادہ کو قدیم مان لیا اور اس کے اوپر اپنے الٰہیاتی فلسفہ کی بنیاد کھڑی کی۔ حالاں کہ مادہ کو قدیم ماننے کے بعد الٰہیات کے لئے کوئی حقیقی بنیاد ہی باقی نہیں رہتی۔ مادہ کا قدیم ہونا خدا کے خالق اور بدیع ہونے کا کھلا ہوا انکار ہے۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ "محرک اول" کی حیثیت سے خدا کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو حقائق دریافت ہوئے ہیں، مثلاً حرکیات حرارت کا دوسرا قانون (Second Law of Thermodynamics) اس کے بعد مادہ کے قدیم ہونے کا قصہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ہے۔ اس طرح کے بے شمار حقائق ہیں جنھوں نے ہم کو موقع دیا ہے کہ انتہائی قوی بنیادوں پر اسلامی عقائد کو مدلل کرسکیں۔

۳۔ ایک بہت بڑا مسئلہ جس میں ہزاروں برس سے انسانی دماغ الجھا ہوا تھا، مگر وہ حل نہیں ہوتا تھا، یہ ہے کہ حکماء اور فلاسفہ جو کائنات کے معمے کو عقل سے حل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، عقلی پرواز کی آخری حد کو پہنچ کر بھی اس کو حل کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ نے اب تک صرف تشکیک تک پہنچانے کا کام انجام دیا ہے۔ وہ کسی مثبت عقیدہ تک انسان کو نہ پہنچا سکا۔ قرآن نے اس کی توجیہہ یہ کی تھی کہ انسان کو علم قلیل (اسراء - ۸۵) دیا گیا ہے۔ انسان اپنی عقلی تلاش کے ذریعہ صرف ایک حد تک ہی پہنچ سکتا ہے۔ وہ حقیقت کی آخری حدود تک نہیں جاسکتا۔ اس سے آگے جانا چاہے گا تو لازمی طور پر ناکام رہے گا۔ اس لئے حقیقت پسندانہ بات یہ ہے کہ ایک حد کے بعد آدمی کو اس علم پر اعتماد کرنا چاہئے جو بذریعہ الہام انسان کو دیا گیا ہے۔ ماضی میں یہ دونوں نقطۂ نظر صرف قیاسی بحثوں کا موضوع تھے۔ موجودہ زمانہ میں سائنس نے حیرت انگیز طور پر قرآن کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ سائنس نے دریافت

کیا ہے کہ عقلی طریقے سے آدمی صرف جزوی علم تک پہنچ سکتا ہے حتیٰ کہ تاریک غار (Black Holes) کا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ ٹھوس مادہ کا بھی صرف تین فی صد حصہ انسان کے مشاہدہ میں آتا ہے، بقیہ ۹۷ فی صد حصہ انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے، اس جدید علمی دریافت نے ہمیں موقع دے دیا ہے کہ ہم قرآن کے موقف کو جدید ترین علمی انداز میں ثابت کرسکیں اور الہامی حقائق کی معقولیت کو جدید علمی معیار پر مدلل کرسکیں۔

جدید سائنس نے جن باتوں کا اقرار کیا ہے، اس کی تفصیل بتانے کے لئے ایک انسائیکلوپیڈیا درکار ہوگی، مثال کے طور پر ہم چند باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

- عالم فطرت کی کھوج کے دوران سائنس نے کائنات کی جو حکمتیں دریافت کی ہیں، وہ حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کررہی ہیں کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی ذہن ہے جس نے اسے خلق کیا ہے اور اس کو کنٹرول کررہا ہے۔ سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ اس قدر حیرت انگیز طور پر بامعنی اور منظم ہے کہ اس کی کوئی توجیہہ ہو نہیں سکتی اگر اس کے پیچھے ایک خالق اور مالک کو تسلیم نہ کیا جائے۔
- اسلام کا دوسرے مذاہب سے سب سے بڑا جھگڑا شرک اور توحید کے مسئلہ پر تھا۔ لوگوں کے لئے یہ ناقابل فہم ہورہا تھا کہ مختلف النوع مظاہر رکھنے والی اس دنیا کا خدا ایک کس طرح ہوسکتا ہے۔ مگر سائنس کی اس دریافت نے اس معاملہ میں آخری علمی فیصلہ اسلام کے نظریۂ توحید کے حق میں دے دیا کہ کائنات نہ صرف اس اعتبار سے ایک ہے کہ وہ ایک ہی ہمہ گیر قانون کے تحت چل رہی ہے بلکہ اس کا مادہ بھی اپنے آخری تجزیہ میں صرف ایک ہے، یعنی ایٹم یا ناقابل مشاہدہ برقی لہریں۔
- سائنس نے اپنے آخری مرحلہ میں پہنچ کر انتہائی قطعیت کے ساتھ یہ ثابت کردیا ہے کہ ہمارے اپنے ذرائع علم ہم کو عالم واقعات کا صرف جزوی علم دیتے ہیں، وہ اس کا کلی احاطہ نہیں کرسکتے۔ یہ بات صرف موجودہ ذرائع مشاہدہ ہی کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے بلکہ حقائق کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ ہم اپنی محدود فطری صلاحیتوں کے ساتھ کبھی بھی ان کا مشاہدہ نہیں کرسکتے۔ اس سے یہ بات قابل فہم ہوجاتی ہے کہ عالم حقائق کو سمجھنے کے لئے انسان اپنے حسی علوم کے علاوہ کسی اور ذریعہ علم کا محتاج ہے۔
- سائنس نے دریافت کیا ہے کہ حقیقت اپنی آخری شکل میں ناقابل مشاہدہ ہے۔ ہم اس کو صرف اس کے مظاہر سے مستنبط کرسکتے ہیں، اس کو براہ راست دیکھ نہیں سکتے۔ یہ ٹھیک اسی موقف کی تصدیق ہے جس کا اظہار اسلام نے کیا تھا کہ انسان خدا کو یا عالم آخرت کو موجودہ زندگی میں نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ کائنات کے مظاہر میں غور کرے تو یقیناً وہ اس کے اندر اس کی تصدیق پالے گا۔
- سائنس نے ثابت کیا ہے کہ انسانی تعلقات کے بارے میں الٰہی قانون وضعی قانون پر فوقیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام نے مرد کو عورت کے اوپر قوام (نساء ۳۴) بنایا ہے۔ وضعی قوانین نے اس کے برعکس مرد و زن کی مساوات پر زور دیا۔ مگر آج خالص سائنسی طور پر یہ ثابت ہوگیا ہے کہ عورت خلقی طور پر

کم زور ہے اور مرد اس کے مقابلہ میں صنف برتر (Dominant Sex) کی حیثیت رکھتا ہے۔

قدیم فلاسفہ کے یہاں مذہب کے خلاف سب سے بڑی بنیاد قِدَم کا مسئلہ تھا۔ یعنی یہ کہ کائنات ازل سے موجود ہے اور جب ازل سے موجود ہے تو کسی کو خالق ماننے کی کیا ضرورت۔ مگر جدید سائنس نے یہ ثابت کر کے کہ عالم کی عمر محدود ہے، اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ اس کے بعد انسان نے ارتقار کا سہارا لیا۔ مگر یہاں بھی یہ ثابت ہو گیا کہ زمین کی جو محدود عمر ہے اس کے اندر موجودہ انسان کی تخلیق ارتقائی طور پر ممکن نہیں۔

سائنس نے ثابت کیا ہے کہ کائنات میں جو حقائق ہیں، ان میں سے کسی پر بھی براہ راست استدلال قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ بعض ظاہری چیزوں کے مطالعہ سے اس استنباطی قرینہ تک پہنچیں کہ یہاں فلاں حقیقت پائی جا رہی ہے، اس طرح سائنس نے بالواسطہ طریق استدلال کی صحت کو علمی طور پر ثابت کر دیا ہے جس پر مذہب کے استدلال کی بنیاد قائم تھی۔

اسلام نے سیاست میں شورائی خلافت کا نظریہ پیش کیا۔ قدیم زمانہ میں جب کہ نسلی بادشاہت کا تصور ذہنوں پر مسلط تھا، یہ نظریہ ناقابل فہم معلوم ہوتا تھا، مگر جدید جمہوری انقلاب نے آج کے انسان کے لئے اسلام کی شورائی خلافت کو قابل فہم بنا دیا۔

اسلام نے اعلان کیا کہ آدمی کی کمائی میں اس کے کمزور ساتھیوں کا بھی حق ہوتا ہے۔ اس کے لئے زکوٰۃ کا قانون جاری کیا۔ مگر اس قسم کا معاشی نظام قدیم انسان کے لئے ناقابل تصور تھا۔ پیغمبرؐ کی وفات کے بعد ارتداد کا مسئلہ پیدا ہونے کا پس منظر یہی تھا۔ موجودہ زمانہ میں سوشلسٹ انقلاب نے اس کو قابل فہم بنا دیا کہ ایک کی کمائی میں دوسرے کا حق ہونا چاہئے۔ اگرچہ سوشلزم سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس نے "ملکیت" میں حق ثابت کرنا شروع کر دیا جب کہ صحیح بات یہ تھی کہ "آمدنی" میں حق ثابت کیا جاتا۔

ایک بات جس کو ابھی تک پوری طرح سمجھا نہیں گیا ہے، وہ یہ کہ دورِ سائنس حقیقۃً دورِ اسلام تھا جس کو بعض اتفاقی غلطیوں، خصوصاً ایک بگڑے ہوئے مذہب (مسیحیت) سے اس کے ٹکراؤ نے اس کو الحاد تک پہنچا دیا۔ سائنس کیا ہے، فطرت کا مطالعہ۔ فطرت اور دین فطرت (اسلام) دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں پیشین گوئی کر دی گئی تھی کہ دور سائنس اسلام کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہوگا بلکہ وہ تبئین حق کا ذریعہ ہوگا:

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق (فصلت — ۵۳)	ہم ان کو دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں اور انفس میں یہاں تک کہ کھل جائے گا ان پر کہ یہ حق ہے۔

دور سائنس کا آغاز یورپ میں نہیں بلکہ اندلس اور صقلیہ میں نویں اور دسویں اور گیارھویں صدی میں ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت سائنس اور مذہب میں کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ سائنس اس زمانہ میں مذہب کے خادم کی حیثیت سے ترقی کر رہی تھی۔ مگر ترکوں نے پندرھویں صدی میں جب آستانہ اور قسطنطنیہ سے بیزنطینی علماء کو نکالا جس کے بعد

وہ، ہجرت کرکے اٹلی پہنچے اور علوم فطرت میں تحقیق کا کام مسلم دنیا سے یورپ کی طرف منتقل ہوگیا تو سائنس کی تاریخ نے بالکل نیا رخ اختیار کرلیا۔

اب سائنس کا مقابلہ ایک ایسی دنیا سے تھا جہاں مسیحیت کو اقتدار حاصل تھا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیمات وہی تھیں جو حضرت محمدؐ کی تعلیمات تھیں۔ مگر وہ چیز جس کو مسیحیت کہا جاتا ہے وہ درحقیقت ایک بگڑا ہوا مذہب ہے جس میں خدائی تعلیمات کے ساتھ بہت سی انسانی باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ وہ اپنی موجودہ شکل میں مذہب کی صحیح نمائندہ نہیں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سائنس جس کو بغداد اور قرطبہ میں مذہب سے کوئی ٹکراؤ پیش نہیں آیا تھا، اٹلی اور فرانس میں مذہب کی دشمن قرار دے دی گئی۔ مسلم علمائے فلکیات نے یہ قیاس پیش کیا کہ ارسطو کے مفروضہ کے برعکس زیادہ امکان یہ ہے کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہو۔ مگر اس وقت کسی مسلمان نے اس کو مذہب کے خلاف نہیں سمجھا۔ اس کے بعد جب نکولس کوپرنیکس (۱۵۴۳ – ۱۴۷۳) نے یہی بات کہی تو وہ مسیحی عدالت میں مجرم قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ یہ خدا کے بیٹے کی توہین تھی کہ اس کی جنم بھومی کو دوسرے اجرام سماوی کا تابع قرار دیا جائے۔ ابن مسکویہ (۱۰۳۰ –   ) نے یونانی فلاسفہ کے خیال کی تائید کرتے ہوئے حیاتیاتی ارتقا کے نظریہ کی وکالت کی تو مذہب کے کے لئے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ مگر یہی نظریہ جب چارلس ڈارون (۱۸۸۲ – ۱۸۰۹) نے پیش کیا تو یورپ کے مسیحی حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ قرآن اور بائبل دونوں میں ہے کہ خدا نے زمین کو "چھ دنوں" میں پیدا کیا۔ مگر سائنس کی اس دریافت کو کبھی قرآن سے متصادم نہیں سمجھا گیا کہ زمین کی پیدائش مختلف لمبے ادوار کے بعد ہوئی ہے۔ کیونکہ قرآن میں صراحت کردی گئی تھی کہ "چھ دنوں" سے مراد انسانی دن نہیں بلکہ چھ خدائی دن ہیں۔ اس کے برعکس بائبل میں انسانی کلام کے الحاق سے ایسے الفاظ شامل ہوگئے جس کا مطلب یہی صبح و شام والے چھ انسانی دن تھے۔ اس لئے سائنسی دریافت کو ماننے والے مسیحی دنیا میں کافر قرار دے دیئے گئے۔ اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ سائنس اور مذہب کا مفروضہ ٹکراؤ حقیقۃً سائنس اور مسیحیت کا ٹکراؤ تھا۔ اگر سائنس کی ترقی، اس کے ابتدائی ظہور کی طرح مسلم دنیا میں ہوئی ہوتی تو آج تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔

قرآن اور کائنات دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں، قرآن تصریف آیات کا مظہر ہے اور کائنات تدبیر امر کا (یدبر الامر یفصل الآیات، رعد – ۲) سائنس اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی "تدبیر امر" کا مطالعہ ہے۔ مزید یہ کہ اس تدبیر کا تعلق جن قوانین فطرت سے ہے وہ چونکہ ہمیشہ یکساں حالت میں عمل کرتے ہیں اس لئے ان کو جاننے اور استعمال کرنے کے لئے بالکل حسابی قسم کا فکری انضباط انتہائی طور پر ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور خطابت کی فضا میں اگر مبالغہ آرائی پیدا ہوتی ہے تو سائنس کے بطن سے، اس کے بالکل برعکس، درستیٔ فکر وجود میں آتا ہے، اس طرح سائنس دوگونہ وجوہ سے اسلام کی معاون بن جاتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ آدمی کو آلاء رب (اللہ کے کرشموں) کا مطالعہ کراتی ہے جو اس دنیا میں معرفت الٰہی کا واحد براہ راست ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے جو سائنسی طرز فکر پیدا ہوتا ہے، وہ ٹھیک وہی ہے جو قرآن کو مطلوب ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ سائنس کی مذہب سے بغاوت محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ چنانچہ ایک صدی سے بھی کم مدت گزری تھی کہ سائنس کی اندرونی منطق نے زور کیا اور وہ اپنی اصلی حالت کی طرف واپس آنے لگی۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا سب سے پہلا مظاہرہ وہ ہے جو استشراق کی تبدیلی کی صورت میں سامنے آیا۔ صلیبی جنگوں (۱۰۹۹ - ۱۲۷۰) کے بعد یورپ میں وجود میں آنے والا استشراق جس نے تمام مغربی لٹریچر کو مخالف اسلام خیالات سے مسموم کر دیا، درحقیقت مسیحی قوموں کے پرانے طریقے مقدس فریب (Pious Fraud) کا ایک نیا استعمال تھا۔ صلیبی جنگوں میں ناکامی کا بدلہ انھوں نے اہل اسلام سے یہ لیا کہ انھوں نے اپنے اس آزمودہ طریقے کو اپنے حریف مذہب کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چوں کہ اس وقت پورے یورپ میں ان کا اقتدار تھا، وہ اس میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ نہ صرف تاریخی اور مذہبی کتابیں بلکہ لغت اور ادب تک کو مخالف اسلام خیالات سے بھر دیا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے اور ملٹن کا کلام بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ جدید دور میں چوں کہ تمام علمی موضوعات پر مطالعہ کا ذریعہ وہی کتابیں تھیں جو مغرب میں چھپ رہی تھیں، اس لئے اس مغربی استشراق نے نہ صرف یورپ کے ذہن کو بلکہ ساری تعلیم یافتہ دنیا کو متاثر کر کے رکھ دیا۔

انیسویں صدی اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی کہ واللہ غالب علیٰ امرہ (یوسف - ۲۱) کی تفسیر ظاہر ہوئی۔ سائنس کے زور پر معروضی نقطۂ نظر (Objective thinking) کا ایک سیلاب اٹھا جو ساری علمی دنیا پر چھا گیا۔ استشراق پر اس سیلاب کا نمایاں اثر کارلائل (۱۷۹۵ - ۱۸۸۱) کی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد مسلسل طور پر یہ عمل جاری رہا۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس طرح جمہوریت کے سیلاب نے نسلی بادشاہت کو علم سیاست کی رو سے بے معنی بنا دیا، اسی طرح اس ذہن کے لئے بھی کوئی علمی سایہ دنیا میں باقی نہ رہا کہ کسی مذہب کو بدنام کرنے کے لئے اس کی تاریخ اور اس کی تعلیمات کو بالقصد بگاڑ کر پیش کیا جائے۔ قدیم استشراق اپنی موت آپ مر گیا۔

اس تبدیلی کی دوسری مثال وہ جدید ذہنی تحریک ہے جس کو غلط طور پر "اینٹی سائنس" کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ اینٹی مادیت ہے نہ کہ حقیقتاً اینٹی سائنس۔ تاہم مذکورہ بالا مثال کے برعکس، اس تحریک نے ابھی تک کوئی واضح شعوری رخ نہیں اختیار کیا ہے۔ یہ زیادہ تر ردعمل کی ایک تحریک ہے نہ کہ کوئی مثبت تحریک۔ مثلاً صنعتی تہذیب اور آزادیٔ نسواں کے نتائج میں سے ایک نتیجہ خاندانی انتشار تھا۔ میاں بیوی کا تعلق مذہبی تقدس سے خالی ہو کر محض ذاتی تسکین کا ذریعہ بن گیا۔ اس کے نتیجہ میں طلاقوں کی کثرت سے گھر اجڑنے لگے اور بچے ماں باپ کی سرپرستی سے محروم ہو کر مجرمین کی تعداد میں اضافہ کرنے لگے۔ جن گھروں میں طلاق کی نوبت نہیں آئی، وہاں بھی یہ ہوا کہ میاں بیوی دونوں دفتر چلے گئے اور بچہ کو "ڈے کیر سنٹر" میں رکھ دیا۔ اس طرح انسان فطرت کی گود سے محروم ہو کر مشینوں کے حوالے ہو گیا۔ امریکہ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس صورت حال کا ایک بھیانک نتیجہ بچوں کے اندر ایک نئی بڑھتی ہوئی بیماری ہے جس کو ماہرین نے اوٹزم (Autism) کا نام دیا ہے۔ بظاہر تندرست اور جسمانی بیماریوں سے محفوظ بچے عجیب و غریب قسم کی ذہنی خرابیوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جنھوں نے صنعتی تہذیب کی طرف سے لوگوں میں بے اعتمادی پیدا کر دی ہے

اور وہ "فطرت کی طرف واپسی" کا نعرہ لگانے لگے ہیں۔ برطانیہ کے سوشیالوجسٹوں کی ایک ٹیم نے جائزہ لے کر بتایا ہے کہ اباحیت پسند سماج (Permissive Society) برطانیہ میں اپنے خاتمہ کو پہنچ رہا ہے اور وکٹورین عہد کی طرف واپسی شروع ہو گئی ہے جس کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ انیسویں صدی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف جین فرانکوائس ریویل کی ایک کتاب امریکہ سے چھپی ہے جس کا نام ہے:

Without Marx or Jesus (1971)

پونے تین سو صفحے کی اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ دنیا میں ایک نیا انقلاب آرہا ہے۔ مگر یہ انقلاب نہ الحاد پر مبنی ہوگا نہ مذہب پر۔ بلکہ وہ کچھ نئی اقدار حیات پر قائم ہوگا جس کا سب سے بڑا مظاہرہ ایک عالمی حکومت کے قیام کی صورت میں ہوگا اور یہی کسی انقلاب کی واحد ممکن منزل ہے (۸۳)

اس قسم کی بے شمار باتیں جو آج مغربی دنیا میں وقوع میں آرہی ہیں، وہ کسی مثبت فکر کی علامت نہیں ہیں بلکہ صرف اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ مادی تہذیب کے نتائج سے گھبرا کر آدمی کسی صحیح تر تہذیب کی تلاش میں ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تک یہ حال تھا کہ مغربی جرمنی کے لوگ کہتے تھے "ہمارے کارخانوں کی چمنیاں جب تک دھواں اگل رہی ہیں ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں"۔ مگر آج کارخانوں کی فضا آلودگی (Pollution) کا مسئلہ اتنا شدید ہو گیا ہے کہ وہ صرف متوقع ایٹمی جنگ سے دوسرے نمبر پر شمار ہوتا ہے۔ راک فلر یونیورسٹی (نیویارک) کے ڈاکٹر اینی ڈوبوز نے دنیا کو متنبہ کیا ہے کہ صنعتی کثافت انسان سے بہت سی خصوصیتیں چھین رہی ہے۔ حتیٰ کہ خطرہ ہے کہ مستقبل میں وہ کمتر درجہ کا انسان بن کر نہ رہ جائے۔ (لائف ۲۴ جولائی ۱۹۷۰)

مادی تہذیب کے اس قسم کے نتائج نے جدید انسان سے ساری ترقیوں کے باوجود خوشی اور اطمینان چھین لیا ہے۔ مغربی دنیا میں آج کل کثرت سے ایسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں جن میں اس حقیقت کا اعتراف ملتا ہے۔ مثال کے طور پر والٹر کر (Walter Kerr) کی کتاب *The Decline of Pleasure* (1962) — امریکی مصنف نے اپنی اس سو تین سو صفحات کی کتاب میں کہا ہے کہ "امریکی باشندے آج خوش نہیں۔ حالاں کہ امریکہ کی موجودہ نسل کا یہ حال ہے کہ اس کے پاس فرصت کے اوقات ہیں، ساز و سامان ہے، لمبی عمر ہے، وہ سب کچھ ہے جس کا اس کے آباء و اجداد نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا"

ٹائم (۱۸ جنوری ۱۹۷۱) نے اپنے ایک مقالہ A Voyage to Utopia میں کہا ہے:

"۱۸۴۰ میں ہر امریکی کی جیب میں مستقبل کا ایک خوبصورت خاکہ موجود ہوتا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے ہر جیب میں رومال موجود ہوتا ہے۔ مگر آج امریکیوں کی جیبیں اس قسم کی کسی پرشوق چیز سے خالی ہیں۔ لوگ سماجی حالات سے سخت مایوس ہیں۔ اعلیٰ سماج بنانے کے تصورات ختم ہو گئے ہیں۔ زمین پر بہشت بنانے کا خیال اب اپنی ذات کے اندر بہشت ڈھونڈنے کی طرف مائل ہے۔ آج کی بربادی دنیا میں مفکرین کی ایک بڑی تعداد نے آئیڈیلزم کی آخری پناہ گاہ کے طور پر اپنی امیدوں اور اپنے عقیدہ کو روح کے اوپر مرکوز کر دیا ہے۔ مادیات کے بجائے روحانیت کی

طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ بعض لوگوں کا یہاں تک کہنا ہے کہ ارتقائی عمل، تہذیب کو شعور کے ایک اعلیٰ مرحلہ کی طرف لے جارہا ہے جو بالآخر انسان کو بلند ترین حقیقت سے ملا دے گا، یعنی خدا سے۔

صنعتی دور کی ترقی کے بعد امریکیوں نے سمجھا تھا کہ وہ ٹکنالوجی میں نجات حاصل کرلیں گے۔ مصنفین نے بڑے شان دار قسم کے خاکے پیش کئے۔ مگر ٹکنالوجی انسانی مسرت کے حصول میں ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے ذرائع نہایت آسانی سے انسانی ترقی کے بجائے انسانی بربادی میں استعمال ہونے لگے۔" مشینی جنت کے آخری مرحلہ میں پہنچ کر حیرت انگیز طور پر سنگین مسائل کا پیدا ہوجانا محض اتفاقی نہیں ہے۔ یہ خدا کی سنت کے تحت ہے۔ وہ غافل انسانوں کی زندگی میں ایسے حالات پیدا کرتا رہتا ہے جو ان کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑے ہوجائیں:

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی	خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اعمال کے
الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون	سبب، تاکہ اللہ ان کے بعض اعمال کا کچھ مزا انھیں چکھا
روم — ۴۱	دے شاید وہ باز آجائیں۔

خدا نے اپنے حصہ کا کام کر دیا تھا۔ اب پیغمبر آخر الزماں کے وارثوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ اس زمین سے فائدہ اٹھا کر جدید انسان کے لئے دین حق کو قابل قبول بنانے کی کوشش کرتے۔ مگر ہمارے مصلحین کو یہاں کوئی کام نظر نہ آیا۔ اس کے برعکس وہ نہایت نادانی کے ساتھ اپنی مدعو قوموں سے لاحاصل قسم کی سیاسی کشتی لڑنے میں مصروف ہوگئے۔

دور جدید میں جب مسلم ملکوں پر مغربی قوموں کا استیلا ہوا تو ساری اسلامی دنیا کے سامنے ایک سوال تھا: "اس کے مقابلہ کے لئے کیا کیا جائے۔" اس وقت کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ دینی تعلیمات اور رسول کی سنت کی روشنی میں مثبت منصوبہ بنا کر اس کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کی جاتی۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ ہمارے مجاہدین کا قافلہ منفی ردعمل کے راستوں پر چل پڑا۔

اس ردعمل کے دو بڑے دھارے تھے۔ ایک وہ جو زیادہ تر دفاعی نفسیات کے تحت وجود میں آیا تھا۔ یہ لوگ مروجہ روایتی طریقوں کے مطابق مسلمانوں میں دینی روح پھونکنے کی کوشش میں لگ گئے۔ مثلاً دینی تعلیم کے لئے درس گاہوں کا قیام۔ عوام کو اسلامی عقائد اور عبادات سکھانے کے لئے دینی مجالس کا انعقاد، مسلمانوں کے مخصوص مفادات کے تحفظ کی کوشش وغیرہ۔ دوسرا طبقہ زیادہ انقلابی تھا اور اقدام کی تدبیریں تجویز کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کا نصف اول اور اس سے پہلے کی مسلم دنیا پر نظر ڈالیں تو کثیر تعداد میں ایسے علماء و مفکرین نظر آئیں گے جو قوم کے اندر نئے انقلاب کا صور پھونک رہے تھے۔ چند نام یہ ہیں:

محمد بن اسمٰعیل الامیر	(یمن)	۱۶۸۸ — ۱۷۶۸
شاہ ولی اللہ دہلوی	(ہند)	۱۷۰۳ — ۱۷۶۲
محمد بن عبدالوہاب نجدی	(سعودی عرب)	۱۷۰۳ — ۱۷۹۱
شاہ اسمٰعیل شہید	(ہند)	۱۷۷۹ — ۱۸۳۱

محمد بن علی السنوسی	(مغرب)	۱۷۸۷ — ۱۸۶۰
سید احمد شہید بریلوی	(ہند)	۱۷۸۶ — ۱۸۳۱
امیر عبدالقادر	(الجزائر)	۱۸۰۷ — ۱۸۸۳
جمال الدین افغانی	(ایران۔ افغانستان)	۱۸۳۸ — ۱۸۹۷
عبدالرحمٰن کواکبی		۱۸۴۹ — ۱۹۰۲
مفتی محمد عبدہ	(مصر)	۱۸۴۹ — ۱۹۰۵
رشید رضا	(مصر)	۱۸۶۵ — ۱۹۳۳
شکیب ارسلان	(شام)	۱۸۶۹ — ۱۹۴۶
ڈاکٹر محمد اقبال	(برصغیر ہند)	۱۸۷۷ — ۱۹۳۸
حسن البنا	(مصر)	۱۹۰۶ — ۱۹۴۸

اس قسم کے مفکرین کی تحریروں اور تقریروں نے سارے عالم اسلام میں ایک آگ لگا دی — بیسویں صدی کے آغاز میں ایسی تحریکیں اٹھیں جنھوں نے پوری پوری قوموں کو بلکہ بعض اوقات پوری مسلم دنیا کو متاثر کیا۔ مثلاً خلافت کمیٹی ہندستان (۱۹۱۴) مصر کی الاخوان المسلمون (۱۹۲۸) جماعت اسلامی پاکستان (۱۹۴۱) مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا (۱۹۴۸) وغیرہ

ان تمام تحریکوں کا ہدف اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر وہ سب کی سب اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔ اس کی واحد فیصلہ کن وجہ یہ تھی کہ انھوں نے سیاست کو اپنا میدان عمل بنایا جو نہ صرف نظریاتی طور پر اسلام کی جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوا تھا اور اس لئے نصرت الٰہی کا استحقاق اسے نہیں مل سکتا تھا، بلکہ خالص عقلی طور پر بھی وہ صحیح نہ تھا۔ کیوں کہ یہ لوگ اپنے حریف کو ایک ایسے میدان مقابلہ میں نبرد آزمائی کی دعوت دے رہے تھے جہاں ان کا حریف جدید ساز و سامان سے لیس تھا، جب کہ ان کا اپنا سرمایہ روایتی ہتھیاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عقلی اور نظریاتی دونوں پہلوؤں کا تقاضہ تھا کہ وہ "دعوت" کو اپنا میدان عمل بنائیں۔ یہ وہ میدان تھا جہاں وہ صریح طور پر اپنے حریف کے مقابلہ میں برتر حیثیت رکھتے تھے۔ مگر وہ قریبی حالات سے بلند ہو کر نہ سوچ سکے۔ ایک طرف مغربی استعمار کی جراحتیں، دوسری طرف جمہوریت اور اشتراکیت کے عنوان سے اٹھنے والی تحریکیں جنھوں نے ساری دنیا میں سیاسی طرز پر سوچنے کا مزاج پیدا کر دیا، ان عوامل نے اسلامی تحریک کو ان کے ذہن میں ایک قسم کی سیاسی تحریک کی حیثیت دے دی۔ وہ اسلام کو اس کی ازلی و ابدی صراط مستقیم پر چلانے کے بجائے اس کو وقتی محرکات کی راہوں پر دوڑانے لگے۔

سید جمال الدین افغانی اب سے ایک صدی قبل اس حقیقت کو پہنچ گئے تھے کہ دعوت کے میدان میں اسلام کی

کامیابی کے زبردست مواقع موجود ہیں۔ انھوں نے کہا تھا:

ان اهل اوربا مستعدون لقبول الاسلام اذا احسنت الدعوة اليه فقد قارنوا بين الدين الاسلامي وبين غيره فوجدوا البون شاسعا من حيث يسر العقائد وقرب تناولها، واقرب من اهل اوربا الى قبول الاسلام اهل امريكا لانه لا يوجد بينهم وبين الامم الاسلامية عداوات موروثة ولا اضغان مدفونة مثلما هو الحال بين المسلمين والاوربيين

جمال الدین افغانی، تالیف محمود ابوریہ
قاہرہ ۱۹۶۶، صفحہ ۲۱۳

یورپ کے لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہیں، اگر ان کو احسن طریقہ پر اسلام کی دعوت پیش کی جائے۔ انھوں نے اسلام اور دوسرے ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا تو انھوں نے پایا کہ عقائد کی سادگی اور عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے اور مغربی قوموں میں قبول اسلام کے لئے سب سے زیادہ قریب اہل امریکہ ہیں۔ کیوں کہ ان کے اور اسلامی اقوام کے درمیان کوئی موروثی عداوت اور نفرت نہیں ہے جیسا کہ مسلمانوں اور یورپ کے درمیان ہے۔

سید جمال الدین افغانی کے شاگرد خاص مفتی محمد عبدہ نے لکھا ہے کہ جب میں ان کے ساتھ پیرس (۱۸۸۴) میں تھا تو میں نے ان کے سامنے یہ بات رکھی کہ ہم سیاست کو چھوڑ دیں اور حکومت کی نظروں سے دور جاکر دینی اور تبلیغی کام کریں، اس طرح ہم دس برس میں نتیجہ خیز کام انجام دے سکتے ہیں جب کہ سیاسی زور آزمائی میں ہماری بہترین قوتیں رائگاں جارہی ہیں۔ جمال الدین افغانی نے اس کا جو جواب دیا، وہ یہ تھا:

انما انت مثبط (صفحہ ۵۰) تم تو پست ہمتی کی باتیں کرتے ہو۔

انیسویں صدی میں دو ایسے انقلابی واقعات پیش آئے، جو اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ ایک، سات سو سالہ استشراق کی تصحیح جو گویا اہل مغرب کی طرف سے اسلام کی صداقت کا عملی اعتراف تھا۔ دوسرے تنقید عالیہ (ہائر کرٹسزم) کے فن کا وجود میں آنا جو عملاً قرآن کے سوا دیگر مذہبی صحیفوں کو تاریخی طور پر بے اعتبار ثابت کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس طرح انیسویں صدی نے حیرت انگیز طور پر دعوت اسلامی کے لئے بہترین علمی زمین فراہم کر دی تھی۔ اسی کے ساتھ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ یورپ میں آزادیٔ فکر کی تحریک انتہائی زور شور کے ساتھ اٹھی اور اس نے قدیم مذہبی تشدد کو بالکل ختم کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا ہوا کہ دین حق کی تبلیغ کو بالکل پرامن حالات میں جاری کیا جاسکے۔ ان حالات میں اسلام کی دعوت نہایت مؤثر طور پر اٹھائی جاسکتی تھی۔ مگر یہی وہ صدی ہے جب کہ ہمارے تمام مصلحین نے انتہائی ناقابل فہم طور پر مغربی قوموں سے سیاسی لڑائی چھیڑ دی۔ حتیٰ کہ قومیت کے نعرے (مثلاً دو قومی نظریہ یا افغانی کا نعرہ مصر للمصریین، ۱۱۶) لگا کر مسلمان اور دیگر اقوام کے درمیان جوابی نیشنلزم کی دیوار کھڑی کر دی۔ کچھ لوگوں کو دعوتی کام کا خیال آیا تو انھوں نے بھی صرف یہ کیا کہ دیگر قوموں کے خلاف مناظرہ بازی کا ہنگامہ جاری کر دیا، جو اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں دکھا سکتا تھا

کہ دلوں میں نفرت پیدا کرکے لوگوں کو پہلے سے بھی زیادہ اسلام سے دور کردے۔ اس دور میں کچھ مزید علامتیں بھی ظاہر ہوئیں جنھوں نے عملی طور پر بتایا کہ اسلامی دعوت کو اٹھانے کے نئے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ مغرب میں بڑے بڑے اہل علم نے یا تو اسلام قبول کرلیا (مثلاً محمد اسد اور عبدالکریم جرمانوس) یا کھلے لفظوں میں اسلام کی برتری کا اعتراف کیا۔ (مثلاً جارج برنارڈشا ۱۹۵۰-۱۸۵۶) ایسے لوگ بھی نکلے جنھوں نے علی الاعلان مسلمانوں سے کہا کہ وہ اسلام کے داعی بن کر اٹھیں تو آج ہر دور سے زیادہ اس کا امکان ہے کہ دنیا اسلام کو قبول کرے (مثلاً لارڈ لوتھین ۱۹۴۰-۱۸۸۲) مگر ان میں سے کوئی واقعہ بھی مسلمانوں کی آنکھ کھولنے والا ثابت نہ ہوا۔ وہ سیاست کی شمشان بھومی پر قربانیاں دینے ہی کو اسلام کا کمال سمجھتے رہے۔

تاہم ہماری مسلسل نادانیوں کے باوجود آج بھی خدا کے دین کی اشاعت کے امکانات پوری طرح باقی ہیں —— ۱۹۷۳ میں گابون کے صدر بانگو، ۱۹۷۶ میں سنٹرل افریقہ کے صدر بوکاسا اور ۱۹۷۷ میں سراوک کے راجہ داتوک کا قبول اسلام اور اس طرح کی دوسری مثالیں موجودہ زمانہ میں اسلامی تبلیغ کے امکانات کی تازہ ترین علامت ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ ہمیں اپنی کھوئی ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنے کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز کہاں سے کرنا چاہئے۔

"فکری امامت اسی کو ملتی ہے جو اس کی مادی قیمت دینے کے لئے تیار ہو" یہ ایک تاریخی مسلمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکری امامت ہمیشہ مادی امامت کے جلو میں چلتی ہے۔ آٹھویں صدی سے سولھویں صدی تک دنیا کی فکری امامت مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی، کیوں کہ وہ اپنی تجارتی قوت اور سیاسی برتری کی وجہ سے اس کی قیمت دے سکتے تھے۔ اس زمانہ میں علم مسلمانوں کے علم کا نام تھا۔ قرطبہ کے بشپ الوارو Alvaro نے اسپین کے عیسائی مستعربین (Mozarabes) کے بارے میں اس زمانہ میں شکایت کی تھی کہ وہ "اپنی مسیحی زبان (لاطینی) کو بھول گئے ہیں۔ تمام عیسائی نوجوان جو اعلیٰ قابلیت کے مالک ہیں، عربی زبان وادب کے سوا کسی اور ادب سے دلچسپی نہیں رکھتے" اس کے بعد جب یورپ نے مشینی طاقت دریافت کی اور اس کے نتیجہ میں بالآخر صنعتی فوقیت اور صنعتی بالاتری حاصل کرلی تو فکری امامت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر مغربی قوموں کی طرف چلی گئی۔

سترھویں صدی سے لے کر جنگ عظیم ثانی (۴۴-۱۹۳۹) تک یہ امامت مغربی یورپ خصوصاً برطانیہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانہ میں یہ قومیں تمام دنیا کے طلبہ کے لئے علوم کا ماخذ بن گئیں۔ جنگ عظیم ثانی نے مادی امامت مغربی یورپ سے چھین کر امریکہ کے حوالے کردی۔ اس وقت سے امریکہ ساری دنیا کا فکری امام بنا ہوا ہے۔ آج کسی بھی علم میں تحقیق کرنے والا جن کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، وہ بیشتر امریکی مصنفین کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔

تاہم واقعات نے ثابت کیا ہے کہ مغربی قوموں کی امامت کا راز زیادہ تر دو چیزوں میں تھا۔ اولاً استعمار، اور اس کے بعد تیل کا سستا ایندھن۔ اور دونوں چیزوں کے حصول کا ذریعہ حیرت انگیز طور پر مشرقی ممالک ہی تھے۔ جنگ عظیم ثانی کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے استعمار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔ موجودہ صدی کے ربع ثالث میں جو حالات پیدا ہوئے ہیں، انھوں نے امریکہ کی امامت کی بنیادیں بھی ہلادی ہیں۔ ۱۹۷۳ کے دو واقعات، ویٹ نام

کی دس سالہ جنگ میں امریکہ کی پسپائی اور ڈالر کی تخفیف زر Devaluation اس بات کی علامت تھے کہ فوجی اور اقتصادی اجارہ داری اب امریکہ کے لئے مخصوص نہیں رہی۔ عربوں کی طرف سے تیل کا جزوی بائیکاٹ اور تیل کی قیمت میں اضافہ (۱۹۷۰ میں ۱.۸۰ ڈالر فی بیرل، ۱۹۷۴ میں ۱۱.۶۵ ڈالر فی بیرل) نے ثابت کیا ہے کہ صنعتی دنیا کا شہنشاہ تیل ہے اور حیرت انگیز طور پر اس تیل کا بڑا حصہ ان مسلم ملکوں کی زمین کے نیچے ہے جن کو خلیج فارس کے ممالک کہا جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور ناخوش گوار مقدر امریکہ کے حصہ میں آیا ہے۔ موجودہ دور کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جدید انسان نے صنعتی تہذیب میں اپنے یقین کو کھو دیا ہے۔ یہ تہذیب آدمی کو زندگی کی حقیقی بنیاد فراہم نہ کر سکی۔ دوسری طرف ایسے ایسے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے جن کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جنگ، معاشی استحصال، فضا آلودگی (Pollution) جرائم، عریانی، خاندانی انتشار اور اسی طرح کے دوسرے مسائل صنعتی تہذیب کی وہ پیداوار ہیں جن کا کوئی حل موجودہ تہذیب کے ڈھانچہ میں نہیں ہے۔ ان چیزوں نے جدید انسان کو تشکیک میں مبتلا کر دیا ہے۔ عام طور پر کہا جا رہا ہے کہ انسان کو ایک نئے نظام کی ضرورت ہے جو اس کو اس کے مقصد حیات سے آگاہ کرے اور اس کے حقیقی تقاضوں کا جواب ہو۔

یہ اگرچہ مخصوص طور پر امریکہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ مگر امریکہ چوں کہ اس وقت صنعتی تہذیب کی امامت کر رہا ہے، اس لئے فطری طور پر وہ اس کے مقدر کا سب سے زیادہ وارث بنا ہے، اسی کا ایک مظہر یہ واقعہ ہے کہ سوامی ویویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) نے انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ کا سفر کیا تو ان کو وہاں کام کا میدان نہ مل سکا۔ مگر آج ہندستانی سادھو امریکہ میں لاکھوں کی تعداد میں اپنے شاگرد پا رہے ہیں۔ جدید مغربی انسان اپنے تمدن سے بیزار ہو کر کسی نئی چیز کو پانے کے لئے بیتاب ہے۔ اور جب "دین حق" نہ مل رہا ہو تو وہ ہر اس چیز کی طرف دوڑ پڑتا ہے جو اس کو دور سے چمکتی ہوئی دکھائی دے۔ فرانسیسی مفکر آندرے مالرو (۱۹۷۶ - ۱۹۰۱) نے کہا ہے کہ یورپ کا عروج ۱۴۵۰ میں شروع ہوا۔ یہ دور پانچ سو برس رہا۔ ۱۹۴۹ میں ماؤ کا چین میں برسر اقتدار آنا اس دور کے خاتمہ کا آخری اعلان تھا۔ مغربی تہذیب جس طرح رومی تہذیب کے خاتمہ کے بعد پیدا ہوئی تھی اسی طرح اب وہ کسی آنے والی تہذیب کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے۔ (ٹائم ۸ اپریل ۱۹۷۴)

مستقبل قریب میں امریکہ کا انہدام یقینی ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا ایک فکری خلا سے دوچار ہوگی جس کو پُر کرنے کے لئے اس وقت کوئی دوسری قوم موجود نہیں ہے۔ چین اور روس بظاہر دور جدید کے طاقت ور دیو بن کر ابھرے ہیں مگر وہ اس خلا کو پُر نہیں کر سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کا اندرونی تضاد ہے۔ اشتراکی ڈکٹیٹر شپ جس نے ان ملکوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنے وسائل کو مخصوص میدانوں میں مرتکز کر کے طاقت ور قوم بن جائیں۔ وہی اس میں مانع ہے کہ ان ملکوں میں کوئی فکری ارتقار وجود میں آسکے۔ کلیت پسندانہ نظام کے تحت ٹکنکل علوم ترقی کر سکتے ہیں۔ مگر فکری علوم کی ترقی کے لئے آزاد فضا ناگزیر طور پر ضروری ہے جو اشتراکی نظام میں موجود نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ چین

اور روس کی ساری علمی ترقیاں ٹکنکل علوم میں ہیں، فکری علوم میں ان کا کوئی کارنامہ دنیا کے سامنے اب تک نہ آسکا۔

اس کے بعد جاپان ہے۔ بلاشبہ جاپان نے صنعتی ترقی کے میدان میں معجزنما کارنامے انجام دیئے ہیں۔ مگر جاپان بنیادی طور پر ایک ٹکنکل معاشرہ ہے اور مستقبل بعید تک یہ امید نہیں کہ وہ فکری حیثیت سے کوئی مقام حاصل کر سکے۔ تقریباً یہی حال موجودہ جرمنی کا ہے۔

مغربی قوموں کا انہدام، صنعتی تہذیب سے مایوسی اور عمومی فکری خلا۔ ان چیزوں نے دین حق کے حاملین کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ اگر وہ بیدار ہو جائیں تو اسلام کو دوبارہ نوع انسانی کی امامت کے مقام پر پہنچا سکتے ہیں۔ اس اعلیٰ مقصد کے لئے جدوجہد میں جو واحد چیز رکاوٹ بن سکتی تھی، وہ جدید صنعتی دور میں وسائل کے اعتبار سے ان کا پیچھے ہو جانا ہے۔ تاہم قدرت نے تیل کے ذخائر کا بڑا حصہ ان کی زمین کے نیچے رکھ کر حیرت انگیز طور پر ان کی اس پس ماندگی کی تلافی کر دی ہے۔ عربوں اور اسرائیل کے درمیان چوتھی جنگ (اکتوبر ۱۹۷۳) کے بعد تیل کی جس عالمی اہمیت کا مظاہرہ ہوا ہے، اس کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ تیل کی قدرتی دولت مسلم قوموں کی صنعتی پس ماندگی کی نہ صرف تلافی ہے بلکہ اس نے موجودہ حالات میں انھیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے کہ اگر وہ اتحاد اور نظم کے ساتھ کام کرنا سیکھ جائیں تو عالمی اقتصادیات کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بہترین وقت آگیا ہے جب کہ اس مستقبل کی طرف سفر شروع کر دیا جائے جو صرف ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

اسلام کے احیار کے لئے مادی اسباب فراہم کرنا یقیناً ہمارے لئے ضروری ہے۔ مگر ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ یہاں ایک سنگین حقیقت ہماری راہ میں حائل ہو گئی تھی پچھلے تین سو برس سے جب کہ مغربی دنیا مادی ترقی کی جدوجہد میں مصروف تھی، اسلامی ممالک زمانہ کی تبدیلی سے بے خبر رہ کر مسلسل غفلت میں پڑے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادی ترقی کی دوڑ میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے چلے گئے۔ حالیہ برسوں میں مسلم دنیا میں کچھ جدوجہد کے آثار ظاہر ہوئے ہیں۔ مگر اپنے حریف کے مقابلہ میں ہم اتنا زیادہ پیچھے جا چکے ہیں کہ ہزار کوششوں کے بعد جب ہم صنعتی دور میں پہنچیں گے تو مغرب، ایلون ٹافلر کے الفاظ میں، مافوق صنعتی دور (Super Industrial Age) میں پہنچ چکا ہوگا۔

وہ واقعہ جس کو اقتصادی ماہرین، جغرافی اتفاق (Geographical Accident) کہتے ہیں، شاید اسی کمی کی تلافی کے لئے قدرت کی طرف سے ایک انتظام ہو۔ یہ ایک ایسی دولت ہے جس سے مسلم دنیا نہ صرف اپنی صنعتی پس ماندگی کی تلافی کر سکتی ہے بلکہ وہ قیمت بھی ادا کر سکتی ہے جو دور جدید میں اسلام کے احیار کی مؤثر جدوجہد کے لئے درکار ہے۔

اس باب کو میں منٹگومری واٹ کے ایک اقتباس پر ختم کروں گا:

"دنیا بہت تیزی سے ایک ہوتی جا رہی ہے اور اس ایک دنیا میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ اس کے اندر اتحاد اور یکسانیت ہو۔ اس رجحان کی وجہ سے یقیناً وہ دن آئے گا جب کہ یہاں اخلاقی اصولوں کا ایک ایسا نظام ہوگا جو نہ صرف عالمی جواز رکھتا ہوگا بلکہ وہ فی الواقع ساری دنیا میں تسلیم کیا جا چکا ہوگا۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ محمدؐ تمام نوع انسانی کے لئے ایک عملی اور اخلاقی نمونہ ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان پر رائے قائم کر سکے۔

اب تک یہ معاملہ دنیا کی بہت کم توجہ اپنی طرف مائل کر سکا ہے۔ مگر اسلام کی قوت کی وجہ سے یہ بالآخر اہمیت حاصل کرے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا محمدؐ کی زندگی اور تعلیمات میں سیکھنے کے قابل کچھ اصول ہیں جو مستقبل کی دنیا کو واحد اخلاقی نظام عطا کر سکیں۔

دنیا کو ابھی تک اس سوال کا آخری جواب نہیں دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے محمدؐ کے بارے میں اپنے دعوے کی تائید میں اب تک جو کچھ کہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں بس ایک ابتدائی بیان کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت کم غیر مسلم اس سے مطمئن ہو سکے ہیں تاہم یہ موضوع ابھی کھلا ہوا ہے۔ دنیا کا ردعمل محمدؐ کے بارے میں کیا ہوتا ہے یہ کسی حد تک اس پر منحصر ہے کہ آج کے مسلمان اس کے لئے کیا کرتے ہیں۔ انھیں اب بھی یہ موقع حاصل ہے کہ بقیہ دنیا کے سامنے اپنے مقدمہ کو زیادہ بہتر اور مکمل طور پر پیش کریں۔ کیا مسلمان یہ دکھا سکیں گے کہ ایک متحدہ دنیا کی اخلاقیات کے لئے محمدؐ کی زندگی ایک آئیڈیل انسان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے مقدمہ کو بہتر طور پر پیش کر سکیں تو عیسائیوں میں وہ ایسے لوگ پائیں گے جو اس کو سننے کے لئے تیار ہیں۔

Montgomery Watt,
Mohammed as Model for Universal Morality p. 323

آخری بات

انسان کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے۔ مگر یہ آزادی لامحدود نہیں ہے۔ فرد کی آزادی موت کے وقت ختم ہو جاتی ہے اور بحیثیت مجموعی پوری نسل انسانی کی آزادی قیامت کے روز ختم ہو جائے گی۔ دنیا کی اس زندگی کے خاتمہ کے بعد آخرت کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ وہاں انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ایک وہ جنھوں نے اپنی دنیوی زندگی کی آزادی کو خدا کی مرضی کے تابع رکھا ہوگا۔ ایسے لوگ جنتوں میں داخل کئے جائیں گے۔ دوسرے وہ لوگ جنھوں نے آزادی کے اس لمحہ کو خدا سے بے خوف ہو کر گزارا ہوگا۔ ایسے لوگ جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ یہ تقسیم دائمی ہوگی جہنم والے ہمیشہ کے لئے آگ میں جلتے رہیں گے۔ جنت والے ہمیشہ کے لئے آرام اور خوشی کے باغوں میں رہیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تقریباً سو برس کی زندگی ایک دائمی انجام پر ختم ہونے والی ہے۔ اور انجام بھی ایسا کہ یا تو شدید ترین عذاب ہے یا اعلیٰ ترین انعام ــــ یہ صورت حال زندگی کے مسئلہ کو انتہائی سنگین بنا دیتی ہے۔ اس غیر معمولی سنگینی کے باوجود دنیا میں یہ تمام حقیقتیں آدمی کی نگاہ سے اوجھل رہتی ہیں۔ خدا، فرشتے، جنت، دوزخ، کسی بھی چیز کو وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا۔ اس لئے یہ ممکن تھا کہ قیامت میں جب تمام باتیں کھلیں تو آدمی یہ کہہ دے کہ خدایا، ہم کو معلوم ہی نہ تھا کہ زندگی کا بالآخر یہ انجام ہونے والا ہے۔ ایسا ہی تھا تو آپ نے ہم کو بتانے کا انتظام کیوں نہ کیا۔

مسئلہ کی اسی نزاکت کی وجہ سے خدا نے یہ اہتمام کیا کہ جب انسان کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ پیغمبر بھی بھیجنے شروع کئے۔ ہر بستی اور ہر نسل میں خدا نے اپنے پیغمبر اٹھائے۔ ان کے اوپر وحی بھیجی اور کتاب اتاری۔ تاکہ وہ لوگوں کو کھول کھول کر زندگی کی حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ یہ سلسلہ آدم سے لے کر مسیح تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ خدا نے فیصلہ کیا کہ آخری رسول بھیجے اور اس کے اوپر آخری آسمانی کتاب اتار کر اس کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے۔ اس طرح ساتویں صدی سے انسانی تاریخ میں نیا دور شروع ہوا جب کہ خدا کی کتاب (قرآن) تو محفوظ حالت میں موجود ہے۔ مگر اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے کے لئے پیغمبر نہیں آرہے ہیں۔

پھر ختم نبوت کے بعد جو انسان پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہو کر مر رہے ہیں، ان کو با خبر کرنے کا کیا انتظام خدا نے کیا ہے۔ اس کا جواب امت محمدیہ ہے۔ اللہ کے آخری رسول نے اپنی امت پر دین کی گواہی دی۔ اس کے بعد امت محمدیہ کو ہمیشہ کے لئے ذمہ دار بنا دیا گیا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے لوگوں کے سامنے اس کی گواہی دیتی رہے، تاکہ قیامت کے روز جب قوموں کا مقدمہ پیش ہو تو وہ وہاں کھڑی ہو کر یہ کہہ سکے کہ ہم نے ان لوگوں تک حق کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اس کے باوجود جن لوگوں نے اس کو اختیار نہیں کیا، وہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔

یہی وہ کام ہے جس کو قرآن میں دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔ امت محمدیہ کی لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کام کے لئے اٹھے۔ وہ کسی بھی حال میں اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ ذاتی عبادت بھی، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ مقدار میں ہو اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے والی نہیں بنے گی۔ اگر وہ اس کام کو انجام نہ دے اور دنیا کی قوموں کو آنے والے دن سے نہ ڈرائے تو وہ بھی آخرت میں دوسری قوموں کے ساتھ پکڑی جائے گی۔ دوسری قوموں کا جرم اگر یہ ہوگا کہ انھوں نے قرآنی زندگی اختیار نہیں کی تو وہ اس بات کی مجرم قرار پائے گی کہ اس نے خدا کے بندوں کو خدا کی مرضی سے آگاہ نہیں کیا۔ اور دوسرا جرم کسی بھی حال میں، پہلے جرم سے کم نہیں ہے۔

یہود جس جرم میں معتوب و مغضوب ہوئے، وہ یہی تھا کہ ان کے پاس خدا کی جو الہامی امانت تھی، اس کو انھوں نے چھپایا اور لوگوں کو اس سے خبردار نہیں کیا۔ تورات کے حاملین نے جو غلطی کی، وہی غلطی اگر قرآن کے حاملین کریں تو ان کے ساتھ کوئی دوسرا معاملہ نہیں ہوگا۔ خدا کا قانون ان کو بھی اسی طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا جس طرح وہ پچھلی قوموں کو لے چکا ہے۔ خدا کی کسی قوم کے ساتھ خصوصی رشتہ داری نہیں ہے۔ اس سے بڑی کوئی بھول نہیں ہو سکتی کہ کوئی گروہ اپنے کو خدا کا خصوصی رشتہ دار سمجھ لے۔

مسلمانوں کو آج اہل عالم کے سامنے وہی فریضۂ دعوت انجام دینا ہے جو رسول نے اپنے زمانہ میں لوگوں کے اوپر انجام دیا تھا یعنی قرآن کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا۔ جس طرح زکوٰۃ کی ادائگی کے بغیر سارا مال ایک مسلمان کے لئے حرام رہتا ہے، اسی طرح اس فریضہ کو انجام دینے سے پہلے ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں کسی اور چیز کا حصہ ہو۔ ہمارے لئے کوئی خوشی اس وقت تک خوشی نہیں ہے اور کوئی عافیت اس وقت تک عافیت نہیں ہے جب تک ہم پیغام رسانی کے اس کام کو انجام نہ دے لیں یا کم از کم اس میں اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہوں:

- ہمیں قرآن کا ترجمہ بہترین اہتمام کے ساتھ، دنیا کی تمام زبانوں میں فراہم کرنا ہے۔
- رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں پر جدید اسلوب میں کتابیں تیار کر کے تمام دنیا کے لوگوں تک پہنچانا ہے۔
- پیغمبر کے اقوال (حدیث) کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں تیار کرنا ہے۔
- اسلام کی تاریخ (نہ کہ فتوحات کی تاریخ) کو مرتب کر کے شائع کرنا ہے۔
- جدید زبان اور عصری اسلوب میں اسلام کو مدلل کرنا ہے۔
- وہ تمام عملی تدبیریں اختیار کرنا اور معاون ادارے قائم کرنا ہے جو کسی دعوت کو مؤثر انداز میں لوگوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہیں۔

پھر یہ کام سادہ معنوں میں محض تقریر و تحریر کا کام نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی نمائندگی کا کام ہے۔ اس کو اسی اہتمام کے ساتھ کرنا ہے جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس کے لئے ہم کو اسی قدر سنجیدہ بننا ہے جتنا ایک اہم سرکاری پیغام کو پہنچانے والا سنجیدہ ہوتا ہے۔ خیرخواہی اور دل فگاری کے ان تمام تقاضوں کو اس میں شامل کرنا ہے جو اس قسم کی سنگین خبر کے ایک حامل سے متوقع ہے۔ پھر یہ بھی لازمی ہے کہ جس جہنم سے آپ دوسروں کو ڈرانے جا رہے ہیں خود اس سے کانپتے ہوں، جس جنت کی خوش خبری دوسروں

دے رہے ہیں۔ خود اس کے حریص ہوں۔ اگر یہ باتیں نہ ہوں تو آپ کی دعوت وتبلیغ ایک قسم کا مسخرہ پن ہوگا۔ کوئی بھی شخص اس کو اس قابل نہیں سمجھے گا کہ اس پر غور کرے۔

ہماری جدید تاریخ کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ پچھلے تقریباً دو سو برس کے عرصے میں سارے عالم اسلام میں بے شمار بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ ان کو کام کرنے کے بے پناہ مواقع ملے۔ مگر ان کی کوششوں کے حقیقی نتائج صفر کی حد تک کم تھے۔ یہ ناکامی انھیں اس کے باوجود ہوئی کہ ان کو اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ہر قسم کے بہترین وسائل ملے۔ علم، تقدس، اخلاص، شخصیت، قربانی، تعداد، سرمایہ، غرض وسائل وذرائع کی کوئی ایسی قسم نہیں جو وافر مقدار میں ان کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ مگر ان کی طوفان خیز کوششوں کے نتائج کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف ملت کے قافلے کو پیچھے لے جانے کا کام انجام دیا ہے۔

جو لوگ خدا کے قائل نہ ہوں، یا اس کو زندہ اور فعال نہ مانتے ہوں وہ اس واقعہ کی کوئی بھی خود ساختہ توجیہہ کر سکتے ہیں۔ مگر خدا پر ایمان کا تقاضا ہے کہ اس پورے واقعہ کو ہم سنت اللہ کے تحت سمجھیں اور اس کو براہ راست خدائی معاملہ قرار دیں۔

اس حیثیت سے غور کیا جائے اور اس سلسلہ میں قرآن کو رہنما بنایا جائے تو بلا کسی اشتباہ کے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہماری تحریکوں کی ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے وہ اصل کام نہ کیا جس پر خدا نے امت مسلمہ کے لئے نصرت اجتماعی کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری نصرت کا وعدہ اس شرط پر کیا ہے کہ ہم اُس کی نصرت کریں یعنی بندوں کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے باخبر کرنے کے لئے خدائی مشن میں شریک ہوں۔ ہماری مہم دنیوی حقوق کے لئے احتجاج اور مطالبہ کی مہم نہ ہو بلکہ انذار آخرت کی مہم ہو۔ ہم دوسروں کے مقابلہ میں دعوتی تحریک اٹھائیں، نہ کہ سیاسی اور اقتصادی تحریک۔

یہی وہ اصل بات ہے جس نے موجودہ زمانے میں ہماری تمام کوششوں کو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کا مصداق بنا دیا ہے۔ ہم نے دنیوی سیاست کے لئے تحریکیں اٹھائیں، اس لئے آسمانی نصرت ہم کو حاصل نہ ہو سکی۔ اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو بربادیوں سے بچائیں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اقوام عالم کے سامنے داعی بن کر کھڑے ہوں سیاسی اور معاشی جھگڑے ترک کر کے جنت اور جہنم کو اصل مسئلہ بنائیں اور اس سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ خدا کی نصرت کو کھینچنے کی واحد صورت یہی ہے، اور جب تک خدا کی نصرت حاصل نہ ہو، ہم کو کسی قسم کی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

اہل اسلام کی سربلندی، قرآن کی صراحت کے مطابق ایک خدائی انعام ہے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ انعام کسی خاص عمل کے صلہ میں دیا جاتا ہے۔ پھر اہل اسلام کا وہ کون سا عمل ہے جو ان کو اس انعام کا مستحق بناتا ہے۔ وہ وہی ہے جو خود امت مسلمہ کی بعثت کا مقصد ہے۔ یعنی اہل عالم کے سامنے دین کی گواہی دینا۔ لوگوں کو خدا کی مرضی سے باخبر کرنا تاکہ آخرت میں کوئی خدا کے اوپر حجت قائم نہ کر سکے۔ یہی وہ عمل ہے جو اہل اسلام کے لئے خداوندی انعام کا استحقاق پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم اس مطلوب کام کو نہ کریں تو دوسرا کوئی بھی ہنگامہ ہم کو انعام کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ دوسرے ہنگامے تو سزا کا مستحق بناتے ہیں نہ کہ انعام کا۔

" الاسلام، اسلوب تحریر اور موادِ استدلال دونوں کے اعتبار سے آج کی کامیاب ترین کتاب ہے۔ میں علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کا گہرا مطالعہ کریں، اور ایک درسی کتاب کی طرح اس سے فائدہ اٹھائیں"

مولانا اخلاق حسین قاسمی (صدر جمعیۃ علماء صوبہ دہلی) تحریر فرماتے ہیں:

مکرمی مولانا صاحب، سلام مسنون

شدید انتظار کے بعد آپ کی بہترین کتاب " الاسلام" میرے پاس پہنچ گئی، اس کتاب کے مسودہ پر میں نے سرسری طور پر نظر ڈالی تھی، اس وقت سے مجھے اس کتاب کا انتظار تھا۔ مصروفیت کے باوجود اس دور کی یہ اہم علمی، تبلیغی اور اصلاحی کتاب سفر و حضر میں ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے اور میں اسے بہت غور و فکر کے ساتھ آہستہ آہستہ سمجھ سمجھ کر پڑھ رہا ہوں۔ صفحہ ۱۳ پر آپ نے لکھا ہے:

" پہلے جزء کے سلسلہ میں اہم ترین کام یہ ہے کہ اسلام کے عقائد و احکام کو جدید استدلالی انداز میں مرتب کیا جائے تاکہ وہ لوگوں کو "آج کی چیز" معلوم ہونے لگیں، نہ یہ کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ وہ اس دور کی چیز ہیں جب کہ انسان قبائلی دور میں سانس لیتا تھا"

میں " الاسلام" کے فاضل مصنف کو مبارکباد اور ساتھ ہی دعائیں دیتا ہوں کہ اس نے الاسلام کو اسلوب تحریر اور استدلالی مواد دونوں کے لحاظ سے "آج کی کامیاب ترین چیز" بنا دیا ہے۔ دین برحق کے ایک ایک عنوان کے تحت مسائل شریعت کو الاسلام کے فاضل مصنف نے اس موثر انداز سے سمجھایا ہے کہ وہ دل و دماغ میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اہم کتاب عام مسلمانوں سے زیادہ علماء اسلام کے لئے ایک اہم تربیتی اور تعلیمی کتاب ہے۔ دین کی تعلیم اور تبلیغ کا کام کرنے والے حضرات اس کتاب کو سمجھ کر پڑھیں، ہر قسم کا تکلف دور کر کے اس کی ایک ایک سطر کا مطالعہ کریں اور مولانا وحید الدین خاں صاحب نے جس جدید اسلوب سے قرآن و حدیث کی باتیں پیش کی ہیں اس انداز کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں سمونے کی کوشش کریں۔

میں نے مولویانہ تعلّی سے علیحدہ ہو کر اس کتاب کو اپنے سرہانے رکھ چھوڑا ہے اور اس کے ایک ایک دو دو صفحے ایک طالب علم کی طرح سمجھ سمجھ کر روزانہ پڑھتا ہوں۔ میں اپنے طبقہ کے ساتھیوں اور خاص طور پر نوجوان علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ الاسلام کا گہرا مطالعہ کریں اور اسے ایک درسی کتاب سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اخلاق حسین قاسمی دہلوی۔ ۳؍ اگست ۱۹۷۷ء